مضامین شرر

یعنی

مولانا مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر لکھنوی

مدظلہ العالی

کے تمام شاعرانہ و عاشقانہ، محققانہ و فلسفیانہ، تاریخی و جغرافی، علمی و
ادبی مضامین۔ دنیا کے مشہور اکابر اور نامور خاتونوں کے سوانح عمری،
اور کل متفرق تحریریں جن کی فاضل محقق موصوف نے از سر نو
نظر ثانی فرمائی ہے

جنھیں

سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل مزنگ لاہور نے چھپوایا

بر کرائے - اسی طرح نعیم خان رسالدار نے بھی ایک بازار بنوایا - اور چار دیواری اندر خواجہ سراؤں اور مختلف فوجی لوگوں کے بہت سے مکانات بھی تیار ہو گئے -

نواب صفدر جنگ کی وفات کے بعد اس نئی بستی پر چند روز کے لیے تباہی آ گئی - جس کی وجہ سے اتنے دنوں میں جو کچھ بنا تھا زمانے نے بگاڑ کے رکھ دیا اس لیے کہ اُنکے فرزند نواب شجاع الدولہ نے اپنی سکونت کے لیے لکھنؤ کو پسند کیا تھا اور وہیں رہتے تھے - گو سال میں دو ایک راتیں اپنے باپ دادا کے اس قدیم مسکن میں ضرور بسر کر لیا کرتے - یہاں تک کہ سنہ ۱۷۶۴ء میں اُنھیں بکسر کی لڑائی میں انگریزوں سے شکست ہوئی - اُس وقت وہ کمال بے سروسامانی سے بھاگے ہوئے فیض آباد میں آئے اور وہاں کے قلعے میں جو کچھ ساز و سامان موجود پایا لے کے راتوں رات چل کھڑے ہوئے - اور لکھنؤ پہونچے - یہاں بھی ایک ہی رات قیام کر کے جو کچھ ہاتھ آیا لیا اور بریلی کی راہ لی - تاکہ افاغنۂ روہیلکھنڈ کے پاس جا کے پناہ لیں - لڑائی کے نو مہینے بعد انگریزوں سے اُن سے صلح ہو گئی - جس کی رُو سے شجاع الدولہ کے ذمے واجب تھا کہ محاصل ملک میں سے پنج آنے انگریزوں کو ادا کیا کریں -

صلح ہونے سے پہلے اس سفر میں اتفاقاً شجاع الدولہ کا گذر شہر فرخ آباد میں بھی ہوا تھا جہاں احمد خان بنگش سے ملاقات ہوئی جو اُس زمانے کے پرانے تجربہ کار شجاعوں میں خیال کیے جاتے تھے - اُنھوں نے شجاع الدولہ کو مشورہ دیا کہ اب کی جو تم جا کے عنانِ حکومت ہاتھ میں لینا تو میری ان دو باتوں کو نہ بھولنا - ایک تو یہ کہ مغلوں کا کبھی اعتبار نہ کرنا بلکہ اپنے دیگر ملازموں اور خواجہ سراؤں سے کام لو - دوسرے یہ کہ لکھنؤ کا رہنا چھوڑ دو اور فیض آباد ہی کو اپنا دارالحکومت بناؤ -

یہ باتیں شجاع الدولہ کے دل پر بیٹھ گئیں - اور انگریزوں سے معاہدہ ہونے کے بعد سنہ ۱۷۶۵ء میں جو اُنھوں نے اپنی قلمرو کی راہ لی تو سیدھے فیض آباد آئے اور اسی کو اپنا دارالحکومت قرار دے دیا - اب یہاں اُنھوں نے نئی فوج بھرتی کرنا شروع کی - نئے رسالے مرتب کرنے لگے اور نئی عمارتوں کی بنیاد ڈالی - پرانے حصار کو ایک مضبوط شہرپناہ کی شان سے از سرِ نو تعمیر کرایا - جو اب قلعہ کہلاتا تھا -

مغلوں کے جو مکانات اندر واقع تھے ڈھا دیے۔ اور اپنے اکثر خانگی ملازموں کو حکم دیا کہ شہر پناہ کے باہر مکان بنوائیں۔ اس حصار کے گرداگرد بہ ہر طرف دو دو میل کا میدان چھوڑ دیا گیا جس کے گرد گہری خندق کھود کے قلعہ بندی کی وضع سے درست کی گئی۔ اور ملازمین سرکار اور افسران فوج کو اجازت ہوئی کہ اپنی حیثیت اور حالت کے مناسب قطعات زمین لے کے اسی میدان میں مکان بنائیں۔ جیسے ہی یہ خبر مشہور ہوئی کہ شجاع الدولہ نے فیض آباد کو اپنا مستقر قرار دیا ہے ایک دنیا کا رخ ادھر پھر گیا۔ ہزارہا خلقت آ آ کے آباد ہونا شروع ہوئی۔ شاہجہان آباد میں یہ حالت تھی کہ جسے دیکھیے فیض آباد جانے کے لیے تیار ہے۔ چنانچہ دہلی کے اکثر اہل کمال نے وطن کو خیرباد کہی اور پورب کا رخ لیا۔ شب و روز لوگوں کے آنے کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ اور قافلے پر قافلے چلے آتے تھے جو آ آ کے یہاں بستے اور فیض آباد کی سواد میں کھپتے جاتے تھے۔ چند ہی روز کے اندر ہر قوم و ملت کے خوش باش۔ اہل قلم۔ اہل سیف۔ تاجر۔ صناع اور ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگ یہاں جمع ہو گئے۔ اور جو آتا آتے ہی اس فکر میں پڑ جاتا کہ کوئی قطعۂ زمین حاصل کر کے مکان بنا لے۔

چند ہی سال کے اندر اس پہلے حصار کے علاوہ دو اور فصیلیں تعمیر ہو گئیں۔ ایک جو پہلے مربع کے جنوبی پہلو سے ملی ہوئی تھی اس کے رقبے کا طول و عرض دو دو میل کا تھا۔ اور دوسرا حصار ایک میل کے پھیلاؤ میں تھا جو قلعہ اور بیرونی فصیل کے درمیان تھا۔ اسی زمانے میں ترپولیا اور چوک بازار تعمیر ہوئے۔ جن کی سڑک قلعے کے جنوبی پھاٹک سے شروع ہو کے سڑک الہ آباد کے ناکے تک چلی گئی تھی۔ اور اتنی کشادہ تھی کہ برابر برابر دس چھکڑے بآسانی سے گذر سکتے تھے۔ فصیل شہر کا آثار زمین کے پاس چاہے جتنا ہو درمیان میں دس گز سے کم نہ تھا جو اوپر پہنچ کے پانچ گز رہ گیا تھا۔ اس فصیل پر باقاعدہ اور بے قاعدہ دونوں طرح کی فوجوں کے دستے رات بھر روند پھرا کرتے۔ اور جا بجا پہرہ دیتے۔ باقاعدہ سپاہیوں کی وردی لال تھی۔ اور بے قاعدہ سپاہیوں کی وردی سیاہ۔ لیکن سپاہیوں کی ضرورت سے برسات میں جا بجا چھپر ڈال دیے جاتے۔ مگر برسات کے ختم ہوتے ہی آگ لگا کے پھونک دیتے

سے وہ لازمی طور پر اُتار ڈالے جاتے۔ چنانچہ صرف فصیل کی دیواروں کے لیے ہر سال تقریباً ایک لاکھ چھپر چھائے اور چار مہینے بعد نوچ کے پھینک دیے جاتے۔

حوالی شہر میں دو مرغزار شکارگاہ قرار دیے گئے تھے۔ جن میں سے ایک مغرب کی جانب گُرجی بیگ خان کی مسجد سے گیتا رگھاٹ تک چلا گیا تھا جو ایک معتدبہ مسافت ہے۔ اُس کے دونوں طرف کچی دیواریں تھیں اور تیسری طرف گھاگرا واقع ہوئی تھی۔ اس میں ہرن۔ چیتل۔ بارہ سنگھے۔ نیل گائیں وغیرہ شکار کے جانور کثرت سے چھوڑے گئے تھے جو نہایت آزادی سے چھوٹے چھوٹے پھرتے اور بھڑکتے ہی چوکڑیاں بھرنے لگتے۔ دوسری شکارگاہ شہر سے مشرق کی طرف موضع جنورا اور چھاؤنی گوشائیں سے دریا کنارے تک تھی جس کا پھیلاؤ چھ میل کا تھا۔ اسکے رقبے میں گیارہ موضع اور اُنکی اراضی آگئی تھی۔ مگر یہ شکارگاہ ناتمام ہی رہی اور اسکی نوبت نہ آنے پائی کہ اس میں وحشی جانور چھوڑے جائیں۔

خاص شہر کے حلقے کے اندر تین ایسے نزہت بخش باغ تھے جو اس قابل تھے کہ امرا اور شاہزادے آکے اُن میں سیر کریں اور اُنکی بہار اور شادابی سے لطف اُٹھائیں۔ ایک انگوری باغ جو قلعے کے اندر واقع تھا۔ اور اُسکے رقبے کے چوتھائی حصے پر حاوی تھا۔ دوسرا موتی باغ جو مینت چوک کے اندر واقع تھا۔ تیسرا لال باغ جو سب باغوں سے زیادہ وسیع تھا۔ اس میں نہایت ہی نفاست سے چمن بندی کی گئی تھی اور ہر طرح کے نازک و نظر فریب پھول قرینے سے لگائے گئے تھے۔ سارے صوبے میں اس کی شہرت تھی اور دُور دُور کے لوگوں کو تمنا تھی کہ کوئی خوش نصیبی کی شام اس روح افزا باغ میں بسر کریں۔ شہر کے نوجوان شرفا کے غول روز سہ پہر کو اُس میں گشت لگاتے اور دل بہلاتے نظر آتے۔ اس باغ کی جان فزائی کی شہرت یہاں تک تھی کہ شہنشاہ دہلی شاہ عالم بادشاہ جب الہ آباد سے پلٹے تو اسی باغ کی سیر کے شوق میں فیض آباد ہوتے ہوئے دہلی گئے۔ اور کچھ زمانے تک اسی کے اندر اُن کا قیام رہا۔ اِن تین باغوں کے علاوہ آصف باغ اور بلند باغ بھی نواح شہر میں لکھنؤ کے راستے پر واقع تھے۔

نواب شجاع الدولہ بہادر کو شہر کی درستی کا اس قدر شوق تھا کہ ہر صبح و شام

سوار ہو کے سڑکوں اور مکانوں کو معائنہ کرتے۔ مزدور پھاوڑے اور کدالیں لیے ہوئے ساتھ ہوتے۔ جہاں کہیں کسی مکان کو ٹیڑھا اور اپنی حد سے بڑھا ہوا پاتے یا کسی دوکاندار کو دیکھتے کہ اُس نے سڑک کی زمین بالشت بھر بھی دبالی ہے فوراً اُسے کھُدوا کے برابر اور سیدھا کرا دیتے۔

فوج کی اصلاح کی طرف بھی شجاع الدولہ کو خاص توجہ تھی۔ رسالے کے اعلیٰ سردار نواب مرتضیٰ خان بریچ اور ہمت بہادر اور اُمراؤگیر نام دو گوشائیں تھے۔ ان کے ماتحت اتنے سوار تھے کہ ان تین کے علاوہ اور جتنے چھوٹے چھوٹے جمعدار تھے سب کی فوج کی مجموعی تعداد سے ان میں سے ہر ایک کی جمعیت زیادہ تھی۔ دیگر سرداران فوج احسان کمبوہی۔ گرجی بیگ خان۔ گوپال راؤ مرہٹہ۔ میر جملہ کے داماد نواب جمال الدین خان۔ مظفر الدولہ فخر جنگ بخشی ابوالبرکات خان ساکن کاکوری۔ اور محمد معز الدین خان لکھنؤ کے ایک شیخزادے تھے۔ ان میں سے کوئی نہ تھا جسکے ماتحت ہزار پانسو سپاہیوں کا گروہ نہ ہو۔ ماسوا ان کے خواجہ سرا اور دو نوعمر خواجہ سرا جو اُنکے زیر نگرانی تربیت پاتے۔ چیلے۔ اور شاگرد پیشہ تھے بسنت علی خان خواجہ سرا کے ماتحت دو ڈویژن فوج یعنی چودہ ہزار باقاعدہ سپاہ تھی۔ جس کی وردی سرخ تھی۔ ایک دوسرا بسنت خواجہ سرا تھا جس کے زیر کمان ایک ہزار بے قاعدہ نیزہ باز سوار اور ایک پلٹن تھی۔ عنبر علی خان خواجہ سرا کی افسری میں پانسو سوار اور ایک پلٹن تھی۔ جن کی وردیاں سیاہ تھیں۔ محبوب علی خان خواجہ سرا کے زیر علم پانسو سوار تھے اور چار پلٹنیں تھیں۔ اتنی ہی فوج لطافت علی خان کے ماتحت تھی۔ رگھوناتھ سنگھ اور پرشاد سنگھ تین سے ہر ایک کے زیر کمان تین تین سو سوار اور چار چار پلٹنیں تھیں۔ اسی طرح مقبول علی خان اول و دوم یوسف علی خان کے ہمراہ پان پان سو مغل سواروں اور پیدلوں کی جمعیت تھی۔ اور توپخانہ بے حد و بے حساب تھا۔

لہذا کُل فوج جو شجاع الدولہ کے قبضے میں تھی اور فیض آباد میں موجود رہا کرتی تھی اُس کی مجموعی تعداد یہ تھی۔ سرخ وردی والے تیس ہزار۔ باقاعدہ سیاہ وردی والے چالیس ہزار بے قاعدہ پیادے۔ ان کے افسر اعلیٰ یعنی سپہ سالار اعظم

سید احمد تھے جو "بانسی والا" کے لقب سے مشہور تھے - جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے ان کی توڑے دار بندوقوں کے مقابلے مین انگریزی فوج کی بندوقین کوئی وقعت نہ رکھتی تھین -

اس جمعیت کے علاوہ شجاع الدولہ کے پاس بائیس ہزار ہرکارے اور مخبر تھے جو ہر ساتوین روز پونہ سے اور ہر پندرھوین دن کابل سے خبرین لاتے - دربار مین ہمیشہ بلاد دور دراز کے حکمرانون کے نائب موجود رہا کرتے - ایک نائب مرہٹون کا تھا - ایک نظام علی خان فرمانروائے دکن کا - ایک ضابطہ خان کا - اور ایک نواب ذوالفقار الدولہ نجف خان کا - جن کے ساتھ اُن کے دفتر اور سپاہی بھی تھے - ان لوگون کے علاوہ اور بھی بہت سے فوجی افسر اپنی جمعیتون کے ساتھ یہان موجود رہتے - جیسے میر نعیم خان جن کے جھنڈے کے نیچے ثابت خانی - بندیلکھنڈی - چندیلا - اور میواتی سپاہیون کا ہجوم تھا - محمد بشیر خان قلعہ دار تھے - شہر کی فصیلون اور پھاٹکون پر اُنھین کے سوار اور پیادے پھیلے رہتے - اور قلعے کے اندر ہی اُنکے رہنے اور دفتر کے لیے عمدہ مکانات اور اُنکے سپاہیون کی بارکین بنی ہوئی تھین - جب بیرونی دیوارون مین بھی جگہ نہ باقی رہی تو سید جمال الدین خان اور گوپال راؤ مرہٹہ نے باہر نکل کے موضع نورا ہی کے پاس سکونت اختیار کی اور اپنے مکانات اور کیمپ بنائے - اور اسی جگہ کی تنگی کی وجہ سے نواب مرتضیٰ خان بریچ - میر احمد بانسی والا - میر ابو البرکات اور شیخ احسان اجودھیا اور فیض آباد کے درمیان خیمون مین رہتے تھے -

آدمیون کی کثرت اور سپاہیون کے ہجوم سے شہر کے اندر خصوصاً چوک مین اس قدر بھیڑ لگی رہتی کہ گذرنا دشوار تھا - اور غیر ممکن تھا کہ کوئی شخص بغیر اٹکے ہوئے سیدھا چلا جائے - فیض آباد نہ تھا انسانون کا جنگل تھا - بازار مین دیکھیے تو ملکون ملکون کا مال ڈھیر تھا - اور یہ خبر سُن کے کہ فیض آباد مین نفیس مزاج رئیسون اور شوقین امیرون کا منتخب مجمع ہے - ہر طرف سے تاجرون کے قافلے لدے پھندے چلے آتے تھے - اور چونکہ جا ہے کیسا ہی قیمتی مال ہو ہاتھون

ہاتھ بک جاتا۔ اچھی سے اچھی چیزون کے آنے کا سلسلہ بندھ گیا تھا۔ جب دیکھیے ایرانی۔ کابلی۔ چینی۔ اور فرنگی سوداگر نہایت گران قیمت اور بھاری مال لیے ہوے موجود رہتے۔ اور جو جو نفع اُٹھاتے ہوس بڑھتی اور زیادہ جستجو و جان فشانی سے نیا مال لے آتے۔ مسیو ژان تیل۔ مسیو سون سون۔ اور مسیو پیدرونز وغیرہ کے ایسے دو سو فرانسیسی جو یہان اقامت گزین ہوگئے تھے سرکار مین ملازم تھے۔ اور شجاع الدولہ کی سلطنت سے روابط اتحاد رکھتے تھے جو سپاہیون کو فوجی تعلیم دیتے۔ اور توپین بندوقین اور دیگر اسلحہ جنگ اپنے اہتمام مین تیار کراتے۔

منشی فیض بخش مصنف تاریخ فرح بخش جن کی عنایت سے ہمین یہ واقعات معلوم ہوے ہین خود اس زمانے مین موجود تھے اور اُنھون نے جو کچھ لکھا ہے اپنے مشاہدے سے لکھا ہے۔ وہ کہتے ہین کہ مین جب پہلے پہل گھر چھوڑ کے فیض آباد مین گیا ہون ممتاز نگر ہی تک پہونچا تھا جو شہر کے مغربی پھاٹک سے چار میل کے فاصلے پر ہے۔ مین نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے انواع و اقسام کی مٹھائیان۔ گرما گرم کھانا۔ کباب۔ سالن۔ روٹیان۔ اور پراٹھے وغیرہ بک رہے ہین۔ سبیلین رکھی ہوئی ہین۔ نان خطائیان مختلف قسم کے شربت اور فالودہ بھی بک رہا رہا ہے۔ اور صدہا آدمی خریداری کے لیے اُن دُکانون پر گرے پڑتے ہین۔ مجھے خیال گذرا کہ مین شہر کے اندر داخل ہو گیا اور خاص چوک مین ہون۔ مگر متحیر تھا کہ ابھی تک شہر کا پھاٹک تو آیا ہی نہین مین اندر کیسے پہونچ گیا؟ لوگون سے پوچھا تو ایک راہگیر نے کہا "جناب شہر کا پھاٹک یہان سے چار میل ہے۔ آپ کس خیال مین ہین؟"

اس جواب پر حیرت کرتا ہوا مین شہر مین داخل ہوا تو عجب چہل پہل نظر آئی۔ رنگینیان تھین اور دلچسپیان۔ جدھر دیکھتا ہون ناچ ہو رہا ہے۔ مداری تماشا کر رہے ہین۔ اور لوگ طرح طرح کے سیر تماشون مین مصروف ہین۔ مین یہ رونق اور شور و ہنگامہ دیکھ کے مبہوت رہ گیا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک کوئی وقت نہ ہوتا جب فوجون اور پلٹنون کے نقارون کی آواز نہ سُنی جاتی ہو۔ پہرون اور

گھڑیون کے بتانے کے لیے بار بار نوبت بجتی اور گھڑیالون پر موگریان پڑتین جن کے شور وغل سے کان اُڑے جاتے۔ سڑکون پر دیکھیے تو ہردم گھوڑون۔ ہاتھیون اونٹون۔ خچرون۔ شکاری کتون۔ گائے بھینسون۔ بیلون۔ چھکڑون۔ اور توپون کے گذرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ جن کا شمار حساب اور اندازے سے باہر تھا۔ راستہ چلنا دشوار تھا۔

ایک عجیب رونق وتمکنت کا شہر نظر آیا جس مین وضعداران دہلی مین سے خوش پوشاک اور وضعدار شریف زادے۔ حاذق اطباے یونانی۔ اعلیٰ درجے کے مردانے اور زنانے طائفے۔ ہر شہر اور ہر مقام کے مشہور اور باکمال گویئے سرکار مین ملازم تھے۔ اور بڑی بڑی تنخواہین پاکے عیش وفارغ البالی کی زندگی بسر کرتے۔ ادنیٰ واعلیٰ سب کی جیبین روپون۔ اشرفیون سے بھری ہوئی تھین۔ اور ایسا نظر آتا کہ جیسے یہان کبھی کسی نے افلاس واحتیاج کو خواب مین بھی نہین دیکھا ہے۔ نواب وزیر (شجاع الدولہ بہادر) شہر کی سرسبزی ورونق اور رعایا کی مرفہ الحالی مین ہمہ تن مصروف ہین اور معلوم ہوتا تھا کہ چندہی روز مین فیض آباد دہلی کی ہمسری کا دعوے کرے گا۔

چونکہ کسی ملک اور کسی شہر کا رئیس اُس نفاست اور شان وشکوہ سے نہین رہتا تھا جس طرح کہ نواب شجاع الدولہ رہتے تھے۔ اور اسکے ساتھ ہی یہ نظر آتا تھا کہ یہین کے لوگ اس بے جگری سے ہر کام مین اور ہر موقع ومحل پر دولت صرف کرنے کو ہین تیار ہو جاتے تھے۔ اس لیے ہر قسم کے اور ہر جگہ کے اعلیٰ دستکارون صناعون اور طالبعلمون نے وطنون کو خیرباد کہہ کے فیض آباد ہی کو اپنا مسکن بنا لیا۔ اور یہان ہر زمانے مین ڈھاکے۔ بنگالے۔ گجرات۔ مالوہ۔ حیدرآباد۔ شاہجہان آباد۔ لاہور۔ پشاور۔ کابل۔ کشمیر اور ملتان وغیرہ کے طالب علمون کا ایک بڑا بھاری گروہ موجود رہتا جو علما کی درسگاہون مین تعلیم پاتے۔ اور اُس چشمۂ علم سے جو فیض آباد مین جاری تھا سیراب ہو ہو کے اپنے گھرون کو واپس جاتے۔ کاش نواب وزیر اور دس بارہ برس جی جاتے تو گھاگرا کنارے ایک نیا شاہجہان آباد آباد ہو جاتا۔ اور دنیا ایک نئی زندہ دہلی کی صورت دیکھ لیتی۔

یہ نواب شجاع الدولہ کے صرف نو سال کے قیام کا نتیجہ تھا جس نے فیض آباد کو ایسا بنا دیا۔ اور ان نو سال میں بھی صرف برسات کے چار مہینے وہ شہر میں رونق افروز رہتے۔ باقی زمانہ اپنی قلمرو کے دورے اور سیر وشکار میں صرف ہوتا تھا۔ شجاع الدولہ کا طبعی میلان مہ جبین عورتوں اور رقص وسرود کی طرف تھا جس کی وجہ سے بازاری عورتوں اور ناچنے والے طائفوں کی شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی تھی کہ کوئی گلی کوچہ اُن سے خالی نہ تھا۔ اور نواب کے انعام واکرام سے وہ اس قدر خوشحال اور دولتمند تھیں کہ اکثر رنڈیاں ڈیرہ دار تھیں جن کے ساتھ دو دو تین تین عالیشان خیمے رہا کرتے۔ اور نواب صاحب جب اضلاع کا دورہ کرتے اور سفر میں ہوتے تو نوابی خیموں کے ساتھ ساتھ اُنکے خیمے بھی شاہانہ شکوہ سے چھکڑوں پر لد لدکے رواں ہوتے اور اُنکے گرد دس دس بارہ بارہ تلنگوں کا پہرہ رہتا۔ اور جب حکمران کی یہ وضع تھی تو تمام امرا اور سرداروں نے بھی بے تکلف یہی وضع اختیار کر لی۔ اور سفر میں سب کے ساتھ رنڈیاں رہنے لگیں۔ اگرچہ اس سے بداخلاقی اور بے شرمی کو ترقی ہو گئی لیکن اس میں شک نہیں کہ ان شاہدان بازاری کی کثرت اور امرا کی شوقینی سے شہر کی رونق بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی اور فیض آباد دُلھن بنگیا تھا۔

۱۷۷۳ء میں شجاع الدولہ نے مغرب کا سفر کیا۔ اس سفر میں شاہی کیمپ کی رونق اور چہل پہل بیان سے باہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ نوابی علم اقبال کے ساتھ ساتھ ایک بڑا بھاری شہر سفر کر رہا ہے۔ لکھنؤ ہوتے ہوئے اٹاوے پہونچے جس پر مرہٹے قابض تھے۔ ایک ہی حملے میں اُسے اُن سے چھین کے اپنے قبضے میں کیا۔ اور احمد خاں بنگش کی قلمرو میں داخل ہو کے کوڑیا گنج اور کاس گنج میں خیمہ زن ہوئے۔ یہاں سے اُنھوں نے حافظ رحمت خاں فرمانروائے بریلی کو لکھا "گذشتہ سال میں نے ایک کروڑ روپے مہاجی سیندھیا مرہٹے کو بھیجے تھے جس نے آپ کا وہ تمام علاقہ جو درمیان دوآبہ ہے آپ سے چھین لیا تھا۔ وہ رقم ادا کر کے میں نے آپ کا وہ علاقہ اُنکے قبضے سے چھڑایا اور آپ کے حوالے کر دیا۔ لہذا اب پچاس لاکھ کی رقم جو آپ کی طرف سے میں نے ادا کی تھی فوراً ادا کیجیے"۔ حافظ رحمت خاں نے اپنے تمام افغان سرداروں اور بھائی بندوں کو جمع کر کے کہا "شجاع الدولہ لڑائی کے لیے

چاہتے ڈھونڈھ رہے ہین - مناسب یہ ہے کہ یہ مطلوبہ رقم ادا کردی جائے - بیس لاکھ مین اپنے پاس سے دیتا ہون اور باقی تیس لاکھ تم جمع کردو" نا عاقبت اندیش پٹھان سرداروں نے جواب دیا" شجاع الدولہ کے آدمی دیکھے ہی کے ہین وہ بھلا ہم سے کیا مقابلہ کرین گے؟ باقی رہی انگریزی فوج جو اُن کے ساتھ ہے تو اُنکی توپون پر جس وقت ہم تلوارین سُوت سُوت کے جا پڑین گے سب کے حواس جاتے رہین گے - دینے لینے کی کچھ ضرورت نہین" حافظ رحمت خان نے یہ سُن کے کہا "تمھین اختیار ہے - مگر مین ابھی سے کہے رکھتا ہون کہ اگر لڑائی کا رنگ بدلا تو مین میدان سے زندہ نہ آؤن گا - اور اُس کا جو کچھ انجام ہوگا وہ تمھین کو بھگتنا پڑے گا"

ہر تقدیر شجاع الدولہ کو اپنی خواہش کے موافق جواب نہ ملا - فوج لے کے چڑھ گئے - لڑائی ہوئی - اور لڑائی کا انجام وہی ہوا جسے تقدیر نے حافظ رحمت خان کی زبان سے پہلے ہی سُنوا دیا تھا - حافظ رحمت خان شہید ہوے اور اُن کی حکومت کا خاتمہ ہوگیا - مگر یہ فتح شجاع الدولہ بہادر کو بھی سزاوار نہ ہوئی - ۱۴ - صفر ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۴ء) کو لڑائی ہوئی تھی - ۱۱ شعبان کو شجاع الدولہ بریلی سے کوچ کرکے لکھنو آئے - ماہ مبارک رمضان لکھنو مین بسر کیا - ۸ - شوال کو لکھنو سے کوچ کرکے ۱۴ - کو فیض آباد مین داخل ہوے - اور فتح کو ۹ مہینے دس ہی دن ہوے تھے - اور گھر مین پورے ڈیڑھ مہینے بھی آرام کرنے کا موقع نہین ملا تھا کہ ۲۳ - ذیقعدہ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) کو رہگرائے عالم جاودان ہوے - اور افسوس اُن کی وفات ہی کے ساتھ فیض آباد کی ترقی کا دور بھی ختم ہوگیا -

اس وقت حکومت اودھ مین سب سے بڑا اثر نواب شجاع الدولہ بہادر کی بی بی بہو بیگم صاحبہ کا تھا - جو نہایت ہی دولتمند بھی سمجھی جاتی تھین - اُنکی منظوری سے نواب آصف الدولہ مسند نشین حکومت ہوے - مگر اُن کی اخلاقی حالت نہایت خراب تھی - اور مصاحبون کو مناسب معلوم ہوا کہ ماں بیٹون کو الگ رکھین - چند روز تک سیر و شکار مین مصروف رہنے کے بعد نواب آصف الدولہ بہادر نے لکھنو مین قیام اختیار کرلیا جو یہین بیٹھے بیٹھے ماں کو ستایا کرتے - اور بار بار اُن سے

روپیہ طلب کرتے۔

بہو بیگم صاحبہ کے موجود رہنے سے فیض آباد کو اُن کی زندگی تک تھوڑی بہت رونق حاصل رہی۔ اگرچہ اُن کی زندگی میں بھی نواب آصف الدولہ کی نالایقیوں نے بہو بیگم صاحبہ کے اطمینان میں اور اسکی وجہ سے فیض آباد کے امن و امان میں خلل ڈالا۔ مگر اس محترم خاتون کی زندگی تک وہ جھگڑے اور ہنگامے بھی ایک گونہ باعث رونق ہو جایا کرتے تھے۔ اُن کی وفات پر فیض آباد کی تاریخ ختم ہوگئی۔ اور لکھنؤ کا دَور شروع ہوا جس کا حال ہم آیندہ لکھیں گے۔

(۳)

ٹھیک کسی کو نہیں معلوم کہ لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد کب پڑی؟ اس کا بانی کون تھا؟ اور وجہ تسمیہ کیا ہے؟ لیکن مختلف خاندانوں کی قومی روایتوں اور قیاسات سے کام لے کے جو کچھ بتایا جا سکتا ہے یہ ہے۔

کہتے ہیں راجہ رامچندر جی لنکا کو فتح کر کے اور اپنے بن باس کا زمانہ پورا کر کے جب سریر جہان پناہی پر جلوہ افروز ہوے تو یہ سرزمین اُنھوں نے جاگیر کے طور پر اپنے ہمسفر و ہمدرد بھائی لچھمن جی کو عطا کر دی۔ چنانچہ اُنھیں کے قیام یادگار دوسے یہاں دریا کنارے ایک اونچے ٹیکرے پر ایک بستی آباد ہوگئی جس کا نام اُسوقت سے "لچھمن پور" قرار پایا۔ اور وہ ٹیکرا "لچھمن ٹیلا" مشہور ہوا۔ اُس ٹیلے میں ایک بہت گہرا غار یا کنواں تھا جس کی کسی کو تھاہ نہ ملتی تھی۔ اور لوگوں میں مشہور تھا کہ وہ سیس ناگ تک چلا گیا ہے۔ اس خیال نے جذبات عقیدت کو حرکت دی۔ اور ہندو لوگ خوش اعتقادی سے جا جا کے اُس میں پھول پانی ڈالنے لگے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ جودھشتر کے پوتے راجہ جنم جے نے یہ علاقہ قرنامنس بزرگوں۔ رشیوں اور منیوں کو جاگیر میں دیدیا تھا۔ جنھوں نے یہاں چپے چپے پر اپنے آشرم بنائے اور ہر کے دھیان میں مصروف ہو گئے۔ ایک مدت کے بعد اُنکو کمزور دیکھ کے دو نئی قومیں ہمالیہ کی ترائی سے بڑھ کے اس ملک پر قابض ہو گئیں جو باہم ملی جلی تھی۔

عہ ہندو دیو مالا میں سیس ناگ اُس ہزار سروالے سانپ کا نام ہے جو دھرتی (زمین) کو اپنے پھن پر اُٹھائے ہوئے ہے۔ اور قدرت و عظمت الٰہی کا ایک واجب الاحترام مظہر ہے۔

اور ایک ہی نسل کی دو شاخیں معلوم ہوتی تھیں - ایک "بھر" اور دوسری "پاسی"۔

انھیں لوگوں سے سید سالار مسعود غازی سے سنہ ۴۵۹ محمدی (سنہ ۱۰۳۳ء) میں مقابلہ ہوا - اور غالباً انھیں پر بختیار خلجی نے سنہ ۶۳۱ محمدی (سنہ ۱۲۰۲ء) میں چڑھائی کی تھی - لہٰذا اس سرزمین پر جو مسلمان خاندان پہلے پہل آ کے آباد ہوے وہ انھیں دونوں حملہ آوروں خصوصاً سید سالار مسعود غازی کے ساتھ آنے والوں میں سے تھے۔

بھر اور پاسیوں کے علاوہ برہمن اور کایستھ بھی یہاں پہلے سے موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے مل کے یہاں ایک چھوٹا سا شہر بسا لیا اور امن و امان سے بسنے لگے - لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس بستی کا نام "لچھمن پور" سے بدل کے "لکھنؤ" کب ہو گیا - اس آخری مروجہ نام کا پتہ شہنشاہ اکبر سے پہلے نہیں چلتا - لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو مسلمانوں کی کافی آبادی پہلے سے موجود تھی جس کا ثبوت اس واقعے سے ہو سکتا ہے جو شیوخ لکھنؤ کی خاندانی روایتوں میں بہت پہلے سے موجود ہے کہ سنہ ۹۴۶ محمدی (سنہ ۱۵۳۰ء) میں جب ہمایوں بادشاہ کو شیر شاہ کے مقابل جونپور میں شکست ہوئی تو وہ میدان چھوڑ کے سلطان پور۔ لکھنؤ۔ بلی بھیت۔ ہوتا ہوا بھاگا تھا - لکھنؤ میں اُس نے صرف چار گھنٹے دم لیا تھا - اور گو کہ شکست کھا کے آیا تھا اور کوئی قوت و حکومت نہ رکھتا تھا مگر لکھنؤ کے لوگوں نے محض انسانی ہمدردی اور مہمان نوازی کے خیال سے اُن چند گھنٹوں ہی میں دس ہزار روپیہ اور پچاس گھوڑے اُس کی نذر کیے تھے - اتنے تھوڑے زمانے میں اس سامان کے فراہم ہو جانے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اُن دنوں یہاں معتدبہ آبادی موجود تھی - اور اُن دنوں کا لکھنؤ آج کل کے اکثر قصبات سے زیادہ بارونق اور خوشحال تھا۔

اُسی قدیم زمانے کے آنے والوں میں شاہ مینا کا خاندان بھی ہے جن کا مزار پُر انوار آج تک مرجع انام ہے - اور غالباً اُسی عہد کے آنے والوں میں شاہ پیر محمد بھی تھے جنھوں نے خاص لچھمن ٹیلے پر سکونت اختیار کی - اور وہیں پیوند زمین ہوے - اُنکے قیام کی وجہ سے وہ پُرانا ٹیکرا لچھمن ٹیلے سے "شاہ پیر محمد کا ٹیلا" ہو گیا - اور مرور

ایام سے وہ گہرا غار بھی پٹ گیا۔ اُس پر بعد کے زمانے میں شہنشاہ اورنگ زیب
نے جو بہ نفسِ نفیس یہاں آیا تھا ایک عمدہ۔ مضبوط۔ خوبصورت۔ اور شاندار مسجد بنا کے
کھڑی کر دی جو آج تک عالمگیر کی طرف سے صدائے "اللہ اکبر" بلند کر رہی ہے۔

سنہ ۹۹۸ ہجری (۱۵۹۰ء) میں شہنشاہ اکبر نے جب سارے ہندوستان کو بارہ
صوبوں میں تقسیم کیا تو صوبۂ اودھ کے صوبہ دار یا والی کا مستقر بادی النظر میں لکھنؤ
ہی قرار پایا تھا۔ اُن دنوں اتفاق سے شیخ عبدالرحیم نام ضلع بجنور کے ایک خستہ
حال و پریشان روزگار بزرگ بہ تلاشِ معاش دہلی پہونچے۔ وہاں امرائے دربار
میں رسوخ پیدا کر کے بارگاہِ شہنشاہی میں باریاب ہوئے۔ آخر منصبدارانِ شاہی
میں شامل ہو کے لکھنؤ میں جاگیر پائی۔ اور چند روز بعد بڑے تزک و احتشام اور
کر و فر سے اپنی جاگیر میں آ کے مقیم ہوئے۔ یہاں خاص لچھمن ٹیلے یا شاہ پیر محمد کے
ٹیلے پر مقیم ہو کے اُنھوں نے اپنا پنج محلا بنوایا۔ شیخن دروازہ تعمیر کرایا۔ اور
لکھنؤ ہی میں پیوندِ زمین ہوئے۔ اُن کا مقبرہ "نادان محل" کے نام سے آج تک مشہور
ہے جس کی عمارت کو ابھی چند روز ہوئے گورنمنٹ آف انڈیا نے پسند کر کے اپنی
زیرِ حمایت لے لیا ہے۔

اسی زمانے میں یہاں شیخ عبدالرحیم نے لچھمن ٹیلے کے پاس ایک دوسری بلندی
پر ایک چھوٹا قلعہ تعمیر کرایا جو قرب و جوار کی گڑھیوں سے زیادہ مضبوط تھا۔
اور گرد و نواح کے لوگوں پر اُس کا بڑا اثر پڑتا تھا۔ یا تو اس لیے کہ شیخ عبدالرحیم
کو دربار شاہی سے علم ماہی مراتب عطا ہوا تھا۔ یا اس لیے کہ اس قلعے کے ایک
مکان میں چھبیس محرابیں تھیں اور ہر محراب پر معمار نے دو دو مچھلیاں بنا کے باون
مچھلیاں بنا دی تھیں۔ اس قلعے کا نام "مچھی بھون" مشہور ہو گیا۔ "بھون" کا لفظ
یا تو قلعہ کے معنوں میں ہے۔ یا "باون" سے بگڑ کے بن گیا ہے۔ جس معمار نے اس قلعہ
کو تعمیر کیا وہ "لکھنا" نام ایک اہیر تھا۔ اور کہتے ہیں کہ اُسی کے نام سے شہر کا نام لکھنؤ
ہو گیا۔ اور بعض کا خیال ہے کہ لچھمن پور ہی بگڑ کے لکھنؤ بن گیا ہے۔ ان میں سے جو
بات ہو مگر اس آبادی نے یہ نام شیخ عبدالرحیم کے آنے کے بعد پایا۔

چند روز بعد شیخ عبدالرحیم کے خاندان والوں یعنی شیخزادوں کے علاوہ یہاں

پٹھانوں کا ایک گروہ آ گیا - جو جنوب کی طرف بسے اور "رام نگر کے پٹھان" مشہور ہوئے۔ اُنھوں نے اپنی زمینداری کی حد اُس مقام تک قرار دی تھی جہاں اب گول دروازہ واقع ہے - کیونکہ وہاں سے دریا کی طرف بڑھیے تو شیخ زادوں کی زمین شروع ہوتی تھی - ان پٹھانوں کے بعد شیوخ کا ایک نیا گروہ آ کے مشرق کی طرف بس گیا جو "شیوخ نہرہ" کہلاتے ہیں - اُن لوگوں کی زمین وہاں پر تھی جہاں اب ریزیڈنسی کے کھنڈر پڑے ہیں -

یہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں پر متصرف اور اپنے حلقوں کے حاکم تھے لیکن شیخزادوں کا اثر سب پر غالب تھا اور قرب و جوار پر اُن کا دباؤ پڑتا تھا جس کا قوی سبب یہ تھا کہ یہ لوگ دربار دہلی میں رسوخ رکھتے تھے - ان میں سے کئی شخص پورے ملک اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو گئے تھے - اور اُنکے قلعہ مچھی بھون کی مضبوطی کی اس قدر شہرت تھی کہ عوام کی زبان پر تھا "جس کا مچھی بھون اُس کا لکھنؤ"۔

اکبر ہی کے زمانے میں لکھنؤ ترقی کرنے لگا تھا - اور اُسکی آبادی بڑھتی اور پھیلتی جاتی تھی - یہ صحیح ہے کہ صوبہ دار اودھ اُنھیں شیخزادوں میں سے منتخب ہوے لیکن عام معمول یہ تھا کہ اس خدمت پر معززین دہلی مقرر ہوتے - جو سالوں سال اپنے گھر بیٹھے رہتے - فقط تحصیل وصول کے زمانے میں ایک دورہ سا کرتے اور اُنکے نائب یہاں رہا کرتے - لہذا اُن سے شہر کی ترقی کی کوئی امید نہ کی جا سکتی تھی - ہاں یہاں کے دو ایک شیخزادے جو صوبہ دار مقرر ہو گئے تو اُن کے تقرر سے البتہ لکھنؤ کو فائدہ پہونچا -

لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو لکھنؤ کی طرف خاص توجہ تھی - چنانچہ اُس نے یہاں کے برہمنوں کو باجپئی چڑھاوے کے لیے ایک لاکھ روپئے مرحمت فرمائے تھے - اور اُسی وقت سے لکھنؤ کے باجپئی برہمن مشہور ہوے - اسی سے پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے قدیم ترین ہندو محلے جو اکبر کے وقت میں موجود تھے - باجپئی ٹولہ - کٹاری ٹولہ - سوندھی ٹولہ - بنجاری ٹولہ اور اہیری ٹولہ ہیں - اور یہ سب چوک ہی کے اطراف میں ہیں -

مرزا سلیم نے جو تخت پر بیٹھ کے نورالدین جہانگیر کے لقب سے مشہور ہوے باپ

کی زندگی اور اپنے ایام ولیعہدی میں مرزا منڈی کی بنیاد ڈالی جو مچھی بھون سے مغرب طرف واقع ہے۔ اکبر کے آخر عہد میں یہاں کے صوبہ دار جواہر خان تھے۔ وہ تو دہلی میں رہتے مگر ان کے نائب قاضی محمود بلگرامی نے چوک کے جنوب میں اس سے ملے ہوئے داہنی طرف محمود نگر اور بائیں طرف شاہ گنج آباد کیے۔ اور انکے اور چوک کے درمیان میں بادشاہ کے نام سے اکبری دروازہ تعمیر کرایا۔

عہد اکبری میں جبکہ یہ عمارتیں بن رہی تھیں اور یہ محلے آباد ہو رہے تھے لکھنؤ ایک اچھی تجارت گاہ بن گیا تھا۔ اور ترقی کے اس درجے کو پہنچا ہوا تھا کہ ایک فرنسیسی تاجر نے جو گھوڑوں کی تجارت کرتا تھا یہاں قیام کر کے نفع حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور دربار شہنشاہی سے لکھنؤ کے قیام کے لیے سند مستامنی[عہ] حاصل کر کے یہاں اپنا اصطبل قائم کیا۔ اور پہلے ہی سال میں اس قدر پھیلا ہوا کہ چوک کے متصل چار عالیشان مکانات تعمیر کر لیے۔ سال ختم ہونے پر جب اس نے پروانۂ مستامنی کی تجدید چاہی تو اسے زیادہ قیام کی اجازت نہ ملی۔ اور اس پر بھی اس نے زبردستی ٹھہرنے کا ارادہ کیا تو حسب الحکم شہنشاہی حکام شہر نے اس کے مکانات ضبط کر کے نزول سرکار کر لیے اور اسے یہاں سے نکال دیا۔ وہ چاروں مکان مدت تک سرکار کے قبضے میں رہے یہاں تک کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں جب ملا نظام الدین سہالوی نے اپنے قصبے کے فسادوں سے عاجز آ کے لکھنؤ میں سکونت اختیار کرنے کا قصد کیا تو عطیۂ سرکار کے طور پر وہ چاروں مکان انھیں دیے گئے۔ اور انھوں نے اپنے پورے خاندان کے ساتھ آ کے ان مکانوں میں سکونت اختیار کی جو اپنے گرد و پیش کے بہت سے مکانات کے ساتھ آج تک "فرنگی محل" کہلاتے ہیں۔ ملا صاحب کے قدوم کی برکت سے لکھنؤ علم و فضل کا مرکز اور طلبۂ علوم کا مرجع و ماویٰ بن گیا۔ اور اس علمی مرجعیت کو اس قدر ترقی ہوئی کہ ملا نظام الدین

عہ مستامن کے معنی طالب امن ہیں۔ یورپ والوں کو چونکہ مسلمانوں اور ہندوؤں میں اپنے لیے خطرہ نظر آیا کرتا تھا اس لیے جہاں قیام کرنا چاہتے وہاں کے لیے دربار دہلی سے مستامنی کی سند حاصل کر لیا کرتے۔ تاکہ عمال و حکام وغیرہ ایذا انھیں نہ پہنچائیں۔ اس سند سے چونکہ سلطنت پر ذمہ داریاں عائد ہو جاتی تھیں اس لیے ایک سال سے زیادہ کی سند کم دی جاتی تھی۔

کا مرتب کیا ہوا نصاب تعلیم جو "سلسلۂ نظامیہ" کہلاتا ہے مدت دراز سے ہندوستان ہی کا نہیں سارے ایشیا کا نصاب تعلیم ہے اور علمی کمالات کے ساتھ اس میں ولیانہ برکتیں بھی مضمر تصور کی جاتی ہیں۔ اور اس سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اُس قدیم زمانے میں کہاں کہاں اور کتنی کتنی دُور کے طلبۂ علوم لکھنؤ میں جمع رہتے ہوں گے۔

یورپین سیاح لیکٹ جو ۱۰۴۱ھ محمدی (۱۶۳۱ء) یعنی شاہجہان بادشاہ کی سلطنت کے اوائل میں ہندوستان کی سیر کر رہا تھا۔ لکھنؤ کی نسبت لکھتا ہے کہ "یہ عظیم الشان منڈی ہے" عہد شاہجہانی میں یہاں کے صوبہ دار سلطان علی شاہ قلی خان تھے۔ اُنکے دو بیٹے تھے۔ مرزا فاضل اور مرزا منصور۔ اُنھیں دونوں کے نام سے اُنھوں نے محمود نگر سے جنوب کی طرف آگے بڑھ کے دو نئے محلے فاضل نگر اور منصور نگر آباد کیے۔

اس زمانے میں یہاں اشرف علی خان نام ایک رسالدار تھے اُنھوں نے اسی سلسلے میں اشرف آباد بسایا۔ اور اُن کے بھائی مشرف علی خان نے نالے کے دوسری طرف اپنا گھر بنا کے مشرف آباد نام ایک اور محلہ قائم کیا جس کا نام مرور ایام سے اب نوبستہ ہو گیا ہے۔ انھیں دنوں پیر خان نام ایک اور فوجی افسر تھے جنھوں نے ان سب محلوں سے مغرب کی طرف دُور جا کے اپنی گڑھی بنائی جو مقام آج تک "پیر خان کی گڑھی" کہلاتا ہے۔

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے کسی ضرورت سے اجودھیا کا سفر کیا تھا۔ واپسی کے وقت لکھنؤ میں ٹھہرتا ہوا دہلی گیا۔ اس موقع پر اُس نے شاہ پیر محمد کے ٹیلے والی مسجد تعمیر کرائی۔ جو خاص لچھمن ٹیلے پر ہونے کی وجہ سے ایسی بلندی پر واقع ہے جس سے زیادہ مناسب جگہ مسجد کے لیے لکھنؤ میں نہیں ہو سکتی۔ اور غالباً اسی موقع پر اُس نے فرنگی محل کے مکانات علامۂ زمان مُلا نظام الدین کی نذر کیے ہونگے۔

محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں لکھنؤ کا صوبہ دار گردھا ناگا نام ایک بہادر ہندو رسالدار تھا۔ اُس کا چچا چھبیلے رام دربار دہلی کی طرف سے الہ آباد کی حکومت پر مامور تھا۔ چھبیلے رام کے مرنے پر گردھا ناگا نے سرکشی اختیار کی اور ارادہ کیا کہ

چچا کی جگہ زبردستی الہ آباد کا حاکم ہو جائے۔ مگر پھر خود ہی کچھ سوچ کے اُس نے اظہار اطاعت و فرمان برداری کیا۔ اور دربار سے اُسے اودھ کی صوبہ داری کا خلعت عطا کیا گیا۔ اُس نے یہاں کی سکونت اختیار کی۔ اور اُس کی بی بی نے جو زاق کہلاتی تھی زاق شہر آباد کیا۔

مگر یہاں کا حاکم اور صوبہ دار چاہے کوئی ہو شیخزادوں کا اس قدر زور تھا کہ کسی والی کو چاہے کیسا ہی زبردست ہو اور کیسی ہی سند حکمرانی لے کے آیا ہو یہ جرأت نہ ہو سکتی تھی کہ اُنکے حلقے میں قدم رکھے۔ مچھی بھون کو اگرچہ قصرِ امارت کی حیثیت حاصل تھی لیکن شیخزادوں نے اُسے اپنی موروثی جائداد بنا لیا تھا۔ اور دہلی سے جو والی آتا اُس کے پاس پھٹکنے نہ پاتا۔ اُنھوں نے مچھی بھون کے پاس دو عمارتیں تعمیر کرلی تھیں جن میں سے ایک کا نام "مبارک محلا" تھا اور دوسری کا نام "پنچ محلا" تھا پنچ محلے کی نسبت کوئی کہتا ہے کہ پنج منزلی عمارت تھی اور کوئی کہتا ہے کہ ایک دوسرے کے پاس پانچ محل بنے ہوے تھے۔ اور اُنکے جنوب طرف ایک بڑا عمر ابدار پھاٹک تھا جو "شیخن دروازہ" کہلاتا تھا۔ شہر سے جو لوگ شیخزادوں کی مذکورہ عمارتوں میں جانا چاہتے اسی پھاٹک میں سے ہو کے گذرتے۔

اس پھاٹک کی محراب میں بانکے شیخزادوں نے ایک ننگی تلوار لٹکا رکھی تھی اور حکم تھا کہ جو کوئی یہاں آنا چاہے کوئی ہو اور کتنا ہی بڑا شخص ہو پہلے اس تلوار کو جھک کے سلام کرے پھر آگے قدم بڑھائے۔ کس کی مجال تھی کہ اس حکم کی تعمیل میں عذر کرے؟ یہاں تک کہ دہلی سے جو والی اور حاکم مقرر ہوکے آتے تھے اور شیخوں سے ملنے جاتے تو اُنھیں بھی جبراً و قہراً اُس تلوار کے آگے ضرور سر جھکا دینا پڑتا۔

لکھنؤ کی یہ حالت تھی کہ ۱۱۴۴ھ مجری (۱۷۳۲ء) میں نواب سعادت خان برہان الملک دربار دہلی سے اودھ کے صوبہ دار مقرر ہو کے آئے۔ جن سے ہندستان کے اُس آخری مشرقی دربار کی بنیا پڑی جس کے عروج کو ہم مشرقی تمدن کا آخری نمونہ قرار دے کے بیان کرنا چاہتے ہیں۔ پہلے نمبر میں ہم نے فیض آباد کی حالت دکھائی جو اسی تمدن کا نقش اولین اور اسی مشرقی دربار لکھنؤ کا ایک ضمیمہ تھا۔ اس نمبر میں اس دربار کے قائم ہونے سے پیشتر کے لکھنؤ کی تصویر دکھا دی۔ اور اُس

بساط کو اپنے ناظرین کے پیش نظر کردیا جس پر اس دربار نے اپنی شطرنج بچھائی۔ آیندہ چند نمبرون مین ہم اس نیشاپوری خاندان کی تاریخِ حکومت بیان کرین گے۔ اور اسکے بعد دکھائین گے کہ یہ تمدن کیا اور کیسا تھا۔

(۳)

نواب سعادت خان برہان الملک کے خاندان کے متعلق اسی قدر بتا دینا کافی ہی کہ میر محمد نصیر نام نیشاپور کے ایک سید زادے جن کا سلسلۂ نسب امام موسیٰ کاظم سے ملتا ہے سنہ ۱۱۳۵ ہجری (سنہ ۱۷۰۶ع) عہد بہادر شاہ مین وارد ہندوستان ہوے۔ اُن کے بڑے بیٹے میر محمد باقر ساتھ آئے تھے جنھون نے یہان شادی کر لی۔ اور باپ بیٹون نے ناظم بنگالہ کے زیر حمایت عظیم آباد پٹنہ مین سکونت اختیار کی۔ محمد باقر کو ہندوستان کی بی بی سے خدا نے ایک بیٹا دیا جو بعد کو شیر جنگ کے معزز لقب سے مشہور ہوا۔

میر محمد نصیر کے آنے کے دو سال بعد اُن کے چھوٹے بیٹے میر محمد امین بھی نیشاپور سے ہندوستان مین آگئے۔ عظیم آباد پہونچے تو سُنا کہ والد نے سفر آخرت کیا۔ اور اب دونون بھائی میر محمد باقر اور میر محمد امین دہلی کو روانہ ہوے۔ جہان پہونچ کے میر محمد امین کو شاہزادون کی جاگیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس مین اُنھون نے ایسی لیاقت مستعدی۔ اور کارگزاری دکھائی کہ تمام لوگون مین شہرت ہو گئی۔ اقبال برسر یاری تھا۔ چند ہی روز بعد دربار شاہی کے معزز امیرون اور منصبدارون مین شامل ہوے پھر صوبہ دار اکبرآباد کی بیٹی سے نکاح ہو گیا۔ اور اُس اعلیٰ طبقۂ امرا مین شمار کیے جانے لگے جس پر سلطنت کی ذمہ داری کی خدمتون کے لیے انتخاب کی نظرین پڑتی تھین

اُن دنون دہلی مین ساداتِ بارہہ کا زور تھا جن سے رعیت تو رعیت خود بادشاہ سلامت ڈرتے تھے۔ محمد امین نے اُنکو قتل کرا کے سیدون کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا۔ اور لڑائی مین ایسی شجاعت دکھائی کہ دربار شاہی سے منصب ہفت ہزاری اور سات ہزار سوارون کی سرداری کے ساتھ "برہان الملک بہادر جنگ" کا خطاب عطا ہوا۔ اور اُسی وقت اکبرآباد کے صوبہ دار مقرر ہوے۔ اسکے بعد بادشاہی خواصون کی داروغگی عطا ہوئی جو بڑا معزز عہدہ تھا۔ اسکے تھوڑے دنون بعد وہ صوبۂ اودھ کے صوبہ دار اور اُسکے ساتھ ہی بادشاہی توپ خانے کے

دار و غہ مقرر ہوے۔ آدمی ہوشیار اور نہایت ہی بیدار مغز اور اُسکے ساتھ بڑے بہادر اور شجاع تھے۔ شاہی توپخانے کو اپنے ہاتھ میں لے کے اُنھون نے ایسی زبردست قوت پیدا کرلی جیسی اُن دنون سارے ہندوستان مین کسی کو نصیب نہ تھی۔ اُس زمانے مین کوڑہ کے زمیندار بھگونت سنگھ نے سلطنت سے سرتابی کرکے بڑا ازدہام رکھا تھا۔ اور کئی افسر جو اُس کی سرکوبی کو گئے اُسکے ہاتھ سے مارے جا چکے تھے۔ آخر برہان الملک اس مہم پر مامور ہوے اور یلغار کرتے ہوے پہونچے۔ بھگونت سنگھ نے چالاکی سے اُن کو گھیر لیا اور لڑائی کا رنگ ایسا بگڑا نظر آیا کہ بڑے بڑے بہادرون کے ہاتھ پاؤن پھول گئے۔ مگر برہان الملک نے ایسی جوانمردی سے مقابلہ کیا کہ دیر تک دشمن کے نرغے مین اُن کی لمبی سفید نورانی ڈاڑھی چمکتی اور رعب ڈالتی رہی۔ تھوڑی دیر مین بھگونت سنگھ اُن کے تیر کا نشانہ ہوا۔ اور دشمن بھاگ کھڑا ہوا۔

برہان الملک کی دوسری مہم اس سے بھی زبردست تھی۔ اُن دنون مرہٹون کا ہندوستان مین بڑا زور تھا۔ اُنھون نے تاجدار دہلی سے چوتھ مقرر کرالی تھی۔ اور بڑے بڑے سورما اُن کے نام سے کانپتے تھے۔ برہان الملک نے مرہٹون کو زبردست فوج کے ساتھ جاکے ایسی سخت شکست دی کہ اُنکے حواس جاتے رہے۔ نوک دُم بھاگے۔ اور برہان الملک نے تعاقب شروع کیا۔ واقعات تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس موقع پر برہان الملک زبردستی نہ روک دیے جاتے تو وہ بڑھ کے مرہٹون کا استیصال کردیتے۔ اور سلطنت مغلیہ اپنے اگلے عہد شباب کی طرح سارے ہندوستان کے سیاہ وسفید کی مالک ہو جاتی۔ مگر اُس بدنصیب زوال پذیر سلطنت کو مٹنا ہی تھا۔ درباریون کی سازش اور مقربین دربار کے حسد نے برہان الملک کی تدابیر کو رکوا دیا۔

اس بات نے برہان الملک کو یقین دلا دیا کہ بادشاہ میں اپنے نیک وبد کے سوچنے کی صلاحیت نہین اور اہل دربار بددیانت وخود غرض ہین۔ فوراً مرہٹون سے صلح کرلی۔ پھر ارادہ کیا کہ اپنے صوبے مین جاکے قیام کرین اور سب سے الگ ہوکے اپنے علاقے کو مضبوط اور منتظم بنادین۔ غرض برہان الملک نے دل مین

سمجھ لیا کہ اب سلطنت مغلیہ پنپنے والی نہیں ہے۔ اپنا صوبہ لے کے الگ ہو جانا ہی مناسب ہے۔ اور دربار دہلی کو اُس کی قسمت پہ چھوڑ دینا چاہیے۔

لکھنؤ میں جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں شیخزادوں کا زور تھا۔ اُنھوں نے اپنی عادت کے موافق انھیں بھی روکا۔ مگر برہان الملک حکمت عملی سے داخل ہو گئے اور نکسیر بھی نہ پھوٹنے پائی۔ برہان الملک کے لکھنؤ میں داخل ہونے کے متعلق دو روایتیں مشہور ہیں۔ ایک یہ کہ وہ برابر بڑھتے چلے آئے۔ یہاں تک کہ اکبری دروازے پر روکے گئے۔ چونکہ وہ سابق کے تمام صوبہ داروں کے خلاف تجربہ کار، متین اور سنجیدہ شخص تھے۔ ٹھیر گئے۔ اور محمود نگر میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دو ایک دن کے بعد شیخزادوں کی دعوت کی۔ اُن سے بڑی خاطر تواضع سے پیش آئے۔ لیکن جس وقت غافل شیخزادے الوان نعمت کا مزہ لوٹنے میں مصروف تھے شاہی فوج خاموشی کے ساتھ چوک میں داخل ہو رہی تھی۔ جو برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔ یہاں تک کہ مچھی بھون کے پاس جا پہونچی۔

دوسری روایت یہ ہے کہ محمد خان بنگش نے برہان الملک کو بتا دیا تھا کہ لکھنؤ کے شیخزادے بڑے شورہ پُشت ہیں اُن سے پیش پانا آسان نہیں۔ مگر قرب وجوار کے دوسرے شیوخ اُنکے خلاف ہیں۔ آپ اُن لوگوں سے مدد لیجیے۔ اور اُنھیں کی مدد سے لکھنؤ والوں کو زیر کیجیے۔ چنانچہ برہان الملک نے کاکوری میں قیام کر کے شیوخ کاکوری کو اپنے موافق بنا لیا۔ اُنھیں کی مدد اور رہبری سے آگے بڑھے۔ اور یہ سُن کے کہ محمود نگر اور اکبری دروازے میں مقابلے کا سامان کیا گیا ہے اصلی راستے سے کترا کے مغرب کی طرف کٹ گئے۔ گئو گھاٹ کے پاس دریا کے پار اُترے اور پار کی طرف سے آہستہ آہستہ آگے اچانک مچھی بھون پر آ پڑے۔ غرض جو صورت ہو۔ اُنھوں نے بغیر اس کے کہ کوئی مزاحم ہو قلعے پر قبضہ کر لیا۔

جب مچھی بھون پر قبضہ ہو گیا تو پھر کون دم مار سکتا تھا؟ شیخزادوں کے تمام معزز لوگوں نے حاضر ہو کے عاجزی سے سر جھکا دیا۔ برہان الملک ہاتھی پر سوار ہو کے شیخن دروازے میں داخل ہوئے اور اُس تلوار کو جو بڑے بڑے بہادروں سے سلام لے چکی تھی اپنی تلوار سے کاٹ کے گرا دیا۔ پھر شیخزادوں سے کہا ہمارے قیام

کے لیے مچھی بھون خالی کر دو"۔ اس میں اُنھوں نے لیت و لعل کرنا چاہی مگر نہ چلی۔ آخر ایک ہفتے کی مہلت دی گئی۔ اور اس مدت کے اندر شیوخ جو کچھ اسباب لے جا سکے اُٹھالے گئے۔ اور جو رہ گیا اُس پر برہان الملک کے سپاہیوں نے قبضہ کیا۔ قلعے میں جا کے رہنے سے پہلے اُسکے پاس ہی جہاں خیمے ڈال کے وہ رہے تھے وہاں ایک نوبت خانہ تعمیر کرادیا جس میں دربار اودھ کے آخر عہد تک روزانہ پچھ وقت نوبت بجتی تھی۔

اسکے بعد برہان الملک اجودھیا میں گئے اور دریا کنارے وہ بنگلہ بنوایا جسکا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً لکھنؤ میں آتے اور قیام کرتے تھے کیونکہ صوبے کا مستقر یہی شہر تھا۔ اُنکے زمانے میں یہاں کئی نئے محلے آباد ہوئے۔ قریب محلے اُن کے مغل سرداران فوج کے پڑاؤ کے مقامات تھے جہاں مستقل سکونت کے لیے لوگوں نے مکان بنانا شروع کر دیے۔ سید حسین خان کا کٹرہ۔ ابو تراب خان کا کٹرہ۔ خدایار خان کا کٹرہ۔ بزن بیگ خان کا کٹرہ۔ محمد بیگ خان کا کٹرہ۔ محمد علی خان کا کٹرہ۔ باغ مہانرائن۔ سرائے معالی خان اور اسمٰعیل گنج (جو مچھی بھون کے مشرق طرف تھا اب کھد گیا) سب اسی زمانے کے محلے یا برہان الملک کے سرداران فوج کی شہرت کا ہین ہیں۔

نواب برہان الملک چھ ہی برس اودھ اور لکھنؤ میں رہنے پائے تھے کہ ۱۱۵۲ ہجری (۱۷۳۹ء) میں نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کر دیا۔ اور وہ نہایت ہی تاکید کے ساتھ دہلی میں بلائے گئے۔ اُس پُر فتن زمانے میں جو کچھ واقعات گذرے اُن کو لکھنؤ سے تعلق نہیں۔ لکھنؤ میں اپنا نائب اور قائم مقام بنا کے وہ اپنے بھانجے اور داماد صفدر جنگ کو چھوڑ گئے تھے۔ نادر دہلی کو لوٹ چکا تھا اور قتل عام کرا چکا تھا مگر ابھی وہیں تھا کہ نواب برہان الملک نے دہلی میں وفات پائی۔ اُنکے بھتیجے شیر جنگ نے نادر شاہ سے سفارش اُٹھوائی کہ نواب مرحوم کے بعد اودھ کی صوبہ داری اُنھیں دی جائے۔ لیکن راجہ لچھمی نرائن نے جو برہان الملک کے معتمد عہدہ داروں میں تھا نادر کی خدمت میں اس مضمون کی ایک عرضداشت پیش کر دی کہ "نواب برہان الملک شیر جنگ سے خوش نہ تھے۔ اور اسی لیے اُنھوں نے اپنی بیٹی اُنکو چھوڑ کے صفدر جنگ کو

دی جو اُن کی نیابت کرتے تھے اور اس وقت بھی اُن کی طرف سے وہاں موجود ہیں
برہان الملک کے مال و اسباب کی مالک سرکار ہے ۔ جسے چاہے عطا کرے ۔ اس
لیے کہ کوئی وارث نہیں ہے ۔ یہ بھی عرض ہے کہ صفدر جنگ بُردبار ۔ خدا ترس ۔ لائق
اور وعدے کے سچے ہیں ۔ اور سپاہ اُن سے خوش ہے ۔ قطع نظر اسکے حضور کے
لیے برہان الملک نے دو کرور روپے کی رقم کا وعدہ کیا تھا اُسکے ادا کرنے کا انتظام
نواب صفدر جنگ نے کر لیا ہے ۔ جس وقت حکم ہو حاضر کیے جائیں ۔ ان وجوہ سے
امید ہے کہ حضور اُنھیں کی سفارش فرمائیں گے۔" یہ عرضداشت دیکھتے ہی نادر شاہ
نے صفدر جنگ کے لیے محمد شاہ سے خود ہی خلعت صوبہ داری لے لیا ۔ اور اپنے
ایک مصاحب اور دو سو سواروں کے ساتھ اودھ میں صفدر جنگ کے پاس بھیجا ۔
یوں خلعت صوبہ داری پہن کے صفدر جنگ نے وہ دو کرور کا نذرانہ نادر کے پاس
بھجوا دیا ۔ اور اپنے علاقے پر حکومت کرنے لگے ۔

صفدر جنگ کا پورا نام مرزا مقیم ابو المنصور خان صفدر جنگ تھا ۔ گو اُن میں
برہان الملک کی سی سچی بہادری ۔ سادگی ۔ راست بازی ۔ اور جفاکشی نہ تھی مگر نہایت
فیاض ۔ بلند حوصلہ ۔ رحمدل ۔ رعایا پرور ۔ اور منتظم تھے ۔ شہر سے تین میل کی مسافت
پر اُنھوں نے قلعۂ جلال آباد تعمیر کرایا ۔ اور مچھی بھون کے اندر پنچ محلے کی جو قدیم عمارت
تھی اُسے بھی شیخزادوں سے لے لیا ۔ اور اُسکے عوض میں دو گانوان میں ۷۰۰ بیگھ
زمین شیخزادوں کو رہنے اور بسنے کے لیے عطا کی ۔ جس سے اگرچہ شیخزادوں پر ظلم ہوا
مگر لکھنؤ کی آبادی کو وسعت اور ترقی حاصل ہوئی ۔ مچھی بھون کو صفدر جنگ نے
از سر نو تعمیر کرایا اور اُسے بہت درست کیا ۔

لیکن صفدر جنگ پانچ ہی برس اپنے صوبے میں رہنے پائے تھے کہ دہلی میں اُنکی
طلبی ہوئی ۔ اور راجہ نول رائے کو اپنی نیابت پر لکھنؤ میں چھوڑ کے وہ دہلی چلے گئے ۔
نول رائے علم دوست ۔ وقت کا پابند ۔ جفاکش ۔ بہادر اور بہت بڑا منتظم تھا ۔ اور
اسکے ساتھ اُسے خدا نے اپنے آقا کی سی اولوالعزمی اور فیاضی بھی دی تھی ۔ اُس نے
ارادہ کیا کہ مچھی بھون کے سامنے دریا پر ایک پُل تعمیر کرے ۔ پایوں کی بنیاد ڈالنے
کے لیے گہرے کنوئیں کھدوائے ۔ لیکن پائے بننا شروع نہیں ہوئے تھے کہ اپنے

آقا کی طلب پر اُسے احمد خان بنگش کے مقابلے کے لیے جانا پڑا۔ اس مہم پر وہ بڑی زبردست فوج لے کے گیا۔ مگر مارا گیا۔ اور دلّی کا کام جو چھڑا تھا ناتمام پڑا رہ گیا۔

احمد خان بنگش اُس زمانے کا بہادر ترین شخص تھا۔ اُسکے مقابلے کے لیے برہان الملک کی ضرورت تھی۔ صفدر جنگ اُسکے حریف مقابل نہ ہو سکتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ احمد خان کی اور اُنکے ساتھ افاغنہ کی قوت ترقی کرتی گئی۔ صفدر جنگ نے لاکھ ہاتھ پاؤں مارے۔ خود شہنشاہ دہلی تک کو اُسکے مقابلے پر لا کے کھڑا کر دیا۔ مگر اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ اور اُسکے اشارے سے حافظ رحمت خان نے اودھ کے شہروں اور قصبوں میں لوٹ مار شروع کر دی۔ خیرآباد پر قبضہ کر لیا۔ اور خود احمد خان بنگش کا بیٹا محمود خان فوج لے کے چلا کہ لکھنؤ پر قبضہ کر لے۔ ۱۱۶۳ محمدی (۱۷۵۰ء) میں پٹھانوں نے ملیح آباد میں اپنا تھانہ قائم کیا۔ اور ۱۱۶۴ محمدی (۱۷۵۱ء) میں محمود خان کا کوئی عزیز بیس ہزار فوج لے کے لکھنؤ کی طرف چلا۔ شہر کے باہر پڑاؤ ڈالا۔ اور اپنا ایک کوتوال مقرر کر کے شہر میں بھیجا۔ صفدر جنگ کے آدمیوں سے شہر خالی تھا جو چند تھے بھی پٹھانوں کے آنے کی خبر سن کے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اور پٹھانوں کے کوتوال نے شہر میں آ کے بے اعتدالیاں شروع کر دیں۔

ان دنوں شیخزادگان لکھنؤ میں سب سے زیادہ سربرآوردہ شیخ معزالدین تھے وہ افاغنہ کے سردار سے شہر کے باہر جا کے ملے۔ اُسی وقت کسی نے اُس سے جا کے شکایت کی کہ شہر والے آپ کے کوتوال کی تحقیر و توہین کرتے ہیں۔ اور کوئی اُس کا حکم نہیں مانتا۔ شیخ معزالدین بولے "کیا مجال ہے کہ کوئی ایسی گستاخی کرے۔ میں جاتا ہوں مفسدوں کو سزا دوں گا"۔ یہ کہہ کے واپس آئے اور تمام بھائی بندوں کو بلا کے کہا "پٹھانوں کے قول و فعل کا اعتبار نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ہم نواب صفدر جنگ کا ساتھ دیں۔ اور مقابلہ کر کے پٹھانوں کو یہاں سے نکال دیں"۔ اسکے بعد شیخ معزالدین نے گھر کا زیور بیچ کے فوج جمع کی اور سارے شیخزادوں کو لے کے کوتوال پر حملہ کیا۔ وہ اپنی جان لے کے بھاگا۔ اور شیخ صاحب نے کسی مغل کو درباری لباس پہنا کے اپنے مکان میں بٹھا دیا۔ اور منادی کرا دی کہ صفدر جنگ نے اپنی طرف سے اس مغل کو کوتوال بنا کے بھیجا ہے۔ اسکے ساتھ ہی

علی [illegible] کا ایک سبز جھنڈا کھڑا کیا اور لوگ اُس کے نیچے آآ کے جمع ہونے لگے۔
یہ حالات سُن کے پٹھانوں نے حملہ کر دیا۔ شہزادوں نے جان توڑ کے مقابلہ کیا۔ اور اپنی پرانی شجاعت دکھا دی۔ پٹھان مقابلے کی تاب نہ لا سکے۔ پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بھاگے۔ اور موقع پا کے شہزادوں نے پٹھانوں کو سارے ملک اودھ سے نکال باہر کیا۔

دو سال بعد جب احمد خان بنگش سے صلح ہو گئی تو ۱۱۶۵ھ محمدی (۱۷۵۲ء) میں نواب صفدر جنگ پھر لکھنؤ میں آئے اور مہدی گھاٹ پر آ کے ٹھہرے۔ ایک خاص مکان اپنے رہنے کے لیے بنوایا اور بیجا۔ اور سپاہ کی درستی میں مصروف ہوے لیکن اسکی مہلت نہ ملی۔ اسی سال سلطان پور کے قریب پاپڑ گھاٹ میں پڑاؤ تھا۔ انتقال کیا۔ لاش پہلے فیض آباد کی گلاب باڑی میں لے جا کے زمین کے سپرد کی گئی۔ پھر تھوڑے دنوں کے بعد ہڈیان دہلی میں لیجا کے دفن کی گئین جن پر نہایت ہی عالیشان مقبرہ موجود ہے۔ اور سیاحان ارض اُسے آج تک عبرت و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہین۔

(۴)

صفدر جنگ منصور علی خان کے انتقال کے بعد ۱۱۶۷ھ محمدی (۱۷۵۴ء) مین اُنکے بیٹے نواب شجاع الدولہ مسند نشین ہوے۔ جن کے کچھ حالات اس مضمون کے پہلے حصے مین بیان ہو چکے ہین۔ وہ ایک مضطرب اور بیقرار طبیعت کے اُولوالعزم فرمان روا تھے۔ لیکن بدقسمتی سے اُن کا عہد بڑے بڑے فتنون اور یادگار زمانہ انقلابون سے بھرا ہوا تھا۔ دنیا کی دو زبردست تاریخی قومون اور قوتون کی قسمت کا فیصلہ اُنھین کی آنکھون کے سامنے ہوا۔ پہلے پانی پت کی محشر انگیز لڑائی ہوئی۔ جس مین احمد شاہ درانی۔ شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ خوانین روہیلکھنڈ کی تمام زبردست فوجین ایک طرف تھین اور مرہٹون کا ٹیری دل دوسری طرف۔ اس لڑائی نے ۱۱۷۴ھ محمدی (۱۷۶۱ء) مین ایک ہی دن کے اندر فیصلہ کر دیا کہ ہندوستان چاہے مسلمانون کا رہے یا نہ رہے مگر مرہٹون کا نہین ہو سکتا۔ اسکے بعد بکسر کا قیامت خیز میدان گرم ہوا جس مین انگریزون کی باقاعدہ فوج ایک طرف تھی اور شجاع الدولہ کا لشکر کثیر ایک طرف۔ اس لڑائی نے جنگ پانی پت کے چار سال بعد ۱۱۷۸ھ محمدی

(۱۷۶۴ء) میں چوبیس گھنٹے کے اندر اس بات کا تصفیہ کر دیا کہ ہندوستان اب مسلمانوں کا نہیں انگریزوں کا ہے۔

ان لڑائیوں سے پہلے شجاع الدولہ اگرچہ لکھنؤ ہی میں رہتے مگر بڑی بڑی پولیٹکل مشغولیتوں۔ اور فوجی اصلاحوں سے اُنھیں اتنی مہلت ہی نہ ملی کہ شہر کی ترقی و آرایش کی طرف توجہ کریں۔ اُنھوں نے قلعے بنوائے۔ گڑھیاں قائم کیں۔ فوجی سامان اور آلات جنگ کو فراہم کیا۔ مگر فرصت نہ ملی کہ اپنے گھر کو درست اور اپنے شہر کو آراستہ کریں۔ بکسر کی لڑائی کے بعد جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں وہ فیض آباد میں جا کے اقامت گزین ہو گئے۔ اس لیے لکھنؤ اُنکی برکتوں سے محروم رہ گیا۔ ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۵ء) میں اُنھوں نے سفر آخرت کیا اور نواب آصف الدولہ اُنکے جانشین ہوئے۔

آصف الدولہ نے مسند حکومت پر قدم رکھتے ہی ان سے نا راض ہو کے لکھنؤ کی راہ لی۔ اور یہی وہ زمانہ ہے جب سے دربار اودھ کی قوت فرمان روائی گھٹنے اور لکھنؤ کی ظاہری رونق بڑھنے لگی۔ بکسر کا میدان جیتنے کے بعد انگریزوں نے دربار اودھ میں دخل دہی کے بہت سے حقوق حاصل کر لیے تھے۔ جن کی بنا پر یہاں فوجی ترقیوں کی روک ٹوک کی جاتی اور ہمیشہ غائر نظر سے اس بات کی نگرانی کی جاتی کہ حکومت اودھ کو پھر ایسی قوت نہ حاصل ہونے پائے کہ اُسکی فوجیں دوبارہ انگریزی لشکر کے سامنے صف آرا ہو سکیں۔ تاہم شجاع الدولہ جب تک فیض آباد میں زندہ رہے فوجی اصلاح ہی میں مصروف رہے۔ اور رات دن اسی بات کی دُھن تھی کہ جس طرح بنے اپنی قوت کو بڑھائیں۔ چنانچہ منشی فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں اسی زمانے کا چشم دید حال بیان کرتے ہیں کہ "جلدی بھرنے اور فیر کرنے کے اعتبار سے شجاع الدولہ کی فوج کی بندوقوں نے مقابلے میں انگریزی فوج کی بندوقیں کوئی وقعت نہ رکھتی تھیں"۔

لیکن آصف الدولہ کا عہد شروع ہوتے ہی یہ سب باتیں تشریف لے گئیں۔ انگریزوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ اپنے دخل دہی کے حقوق کو بڑھانا شروع کیا۔ اور نہایت ہی دانائی سے آصف الدولہ کو اس بات پہ آمادہ کر دیا کہ فوجی اصلاح

کی طرف سے بے پروا ہو کے دوسرے مشاغل میں جی بہلائیں۔ آصف الدولہ کو خود بھی فوج کا زیادہ شوق نہ تھا۔ انھیں لٹانے اور مزے اُڑانے کے لیے روپئے کی ضرورت تھی جو بغیر فوج کے موقوف کیے پوری نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے اُنھون نے تھوڑی سی فوج رکھ لی۔ باقی سب کو معزول کر دیا۔ اور عیش و عشرت مین مصروف ہو گئے۔ وہ اپنے مغربی دوستون کے اطاعت کیش دوست تھے۔ جو اُنکے اشارون پہ چلتے اور اُنکے مشورون کے آگے کسی کی نہ سُنتے۔

اس خلوص عقیدت کے صلے مین انگریزون نے روہیلکھنڈ پر اُن کا قبضہ کرا دیا اپنی ماں بہو بیگم صاحبہ کے ستانے اور لُوٹنے کے لیے جب اُنھون نے انگریزون سے مدد مانگی تو نہایت فیاضی کے ساتھ اُنھین اخلاقی مدد دی گئی۔ اور اُنکی طرفداری کی گئی۔ لیکن اسپر بھی اُنکے زمانے تک اُنھین یا لکھنؤ کی رعایا کو بہت ہی کم محسوس ہو سکا کہ ہمارے نظم و نسق مین کسی بیرونی قوت کو دخل ہے جس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ آصف الدولہ کی عام فیاضی اور عیش پرستی نے ساری رعایا کو بھی عیش پرست و عشرت طلب بنا دیا تھا۔ اور کسی کو موجودہ راحت و آرام کے آگے انجام پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوتی تھی۔

اس عیش پرستی کا نتیجہ یہ تھا کہ ظاہری صورت مین اُن دنون لکھنؤ کے دربار مین ایسی شان و شوکت پیدا ہو گئی جو کہین اور کسی دربار مین نہ تھی۔ اور ایسا سامان عیش جمع ہو گیا تھا جو کسی جگہ نہ نظر آتا۔ اُن دنون شہر لکھنؤ ایسی رونق پر تھا کہ ہندوستان تو کیا ساری دنیا کا کوئی شہر لکھنؤ کے اوج و عروج کا مقابلہ نہ کر سکتا ہوگا شجاع الدولہ جو روپیہ فوج اور جنگی تیاریون مین صرف کرتے تھے اُسے آصف الدولہ نے اپنی عیش طلبی کے ذوق اور شہر کی آرائش و خوشحالی مین صرف کرنا شروع کر دیا اور چند ہی روز مین ساری دنیا کی دھوم دھام اپنے یہان جمع کر لی۔ اُن کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا کہ نظام حیدرآباد و دیوان یا ٹیپو سلطان کسی دربار کا کر و فر اور کسی کی شوکت و حشمت ہمارے دربار سے زیادہ نہ ہو سکے۔

اپنے بیٹے وزیر علی خان کی شادی مین اُنھون نے ایسا حوصلہ دکھایا کہ برات کا تزک و احتشام تاریخ ہند کے تمام تکلفات سے بڑھ گیا۔ برات کے جلوس مین

بارہ سو ہاتھی تھے۔ وہ لبادہ جو شاہی خلعت پہنے تھا اُس میں بیس لاکھ کے جواہرات ٹنکے ہوئے تھے۔ محفل طرب کے لیے دو عظیم الشان اور پرتکلف خیمے بنوائے گئے جن میں ہر ایک ۶۰ فٹ چوڑا ۱۲۰ فٹ لمبا اور ۶۰ فٹ لمبا تھا۔ اور ایسا عمدہ نفیس و قیمتی کپڑا لگایا گیا تھا کہ اُن دونوں کی تیاری میں سلطنت کے دس لاکھ روپے صرف ہو گئے۔

اُنھوں نے دریا کنارے مچھی بھون کے مغرب طرف دولت خانہ۔ رومی دروازہ۔ اور اپنا یادگار روزگار امام باڑہ تعمیر کرایا۔ سنہ ۱۲۰۰ ہجری (۱۷۸۴ء) میں اودھ میں قحط پڑ گیا تھا۔ اور شرفائے شہر تک فاقہ کشی میں مبتلا تھے۔ اس نازک موقع پر رعایا کی دستگیری کے لیے امام باڑے کی عمارت چھیڑ دی گئی۔ چونکہ شریف لوگ دن کو مزدوری کرنے میں اپنی بے عزتی خیال کرتے تھے اس لیے تعمیر کا کام دن کی طرح رات کو بھی جاری رہتا۔ اور غریب و فاقہ کش شرفائے شہر رات کے اندھیرے میں آ کے مزدوروں میں شریک ہو جاتے اور مشعلوں کی روشنی میں کام کرتے۔ اس عمارت کو نواب نے جیسے خلوص عقیدت اور جوش دینداری سے بنوایا تھا ویسے ہی خالص اور سچے دلی جوش سے لوگوں نے تعمیر بھی کیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایسی نفیس اور شاندار عمارت بن کے تیار ہو گئی جو اپنی نوعیت میں بے مثل اور نادر روزگار ہے۔ اُس کا نقشہ بنانے کے لیے بڑے بڑے مشہور مہندس اور معمار بلائے گئے۔ اور سب نے کوشش کی کہ ہمارا نقشہ دوسروں کے مجوزہ نقشے سے بڑھ جائے۔ مگر کفایت اللہ نام ایک بے مثل زمانہ معمار کا نقشہ پسند کیا گیا۔ اور اُسی کے مطابق عمارت بننا شروع ہو گئی۔ جو ۱۶۲ فٹ لمبی ۵۳ فٹ چوڑی ہے۔ اینٹ اور نہایت اعلیٰ درجے کے چونے سے یہ عمارت بنائی گئی۔ جس میں فرش سے چھت تک لکڑی کا نام نہیں ہے۔ اس عمارت کو شاہان مغلیہ کی سنگین عمارتوں سے کسی قسم کا تعلق نہیں ہے۔ لکھنؤ میں اس کثرت سے سنگ مرمر دستیاب نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن امام باڑے اور آصف الدولہ کی دوسری عمارتوں کو دیکھیے تو ایک نئی خوشنمائی اور نرالی عظمت و شان رکھتی ہیں۔ امام باڑے کے دالان کی چھت جو کڑا دے کے بنائی گئی ہے اتنی بڑی ہے کہ اتنی بڑی ڈاٹ کی چھت ساری دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ بھی دنیا کی اعجوبہ روزگار یادگاروں

مین شمار کی جاتی ہے -

آصف الدولہ کی عمارتون پر یورپ کی عمارتون کا ذرا بھی اثر نہ تھا - وہ اپنی وضعیت مین خالص ایشیائی ہین جن مین نمایشی نہین اصلی حقیقی شان و شوکت پائی جاتی ہے -
نواب آصف الدولہ کے بعد یہ عمارتین کس مپرسی مین پڑی رہین - غدر کے بعد انگریزون نے اُن پر قبضہ کرکے گرد و پیش کے مکانون کو منہدم کر دیا - اور سوا اُس جانب کے جدھر دریا ہے باقی تینون طرف میدان کرکے امام باڑے کو قلعہ اور رومی دروازے کو اُس کا پھاٹک بنا لیا - اُس زمانے مین اس امام باڑے مین گورے رہتے تھے - اسکے بڑے ہال مین سلح خانہ تھا - اور اُسکے فرش پر بڑی بڑی توپین دوڑتی پھرتی تھین - مگر نہ کبھی زمین کھُدی نہ در و دیوار کی کوئی چیپ اُکھڑی - اب سرکار انگریزی نے امام باڑے کو چھوڑ کے پھر مسلمانون کے حوالے کر دیا ہے - اسکی مسجد مین ایک مجتہد صاحب نماز پڑھاتے ہین اور امام باڑے مین تعزیہ داری ہوتی ہے -

نواب آصف الدولہ کی عمارتون کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُنھین تعمیر ہوے اگرچہ سوا سو برس سے زیادہ کی مدت گذر گئی مگر آج تک اُسی عظمت و شکوہ اور اُسی مضبوطی و پائداری سے اپنی جگہ پر قائم ہین - نہ کوئی اینٹ اپنے مقام سے ہٹتی ہے اور نہ کسی جگہ چونے نے اینٹون کو چھوڑا ہے - برخلاف اُن کے دیگر شاہانِ اودھ نے کرورون روپیہ صرف کرکے جو عمارتین بعد کو بنوائین وہ قومی و ملکی وضعداری کے مفقود ہو جانے کے علاوہ نہایت کمزور ہین - اور اگر وقتاً فوقتاً مرمت نہ ہوتی رہتی تو آج تک کب کی منہدم ہو چکی ہوتین -

آصف الدولہ امام باڑے اور مچھی بھون کے متصل اپنے محل "دولت خانے" مین رہتے تھے - شہر کے باہر اور دریا پار ہجوم خلائق سے دُور اور دنیوی جھگڑون سے الگ رہ کے مصروف عیش ہونے کے لیے بیباپور کا محل بنوایا - اکثر جب وہ سیر شکار کے لیے جاتے تو اسی مکان مین قیام کرتے - اسی طرح چنہٹ مین ایک پُر فضا و نزہت بخش مکان - اور چار باغ اور عیش باغ مین کوٹھیان بنوائین - اور اسی زمانے مین یحییٰ گنج مین اور اُسکے متصل اصطبل بنے - پھر محلہ وزیر گنج قائم ہوا جو آصف الدولہ کے بیٹے وزیر علی خان کی قیام گاہ ہونے کے باعث اُنھین کی طرف منسوب اور

انھیں کی یادگار ہے۔

اب لکھنؤ میں حاکم اور فرمان روا کے مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جانے کی وجہ سے عام خلقت کا رخ لکھنؤ کی طرف پھر گیا۔ جو لوگ شجاع الدولہ کے زمانے میں فیض آباد میں بس گئے تھے انھوں نے فیض آباد کو چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ میں آ کے بسنا شروع کیا۔ دوسری طرف دہلی کے لوگ اپنے وطن کو خیرباد کہہ کے سیدھے لکھنؤ میں آتے تھے اور پھر واپس جانا نصیب ہوتا تھا۔ خلقت کے اس ہجوم نے نئے محلے آباد کرنا شروع کر دیے۔ اس لیے کہ باہر کے آنے والوں میں سے جسے جہاں جگہ مل جاتی آباد ہو جاتا۔ اور سیکڑوں نئے محلے آباد ہوتے چلے جاتے۔

چنانچہ آمانی گنج۔ فتح گنج۔ رکاب گنج۔ تنگاس۔ دولت گنج۔ بیگم گنج۔ نواب گنج۔ ماشا خان کا احاطہ (جسے نواب آصف الدولہ کے ایک خانگی داروغہ نے آباد کیا۔ اور افتتاح کی تقریب میں خود انھیں بلایا) ٹکیت گنج۔ ٹکیت رائے کا بازار (جو وزیر اعظم مہاراجہ ٹکیت رائے کی جانب منسوب ہیں) ترمنی گنج۔ ٹکڑی یا اُتلی جسیم الدین خان کی چھاؤنی۔ حسن گنج۔ باؤلی۔ بھوانی گنج۔ بالسا گنج۔ کشمیری محلہ۔ سورت سنگھ کا احاطہ۔ نواز گنج۔ تحسین گنج۔ فدا گنج۔ نگریا (جس کی نواب آصف الدولہ کی ماں بہو بیگم صاحبہ نے اسی دن بنیاد ڈالی جس دن دریا پار خود انھوں نے علی گنج کی بنیاد رکھی تھی) عنبر گنج۔ محبوب گنج۔ توپ دروازہ۔ خیالی گنج۔ جھاؤ لال کا پل (ان دونوں محلوں کے بانی راجہ جھاؤ لال سلطنت اودھ کے وزیر خزانہ تھے) یہ سب وہ محلے ہیں جو عہد آصفی میں بسے اور تعمیر ہوئے۔ اور انھیں دنوں دریا کے پار حسن رضا خان نے حسن گنج بسایا۔

نواب آصف الدولہ کی فیاضیوں کی خاص و عام میں شہرت تھی۔ اور دور دور کے شہروں میں ان کی داد و دہش کا تذکرہ ہو رہا تھا۔ لوگ اٹھتے بیٹھتے عزت و محبت کے ساتھ ان کا نام لیتے۔ اور ان کے تمام ذاتی عیوب فیاضی کے دامن میں چھپ کے نظروں سے غائب ہو گئے تھے۔ اور عوام کو نواب کی صورت میں ایک عیش پرست فرمان روا نہیں بلکہ ایک بے نفس اور درویش صفت ولی نظر آتا۔ ہندو دکاندار آج تک صبح کو آنکھ کھلتے ہی جوش عقیدت سے کہتے ہیں "یا آصف الدولہ ولی!"

اُسی زمانے مین جنرل کلاڈ مارٹن نام ایک بہت بڑا دولتمند فرانسیسی تاجر لکھنؤ مین آکے رہ پڑا تھا۔ اُس نے ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی کا نقشہ بنا کے نواب آصف الدولہ کے ملاحظے مین پیش کیا۔ نواب نے اُسے اس قدر پسند کیا کہ اسکی قیمت مین دس لاکھ اشرفیان دینے کو تیار ہوگئے۔ بیع کا معاہدہ تکمیل کو نہین پہونچنے پایا تھا کہ نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور عمارت ہنوز تکمیل کو نہین پہونچی تھی کہ خود مسیو مارٹن دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اُنھون نے چونکہ دولت بے پایان چھوڑی تھی اور وارث کوئی نہ تھا اس لیے مرتے وقت وصیت کر دی کہ میری لاش اسی کوٹھی کے اندر دفن کی جائے تاکہ میرے بعد اُسے حکمرانان اودھ ضبط نہ کر سکین۔ اس عمارت کا نام اُنھون نے کانسٹین شیا (قسطنطنیہ) قرار دیا تھا۔ مگر عوام مین وہ آج کل "مارٹین صاحب کی کوٹھی" مشہور ہے۔ اور دیکھنے کے قابل ہے۔ مرنے کے بعد وہ اسی کوٹھی مین دفن ہوے۔ وہ مدرسہ آج تک جاری ہے جس سے بہت سے طلبہ کو کھانا اور کپڑا ملتا ہے۔ مگر سنتے ہین کہ مارٹن صاحب نے اس اسکول اور اسکے وظائف کو کسی مذہب اور قوم کے ساتھ مخصوص نہین کیا تھا۔ بلکہ وصیت کی تھی کہ عیسائی۔ ہندو مسلمان سب ہی یکسان طور پر اس سے فیض یاب ہو سکتے ہین لیکن اب یہ مدرسہ صرف یورو پین بچون کے لیے مخصوص ہے۔ کسی ہندوستانی کو وظیفہ ملنا درکنار اُس کی تعلیم مین بھی شریک نہین کیا جاتا۔ شاید یہ اس وجہ سے ہو کہ غدر کے زمانے مین جاہل و پُرجوش بلوائیون نے قبر کھود کے مسٹر مارٹن کی ہڈیان نکال لین اور اُنھین ادھر اُدھر پھینک دیا۔ انگریزون کے بعد تسلط اتفاقاً ایک ہڈی مل گئی جو پھر اُسی خاک مین دبا دی گئی۔ لیکن اُن بلوائیون کے فعل کے ذمہ دار عام ہندوستانی نہین ہو سکتے۔

سنہ ۱۲۱۲ ہجری (سنہ ۱۷۹۷ء) مین نواب آصف الدولہ نے سفر آخرت کیا۔ اور اُنکی جگہ نواب وزیر علی خان مسند نشین ہوے۔ جن کی شادی کی دھوم دھام کا حال ہم بتا چکے ہین۔ مگر چار ہی مہینے مین اُن سے ایسے بیہودہ اور قابل نفرت حرکات ظاہر ہوے کہ اکثر لوگ اُن سے ناراض تھے۔ خود بہو بیگم صاحبہ اُنکے مقابل اپنے سوتیلے بیٹے یمین الدولہ نواب سعادت علی خان کو زیادہ پسند کرتی تھین۔ ادھر اس خبر

کی شہرت ہوئی کہ وزیر علی خان آصف الدولہ کے بیٹے ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ آصف الدولہ کی نسبت بہتوں کا خیال تھا کہ پیدائشی عنّین تھے۔

نواب سعادت علی خان آصف الدولہ کی مخالفت کے باعث اُنکے زمانے میں مدتوں قلمرو سے باہر اور دور رہتے تھے۔ مدتوں کلکتے میں رہے اور ایک زمانۂ دراز تک بنارس میں قیام رہا۔ وزیر علی خان کی نسبت یہ خیال قائم ہونے کے بعد قرعۂ انتخاب نواب سعادت علی خان پر پڑا۔ وہ بنارس سے لائے گئے اور بیبیاپور کی کوٹھی میں خود گورنر جنرل بہادر نے دربار فرما کے وزیر علی خان کی معزولی اور نواب سعادت علی خان کی مسند نشینی کا فیصلہ کیا۔ وزیر علی خان فوراً گرفتار کرکے بنارس بھیج دیئے گئے۔ جہاں اُنھوں نے طیش میں آکے مسٹر چیری کو مار ڈالا۔ اور اسکی سزا میں گرفتار کرکے چنار گڑھ بھیجے گئے اور وہیں مرے۔ اُن کی مصیبتوں اور سرگردانیوں کا ایک بڑا بھاری قصہ مشہور ہے۔ جس کا یہ مختصر مضمون متحمل نہیں ہو سکتا۔

(۵)

نواب سعادت علی خان نے ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں تخت پر بیٹھتے ہی آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دیا۔ مشہور ہے کہ وہ سلطنت سے مایوس و نا امید بنارس میں پڑے ہوئے تھے کہ خبر پہنچی نواب آصف الدولہ بہادر نے سفر آخرت کیا اور مسند حکومت پر وزیر علی خان بیٹھ گئے۔ یہ سنتے ہی سلطنت کی رہی سہی اُمیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ اس قطعی یاس کے عالم میں تھے کہ بنارس کے کسی یوروپین حاکم نے آکے پوچھا۔ "نواب صاحب! اگر آپ کو اودھ کی حکومت مل جائے تو انگریزی گورنمنٹ کو کیا دیجیے گا؟" جو چیز ہاتھ سے جا چکی ہو انسان کے دل میں اُسکی قدر ہی کیا ہو سکتی ہے؟ بے اختیار زبان سے نکلا "آدھا ملک انگریزوں کی نذر کر دوں گا"۔ یہ وعدہ سن کے اُس انگریز حاکم نے کہا "تو آپ خوش ہوں۔ اور میں آپ کو خوشخبری سناتا ہوں کہ آپ ہی فرمانروائے لکھنؤ منتخب ہوئے ہیں"۔ سعادت علی خان یہ مژدۂ غیر مترقبہ سن کے خوش تو ضرور ہوئے مگر اپنے وعدے کا خیال آیا تو ایک سناٹے میں آ گئے۔ اور آخر تخت نشینی کے بعد اس وعدے کے ایفا میں اُنھیں اپنی آدھی قلمرو بانٹ دینا پڑی جس کا کانٹا زندگی بھر اُن کے دل میں کھٹکتا رہا۔

انگریزی تاریخون مین اُن سے وعدہ لیے جانے کا تو ذکر نہین ہے مگر اس کو سب تسلیم کرتے ہین کہ نواب سعادت علی خان کو چونکہ انگریزون نے تخت پر بٹھایا تھا اس لیے اُنھون نے اپنا آدھا ملک شکریے کے طور پر انگریزون کی نذر کر دیا۔ ہر تقدیر جو کچھ ہو سعادت علی خان کی تخت نشینی کے وقت اودھ کی حکومت آدھی رہ گئی لکھنؤ کے پُرانے لوگون مین مشہور ہے کہ اسی کو فت مین سعادت علی خان نے نہایت ہی کفایت شعاری سے کام لیے۔ اور تحصیل وصول مین بے انتہا مستعدی و بیدار مغزی ظاہر کر کے بائیس تیئس کروڑ روپیہ جمع کیا۔ اور انگلستان مین برٹش گورنمنٹ سے مراسلت کر کے یہ طے کر لیا تھا کہ ہندوستان کی حکومت کا ٹھیکہ بعوض ایسٹ انڈیا کمپنی کے اُنکو دے دیا جائے۔ اور معاہدے کی تکمیل ہونے ہی کو تھی کہ اُنکے سالے نے کسی سازش مین شریک ہو کے زہر دے دیا۔ اور وہی مثل پوری ہوئی کہ ع

آن قدح بشکست و آن ساقی نماند۔

اور اسی قسم کے بیسیون واقعات مشہور ہین جن کا ثبوت سوا افواہی روایتون کے اور کچھ نہین مل سکتا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ سعادت علی خان اس قدر جُزرس اور منتظم واقع ہوے تھے کہ اُن کے سے حاکم نے قلمرو کا کوئی جزو آسانی سے نہ دیا ہوگا۔ دوسرے اُنکے طرز عمل اور اُنکی پالیسی مین ایک ایسی مفکرانہ ہوشیاری اور پُر اسرار بیقراری نظر آتی ہے کہ چاہے پتہ نہ چلے مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ کوئی بڑا کام کرنے والے تھے۔ اور اُنکے تیور بہت ہی پُر معنی تھے۔

ملک کو بانٹ دینے کی وجہ سے اُنھین سب سے بڑی مشکل یہ پیش آئی کہ سلطنت کی نصف آمدنی گھٹ گئی۔ اور آصف الدولہ مرحوم نے مصارف حد سے زیادہ بڑھا رکھے تھے۔ چنانچہ اُنھین دربار کے مصارف گھٹانا پڑے جو نہایت ہی مشکل چیز تھی اس کوشش مین اُنھون نے حسابات کی جانچ کی۔ ادنیٰ ادنیٰ رقمون پر نظر ڈالی۔ معافیون اور جاگیرون کی نہایت سختی کے ساتھ چھان بین کی۔ دربار کے مصارف مین جہان تک بنا کمی کی۔ غرض جس طرح ہو سکا بدنامیان اُٹھا کے اور لوگون پر سخت بے رحمیان کر کے اُنھون نے سلطنت کی آمدنی بڑھائی اور خرچ گھٹایا۔

یہ کارروائیان دیکھ کے ذی ہوش اور منصف مزاج لوگ تو سعادت علی خان

کی لیاقت اور خوش تدبیری کے قائل ہوگئے۔ مگر عوام مین بے اطمینانی پھیلی۔ ایک
طرف اُن معافی دارون اور جاگیردارون کا گروہ شاکی تھا جن کی جائدادین ضبط
ہوئی تھین۔ دوسری طرف وہ فضول اور از کار رفتہ ملازمین روتے پھرتے تھے
جن کی تنخواہین تخفیف مین آگئی تھین۔ اسی قدر نہین۔ ملک مین ایک بڑا بھاری گروہ
اُن لوگون کا بھی تھا جو وزیر علی خان کے طرفدار تھے۔ اُن کو جائز اور سچا حقدار سلطنت
خیال کرکے سعادت علی خان کو غاصب بتاتے تھے۔ غرض ملک مین ہزارون دشمن
تھے جن سے خطرہ تھا کہ نواب کی جان پر حملہ نہ کر بیٹھین۔ رعایا کے علاوہ فوج بھی
نئے نواب سے نہایت ہی ناراض تھی۔ بیشمار فوج کا ٹیڑی دَل جو نواب شجاع الدولہ
کے عہد مین جمع تھا اُس مین آصف الدولہ ہی کے زمانے سے سرکار انگریز بہادر کے
مشورے سے تخفیف شروع ہوگئی تھی۔ مگر آصف الدولہ کی فیاضیون اور فضول
خرچیون نے بہلائے رکھا۔ اور شکایت کی آواز زیادہ نہین بلند ہونے پائی۔ سعادت
علی خان نے جب زیادہ تخفیف کی اور اُسکے ساتھ جزرسی بھی اختیار کی تو ہر طرف
ہائے ہائے پڑگئی۔ اور جو تھا اُس کی جان کو رو رہا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی جان کی حفاظت کے لیے سرکار انگریزی کو ضرورت معلوم ہوئی
کہ انگریزی باضابطہ فوجی گارڈ خاص شہر کے اندر رکھا جائے۔ کیونکہ شہر کے مفسدین
اور سرکشون کی سرکوبی کے لیے اور نیز امن و امان قائم رکھنے کی غرض سے ایک بیرونی
زبردست قوت کا ہر وقت شہر مین موجود رہنا بہت ہی ضروری تھا۔ جسکی نسبت
سُنا جاتا ہے کہ نواب سعادت علی خان نے اسکو نہایت ہی ناگواری کے ساتھ منظور کیا۔

فرمانروایان اودھ نے اس سے پیشتر اپنے رہنے سہنے کے متعلق نہایت ہی سادگی
ظاہر کی تھی۔ پہلے تین حکمرانون یعنی نواب برہان الملک نواب صفدر جنگ اور
نواب شجاع الدولہ نے جن سادے مکانون مین زندگی بسر کی وہ بھی اُنکی ذاتی ملکیت
نہین بلکہ کرایے پر تھے۔ اُنھون نے اپنا اصلی مکان یا تو میدان جنگ کو خیال کیا یا
ساری مملکت کو جس مین دَورہ کرتے رہتے اور ساری مملوکہ زمین کے ہر حصے کو اپنا
مسکن و مکان تصور کرتے۔ نواب آصف الدولہ اگرچہ نہایت ہی مسرف تھے عیاشی
و فضول خرچی مین بدنام تھے مگر اُنکے لیے بھی صرف ایک سادہ پرانی وضع کا مکان

یعنی پنچ محلا کافی تھا - حالانکہ اُنھیں عمارت کا بڑا شوق تھا - اس سے زیادہ کیا ہو گا کہ بیس لاکھ روپے ایک امام باڑے اور مسجد کی تعمیر مین صرف کر دیے - اور اس سے زیادہ ہی رقم چوک - مختلف بازارون - منڈیون - گنجون - اور سراؤن وغیرہ کی تعمیر مین خرچ کی - غرض پہلے تین فرمان رواؤن کا شوق تعمیر اگر قلعون گڑھیون کی تعمیر اور فوجی سامان کے فراہم کرنے مین پورا ہوتا تھا تو آصف الدولہ کا شوق دینداری کی عمارتون یا نفع رسانی خلق اللہ کے کامون مین - اسکے ساتھ عمارت کا قدیم مذاق بھی اب تک نبھتا چلا جاتا تھا - آصف الدولہ کے امام باڑے تک کی قدیم مذاق تعمیر کا مکمل ترین نمونہ ہین - دہلی و آگرے مین شاہجہان بادشاہ کو اعلیٰ درجے کا سنگ رخام اور سنگ سرخ قریب کی کانون مین مل گیا تھا جس نے وہان کی عمارتون مین خاص قسم کی نفاست اور اعلیٰ درجے کی شان پیدا کرا دی لکھنؤ مین پتھر کا ملنا غیر ممکن تھا - اور آگرے اور جے پور سے لانا اس قدر دشوار تھا کہ کسی کو منگوانے کی جرأت نہ ہوسکتی تھی - آصف الدولہ نے اینٹ اور چونے سے وہی کام لیا اور ویسی ہی شانداری دکھا دی -

نواب سعادت علی خان کو باوجود کفایت شعاری - جُزرسی - اور روپیہ جمع کرنے کی ہوس کے مکانون اور عمارتون کا شوق تھا - مگر افسوس اُن کا یہ شوق کلکتے وغیرہ مین رہنے اور مختلف مقامات کی عمارتون کے دیکھنے کی وجہ سے ایسا غارت ہوگیا تھا کہ اُن کے عہد کی عمارتون سے وہ پُرانی خصوصیتین جدا ہوگئین - اور اُس وقت سے گویا عمارت کا مذاق ہی بدل گیا -

لکھنؤ مین اس انقلاب تعمیر کا اصلی باعث کچھ تو تخت نشینی سے پہلے نواب سعادت علی خان کی غریب الوطنی - خانہ بدوشی اور اقوام یورپ سے ملنا جلنا تھا اور زیادہ تر یہ چیز تھی کہ جنرل مارٹن نے اپنے مذاق کی دو ایک کوٹھیان یہان بنوا کے ایک نئی وضع عمارت فرمان رواؤن کے سامنے پیش کر دی جو بلحاظ مضبوطی کے ناقص اور باعتبار ضروریات زندگی کے نہایت ہی دلفریب تھی - جن عمارتون کی حالت بالکل اُن کھلونون کی سی تھی جو بچون کے ہاتھ مین دے دیے جاتے ہین - اور روز ٹوٹتے اور نئے خریدے جاتے ہین - ناقدین یورپ تنقید کرتے وقت بڑے زور شور سے

اعتراض کرتے ہیں کہ آصف الدولہ کے بعد والے فرمان روایان لکھنؤ کا مذاق عمارت بالکل بگڑ گیا تھا۔ اور اُنکی تمام عمارتیں لڑکوں کے کھلونے یا لڑکیوں کے گھروندے ہیں مگر ادھر توجہ نہیں کرتے کہ یہ مذاق بگاڑا کس نے؟ کہا جاتا ہے کہ یہاں کا قومی مذاق اس لیے بگڑ گیا کہ یہاں دراصل کوئی قوم ہی نہیں تھی۔ اور اس کا خیال نہیں کیا جاتا کہ یہاں کی قومیت کو کس نے بگاڑا۔ اور کس کی کرشمہ سازیوں نے لوگوں سے اُن کی پُرانی وضع چھُڑا دی۔ سچ یہ ہے کہ ؎ اے بادصبا این ہمہ آوردۂ تست۔

سعادت علی خان نے پہلے کوٹھی فرحت بخش پچاس ہزار روپے پر جنرل مارٹن سے مول لی۔ اُسی میں رہنا شروع کیا اور اُسکے متصل اور کئی مکان بنوائے پھر وہان سے قریب ہی صاحب رزیڈنٹ کی سکونت کے لیے بیڑھی کوٹھی تعمیر کی جس کے کھنڈر رزیڈنسی کے نام سے پڑے ہوئے ہیں۔ اسکے بعد اپنے دربار کے لیے اُنھوں نے لال بارہ دری تعمیر کرائی جس میں اب کتب خانہ ہے۔ اور اُن دنوں قصر السلطان کے نام سے مشہور تھی۔ اسکے علاوہ دیلپارا اُنھوں نے دل آرام نام ایک نئی کوٹھی تعمیر کی۔ اور اسی سلسلے میں ایک بلند ٹیکرے پر جو اب صدر بمبئی لشکرگاہ لکھنؤ کے علاقے میں واقع ہوا ہے اور جہاں سارے شہر گرد کے میدانوں۔ اور دریا کا دلکش منظر نظر کے سامنے ہو جاتا ہے ایک خوبصورت کوٹھی تعمیر کی۔ اور دلکشا اُس کا نام رکھا۔ اسی طرح ایک اور کوٹھی تعمیر کی جس کا نام حیات بخش قرار دیا۔ مگر وہ کوٹھی نواب سعادت علی خان کے بعد کے فرمان روایان اودھ کے استعمال میں نہیں رہی۔ اُس میں غدر سے پہلے میجر بنک رہتے تھے۔ اور غدر کے بعد یہ معمول تھا کہ انگریزی گورنمنٹ کی طرف سے جو صاحب یوروپین اودھ کے چیف کمشنر مقرر ہوکے آتے اُسی کوٹھی میں قیام کرتے۔

مذکورۂ بالا کوٹھیوں کے علاوہ نواب ممدوح نے مشہور عمارتیں منور بخش اور خورشید منزل بھی تعمیر کرائیں۔ اور چوپڑ کا اصطبل بھی اُنھیں کی یادگار ہے۔ مگر ان سب عمارتوں کی تعمیر میں پُرانی وطنی عمارت کی وضع ترک کر دی گئی۔ اور یورپ سے آئی ہوئی نئی جدتیں اختیار کی گئیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس بارے خاص میں لکھنؤ کا کوئی قدیم مکان اُن نئی عالیشان عمارتوں کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا جو خود دولت برطانیہ کے اثر اور اہتمام سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تعمیر ہو چکی ہیں اور روز

بہ روز تعمیر ہوتی جاتی ہیں۔ غرض یہی زمانہ ہے جب سے لکھنؤ میں اُن قدیم مذاق کی عمارتوں کا خاتمہ ہوگیا جو تاریخی وقعت رکھتی ہوں اور کسی خاص خوبی کے لحاظ سے سیاحوں کو اپنی طرف بُلاتی ہوں۔

نواب سعادت علی خان نے لکھنؤ کے مغربی حصے میں ایک بڑا گنج بنوایا۔ اور اُس کی آبادی و رونق کے لیے اس قدر اہتمام کیا کہ اُسکے واسطے خاص قوانین وضع کیے گئے۔ اور تاجروں اور دوکانداروں کو خاص قسم کے حقوق عطا کیے گئے۔ اُس نے بڑی رونق پائی۔ اور آج تک باوجودیکہ شہر کی آبادی سے فاصلے پر اور بالکل الگ واقع ہوا ہے مختلف چیزوں کی سب سے بڑی منڈی ہے۔ اور عالم نگر کا اسٹیشن صرف اُسی کی وجہ سے روز بروز ترقی پاتا جاتا ہے۔

سعادت گنج کے علاوہ دوسرے بڑے بازار جو نواب ممدوح کے عہد میں قائم اور آباد ہوے حسب ذیل ہے۔ رکاب گنج (جو آج لوہے کی سب سے بڑی اور غلے وغیرہ کی ایک ممتاز منڈی ہے) جنگلی گنج۔ مقبول گنج۔ مولوی گنج۔ گولا گنج۔ اور رستوگی محلہ۔ موتی محل میں جو اصلی اور پُرانی عمارت ہے وہ بھی نواب سعادت علی خان ہی کی بنوائی ہوئی ہے۔ یہ عمارت موجودہ احاطۂ موتی محل میں شمال کی طرف واقع ہے۔ اُس میں نہایت ہی نفیس سفید گنبد تھا جس میں کاریگر نے موتی کی سی آب و تاب پیدا کردی تھی۔

سعادت علی خان اودھ کے تمام فرماں رواؤں سے زیادہ بیدار مغز و مدبر اور اُسکے ساتھ نہایت ہی کفایت شعار۔ جُزرس۔ بلکہ بخیل خیال کیے جاتے ہیں۔ ملک کا انتظام اُنھوں نے غیرمعمولی ہوشیاری اور خوبی و شائستگی سے کیا۔ اور اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر اُن کو آخر عہد تک پورا اطمینان نصیب ہوجاتا تو تمام گذشتہ بدنظمیاں اور خرابیاں دُور ہوجاتیں۔ اور وہ ملک کی پوری پوری اصلاح کرلے جاتے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ اُنکے تعلقات اچھے نہیں رہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات اُن کا دل تاج و تخت اور فرمانروائی و جہانبانی سے کھٹا ہوگیا تھا۔ انھیں باتوں سے عاجز آکے اُنھوں نے آدھے سے زیادہ ملک سرکار عظمت مدار برطانیہ کے سپرد کردیا۔ اور سمجھے کہ اب میں اپنے مقبوضہ

علاقے میں بے خرخشہ دیے تردد حکومت کریں گے۔ مگر افسوس کہ اب بھی اُنکو اطمینان اور چین نہ نصیب ہوا۔ جو ملک اُنکے قبضے میں چھوڑا گیا تھا اُس میں بھی جا بجا انگریزی فوج کے کیمپ قائم کیے گئے۔ اور بڑی مقدار خاص لکھنؤ اور اُسکے حوالی میں مقیم ہوئی۔ جس کی سنبھال دشوار تھی۔ اور اُسکی تعداد کے زیادہ ہونے سے سلطنت پر سخت بار پڑ گیا تھا۔ اسکے مقابل انھیں اپنی بہت سی فوج گھٹا دینی پڑی۔

مگر باوجود ان افکار و ترددات کے اُنھوں نے جو جو اصلاحیں کیں بہت کچھ قابل تعریف ہیں۔ مگر سب سے عجیب یہ بات ہے کہ بازاروں کی ترقی اور تجارت کے فروغ کے ساتھ اُنکے دربار میں باکمالوں اور قابل قدر لوگوں کا اتنا بڑا مجمع ہو گیا تھا کہ اُسوقت ہندوستان کے اور کسی دربار میں ایسے صاحبان کمال نہ نظر آ سکتے تھے۔ ایسے لوگ اکثر اُسی جگہ جمع ہوا کرتے ہیں جہاں کے رئیس معمول سے زیادہ فیاضی ظاہر کرتے ہوں سعادت علی خان جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں جزرس اور بخیل تھے۔ مگر اس بخل و کفایت شعاری کے ساتھ یہ صفت تھی کہ اُن کی ذاتی قابلیت دوسرے باکمالوں کی لیاقت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ اور اسی بات نے اُن کے ہاتھوں سے لائق لوگوں کی بڑی بڑی قدریں کرائیں۔ اور لکھنؤ پہلے سے زیادہ اہل کمال کا مرجع بن گیا۔ جو قابل آدمی جہاں ہوتا سعادت علی خان کی قدردانی کی شہرت سنتے ہی اپنے وطن کو خیرآباد کر کے لکھنؤ کا رُخ کرتا اور یہاں آ کے ایسا آرام پاتا کہ پھر کبھی وطن کا نام نہ لیتا۔

سنہ ۱۲۲۹ ہجری (۱۸۱۴ء) میں نواب سعادت علی خان نے سفر آخرت کیا۔ اور اُنکے بیٹے غازی الدین حیدر مسند حکومت پر رونق افروز ہوے۔ قیصر باغ کی مربع عمارت کے اندر نواب سعادت علی خان اور اُن کی بی بی مرشد زادی کے مقبرے ہیں۔ ان دونوں مقبروں کی جگہ ایک مکان تھا جس میں نواب غازی الدین حیدر ایام ولیعہدی میں رہا کرتے تھے۔ باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی جب وہ ایوان شہریاری میں گئے تو کہا "میں نے والد کا گھر لیا ہے تو ضرور ہے کہ اپنا مکان اُنھیں رہنے کو دے دوں"۔ اس خیال کے مطابق مرحوم کو اپنے گھر میں دفن کرایا۔ اور پُرانا مکان منہدم کرا کے یہ مقبرے تعمیر کرا دیئے۔

اب غازی الدین حیدر کے عہد میں نہ باپ کی سی بیدار مغزی اور دولت کی قدر تھی۔ اور نہ اگلے فرمان رواؤں کی سی فوجی سرگرمی۔ ہاں آصف الدولہ کے عہد کی سی آرام طلبی اور عیش پرستی ضرور تھی مگر اس میں بھی یہ فرق آگیا تھا کہ آصف الدولہ کا اسراف بھی ملک وملت کی نفع رسانی کے لیے ہوتا تھا اور اب خالص نفس پروری تھی۔

غازی الدین حیدر کو باپ کا جمع کیا ہوا کروروں روپیہ کا نقد خزانہ مل گیا تھا جو شاہی شوق کے پورا ہونے میں نہایت ہی دریا دلی سے اُڑنے لگا۔ موتی محل میں ہم کہہ آئے ہیں کہ شمالی جانب سعادت علی خان نے ایک کوٹھی تعمیر کرائی تھی۔ غازی الدین حیدر نے اُس احاطے میں دو اور کوٹھیاں تعمیر کرائیں جن کے نام مبارک منزل اور شاہ منزل قرار دیے گئے۔ شاہ منزل کے پاس ہی کشتیوں کا ایک پل تھا۔ اور مبارک منزل اس سے مشرق کی طرف ہٹی ہوئی تھی۔ شاہ منزل کے محاذی دریا پار رمنہ تھا جو ہزاری باغ کے نام سے موسوم تھا اور اُس میں میلوں تک نزہت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا۔ اُس میں اکثر مست ہاتھی۔ گینڈے۔ اور وحشی درندے لڑائے جاتے اور بادشاہ اس پار شاہ منزل کے کوٹھے پر جلوہ فرما ہو کے اُن کی لڑائی کا تماشا ملاحظہ فرماتے۔ شیروں کی لڑائی بھی وہیں ہوتی۔ جس کے لیے بمضبوط کٹہرے اور ایک عمدہ سرکس بنا ہوا تھا۔ مگر جو چھوٹے غیر آزار رساں جانور لڑائے جاتے اُن کی لڑائی خاص شاہ منزل کے احاطے میں اسی پار ہوتی۔

یہ درندوں اور وحشی جانوروں کے لڑانے کا شوق ہندوستان میں یہاں سے پہلے اور کہیں نہیں سُنا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رزیڈنٹوں اور دربار رس اہل یورپ سے رومیوں کے ایمفی تھیٹر کے حالات سُن کے جہان پناہ کے دل میں شوق پیدا ہوا۔ مگر مولانا حبیب الرحمٰن خان صاحب شروانی کے توجہ دلانے سے ہمیں معلوم ہوا کہ درندوں کی لڑائی کا رواج دولت مغلیہ کے عہد سے ہے

غازی الدین حیدر نے اپنی ایک یوروپین بی بی کے لیے ولایتی محل بنوایا۔ اور اُس کا نام ولایتی باغ قرار دیا۔ وہاں سے قریب ہی قدم رسول کی عمارت تیار کرائی غازی الدین حیدر کی آرزو کے موافق دربار انگریزی سے اُنھیں " بادشاہی کا لقب عطا کیا گیا۔ اس سے بیشتر فرمان روایان اودھ وزیر کے رتبے کے سمجھے جاتے

اور سوا نواب کے اور کسی اعزازی لقب سے نہین یاد کیے جاتے تھے۔ اس زمانے تک ہندوستان مین شہنشاہی مغلیہ کی اتنی آن باقی تھی کہ اگرچہ ملک خود مختار و خود سر حکمرانون مین بٹ گیا تھا اور شہنشاہ دہلی کے قبضے مین صرف دہلی کے گرد و پیش کی زمین باقی رہ گئی تھی۔ لیکن اس بے بضاعتی پر بھی شہنشاہ و جہان پناہ وہی تھے۔ نہ سریر آرایان دہلی کے سوا ہندوستان مین کسی کو "بادشاہ" کہلانے کا حق تھا اور نہ خطاب و عزت دینے کا۔ اُنکے اس غرور کے توڑنے کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی نے غازی الدین حیدر کو جنھون نے باپ کے اندوختہ مین سے بہت سا روپیہ انگریزون کو قرض دے دیا تھا۔ شاہی کا خطاب دیا۔ اور دربار اودھ نے اس عزت و سرفرازی کو نہایت ہی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ چنانچہ اُسوقت سے حکمرانان اودھ جو رزیڈنٹون کے ہاتھون کے کھلونے تھے بادشاہ بن گئے۔ اور آخری فرمان روا واجد علی شاہ کے مرنے تک اُنکا سرمایۂ ناز رہے۔

غازی الدین حیدر نے اسی خطاب شاہی کی یادگار مین دریا پار مچھی بھون کے سامنے ایک نیا بازار بسایا اور اُس کا نام بادشاہ گنج رکھا۔ اسی زمانے مین حکیم مہدی نے مہدی گنج آباد کیا۔ اور نائب السلطنت آغا میر کی شاہانہ عمارت کے دُور تک پھیل جانے کی وجہ سے عین وسط شہر مین محلۂ آغا میر کی ڈیوڑھی قائم ہوا۔ اور اسی عہد مین آغا میر کی سرائے تعمیر ہوئی۔

بادشاہ کو اور اُن سے زیادہ بادشاہ بیگم کو مذہبی معاملات مین بہت زیادہ انہماک تھا۔ صفویہ خاندان کے زمانے سے ایران کا مذہب شیعہ اثنا عشری تھا۔ مگر ہندوستان کے عام مسلمان سُنّی تھے۔ نواب برہان الملک چونکہ ولایت سے آئے تھے اس لیے اُن کا اور اُنکے سارے خاندان کا مذہب شیعہ تھا۔ باوجود اسکے زمانے تک لکھنؤ مین حکومت کا وہی قدیم طریقہ چلا آتا تھا جو آغاز سلطنت اسلام سے دیگر بلاد ہند اور سارے ملک کا تھا۔ مگر اسوقت سے بادشاہ اور اُنکے خاص محل کے انہماک مذہبی کی وجہ سے شیعیت حکومت لکھنؤ کا ایک نمایان عنصر بن گئی۔ فرنگی محل کے علما کی طرف سے حکمرانون کی توجہ ہٹ گئی اور خاندان اجتہاد عروج پا کے سلطنت کا اصلی مقتدی قرار پایا۔

لیکن شیعہ مذہب اپنی اصلی حالت پر قائم رہتا تو چنداں مضائقہ نہ تھا۔ خرابی یہ ہوئی کہ بادشاہ بیگم کی جاہلانہ اور امیرانہ مذہبی سرگرمی نے مذہب شیعہ مین نئی نئی بدعتین ایجاد کین۔ جن کی وجہ سے اسی قدر نہین ہوا کہ بادشاہون اور امیرون مین طرح طرح کی طفلانہ مزاجیان پیدا ہوئین بلکہ لکھنؤ کی شیعیت ساری دنیا کی شیعیت سے نئی۔ نرالی۔ اور عجیب ہوگئی۔

سب سے پہلے بیگم صاحبہ نے امام صاحب العصر کی چھٹی کی رسم قرار دی جس مین اگر یہ ہوتا کہ کسی محفل مین امام ممدوح کے حالات بیان کرکے ثواب حاصل کرلیا جائے تو مضائقہ نہ تھا۔ مگر نہین۔ یہان ہندوؤن کے جنم اشٹمی کے رسوم کے موافق پورا زچا خانہ مرتب کیا جاتا۔ اسکے بعد یہ ترقی ہوئی کہ صحیح النسب سیّدون کی خوبصورت لڑکیاں لے کے ائمۂ اثنا عشر کی بیبیان قرار دی گئین جن کا نام "اچھوتیان" رکھا گیا۔ اور جب وہ امامون کی بیبیان تھین تو پھر اُن کے وہان امامون کی ولادت بھی ہوتی۔ اور بارہون امامون کی ولادت کی تقریبین بڑے کروفر کے ساتھ منائی جانے لگین۔

غازی الدین حیدر نہایت ہی غضبناک اور آشفتہ مزاج بادشاہ تھے۔ اور رعب وداب اس بلا کا تھا کہ اُن کے زمانے مین انگریزون سے تعلقات تو اچھے رہے مگر آغا میر جو وزیر السلطنت تھا دربار پر اس قدر حاوی تھا کہ خود بادشاہ بیگم اور ولیعہد سلطنت تک اُسکے آزار سے محفوظ نہ رہ سکے۔ غازی الدین حیدر اُسے گھونسون اور لاتون سے مارتے۔ جس مار کو وہ خوشی سے کھا لیتا۔ مگر اس کا بدلہ دیگر معززین دربار اور اعزائے شاہی تک سے لے لیا کرتا۔

اس پہلے بادشاہ اودھ نے مذہبی ارادت وعقیدت سے دریا کنارے اور موتی محل کے متصل نجف اشرف یعنی روضۂ مطہرۂ حضرت علیؑ کی نقل لکھنؤ مین بنوائی اور اُس کی روشنی وخدمت کے لیے بہت سا روپیہ سرکار انگریزی کے حوالے کیا۔ جس کی بدولت آج تک وہ بارونق اور خوب آباد ہے۔ اور ۱۲۵۶ھ محمدی ۱۸۲۷ء مین جب اُن کا انتقال ہوا تو اُسی مین دفن ہوے۔

——— (۶) ———

۱۲۵۶ھ محمدی (۱۸۲۷ء) مین غازی الدین حیدر کے بیٹے نصیر الدین حیدر تخت پر بیٹھے۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے جیسا کہ ہم بتا چکے ہین فرمان روایان اودھ نواب نہین بادشاہ تھے۔ اس دولت کا آغاز وزارت دہلی کے درجے سے ہوا تھا۔ اور اگلے زبردست و ذی وقعت فرمان روا سب نواب وزیر کہلاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ اصلی حکومت و سطوت رخصت ہو چکی تھی اور ہندوستان کے پالٹکس مین ان لوگون کا بالکل اثر نہین باقی رہا تھا یہ بادشاہ بن گئے۔

خیال کیا جا سکتا ہے کہ انگریزون نے حکمرانان اودھ کو بادشاہی عزت دی تو اپنی پشت پناہی سے اُنکی سطوت بھی بڑھا دی ہوگی۔ اور انھین نام ہی کا بادشاہ نہین بلکہ حقیقۃً بادشاہ بنا کے دکھا دیا ہوگا۔ لیکن نہین۔ ہمین یہ نظر آتا ہے کہ اس عہد مین اودھ کے باہر ان لوگون کا اثر تو بالکل تھا ہی نہین۔ خود اپنی قلمرو مین بھی یہ اتنے آزاد نہ تھے جتنے کہ اُنکے سابق بزرگ ہوتے آئے تھے۔ اب کسی کی تخت نشینی بغیر انگریزون کی منظوری کے ہو ہی نہ سکتی تھی۔ انگریزی فوج ساری قلمرو مین جا بجا پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی اہم معاملہ بغیر صاحب رزیڈنٹ کی دخل دہی کے طے ہی نہ ہو سکتا تھا۔ سریر شہریاری ایک اسٹیج تھا۔ جس پر جو کچھ ہوتا بظاہر نظر آتا کہ ایکٹر کر رہے ہین مگر اصل مین وہ افعال کسی اور شخص کے قبضۂ قدرت مین تھے جو پردے کی آڑ مین تھا اور جو چاہتا تھا کرتا تھا۔

مگر خدا کی اتنی مہربانی تھی کہ ان پچھلے حکمرانان اودھ کی اور اُنکے ساتھ قریب قریب سارے وابستگان دامن دولت کی حس مفقود ہو گئی تھی جسکی بدولت وہ اپنی کمزوری و بے دست و پائی کو بالکل محسوس نہ کر سکتے تھے۔ غازی الدین حیدر بادشاہ بنتے ہی عیش و عشرت مین مشغول ہو گئے۔ اور نصیر الدین حیدر کو تو تخت شاہی ورثے مین ملا تھا۔ نواب سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا روپیہ عیش پرستی مین دونون کا ممد و معاون ہوا۔ کچھ انگریزون کو قرض دیا گیا۔ کچھ اُن مبتدعہ مذہبی رسمون کی بجا آوری مین صرف ہوا جنھین بادشاہ اور اُن کی ملکاؤن نے اپنے مذاق کے موافق ذوق و شوق سے ایجاد کیا۔ اور باقی فضول خرچیون اور عیاشیون کی نذر ہونے لگا۔ غازی الدین حیدر نے تو اتنا بھی کیا تھا کہ نجف اشرف کی نقل بنوا کے اپنی قبر کا ٹھکانا کر لیا۔ اور بغیر اسکے کہ

اپنے ورثے پر بھروسا کریں کچھ روپیہ انگریزوں کے حوالے کیا کہ اُسکے سُود سے
پورے دینی آداب کے ساتھ سجف کی داشت کیا کریں۔ چنانچہ آج تک اُنکی قبر
پر چراغ روشن ہوتا ہے۔ مجلسین ہوتی ہین۔ قرآن خوانی ہوتی ہے۔ اور محرّم مین
خوب روشنی ہوتی ہے۔ جسکے طفیل تھوڑے سے غریبوں کی پرورش ہو جایا کرتی ہے۔
مگر نصیر الدین حیدر کو، ہجوم عیش مین اتنی بھی توفیق نہ ہوئی۔ دریا پار محلۂ ارادت نگر
مین اُنھون نے ایک کربلا بنوائی جو خود اُن کا مرقد قرار پانے والی تھی مگر اس کی
خدمت و داشت کی ذرا بھی فکر نہین کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج وہ ڈالی گنج کے
اسٹیشن کے پاس اُجاڑ اور خاموش پڑی ہے اور شاید کوئی چراغ جلانے والا بھی
نہین۔ اُنکے زمانے مین نئے محلے گنیش گنج اور چاند گنج وہین دریا پار آباد ہوے۔

نصیر الدین حیدر کو نجوم سے عقیدت تھی جس نے علم ہیأت کی طرف توجہ دلائی۔
اور ارادہ کیا کہ اپنے شہر مین ایک اعلیٰ درجے کی رصدگاہ قائم کرین۔ چنانچہ اسی غرض
کے لیے ایک کوٹھی نواب سعادت علی خان کے مقبرے اور موتی محل کے درمیان مین تعمیر
کرائی جو رصدگاہ ہونے کے باعث لکھنؤ مین تارے والی کوٹھی کے نام سے مشہور ہوئی
اُس مین بڑی بڑی دُوربینین اور اعلیٰ درجے کے آلات رصد جمع کیے گئے۔ اُسکے مناسب
طور پر قائم کرنے کا کام اور اُن کا انتظام و اہتمام کرنل وِلکاکس کے سپرد ہوا جو ایک
اچھے ہیأت دان تھے۔ مگر لکھنؤ کی یہ رصد گویا کرنل صاحب موصوف ہی کی زندگی
کا ایک مجہول الحال واقعہ تھی۔ کیونکہ سنہ ۱۲۴۳ ہجری سے نصیر الدین حیدر کی سلطنت کا
آغاز ہوا۔ جسکے چار پانچ سال بعد غالباً یہ رصدگاہ قائم ہوئی ہوگی۔ اور اُسوقت
سے سنہ ۱۲۶۳ ہجری (سنہ ۱۸۴۷ء) تک جبکہ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ کا زمانہ
تھا یہ رصدگاہ اُنھین کے اہتمام مین رہی۔ سنہ مذکور مین کرنل صاحب کا انتقال
ہوا اور اُنکی جگہ کوئی ہیأت دان اس خدمت پر مقرر نہین کیا گیا۔ واجد علی شاہ نے
اُس کی طرف سے بے پروائی کی۔ لکھنؤ کے بعض مستند اشخاص کی زبانی سُنا گیا کہ
اس کی سب سے بڑی دُوربین کو واجد علی شاہ نے ایک کھلونا خیال کر کے حیدری
طوائفت کے حوالے کر دیا تھا۔ لیکن گزیٹیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رصدگاہ انتزاع
سلطنت کے زمانے تک قائم تھی۔ غدر مین غالباً بلوائیون نے اسے تباہ کر دیا کیونکہ

احمد اللہ شاہ نے (جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے اور انگریزی فوج سے بڑی مستعدی و گرمجوشی کے ساتھ لڑے تھے) تارے والی کوٹھی ہی میں سکونت اختیار کی تھی۔ اسی میں اپنا دربار قائم کیا تھا۔ اور باغی فوجوں کے افسر یہیں جمع ہو کے مشورے کیا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں روشن الدولہ نے جو وزیر سلطنت تھے اپنی خوبصورت اور شاندار کوٹھی تعمیر کرائی جس میں فی الحال ڈپٹی کمشنر بہادر اجلاس کرتے ہیں۔ اسلیے کہ واجد علی شاہ نے اس کوٹھی کو قیصر باغ بنواتے وقت ضبط کر لیا تھا۔ اور جب ملک انگریزوں کے قبضے میں آیا ہے یہ کوٹھی ایک سرکاری جائداد تھی۔

نصیر الدین حیدر کا زمانہ سچ یہ ہے کہ نہایت ہی خطرناک زمانہ تھا۔ ایک طرف تو انتظام مملکت کی خرابی تھی بادشاہ کو عیش و عشرت اور اپنی ایجاد کردہ دینداری کی رسموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ سارا انتظام سلطنت وزیر پر چھوڑا جاتا تھا۔ اور وزیروں کی یہ حالت تھی کہ کوئی ایسا شخص ملتا ہی نہ تھا جو نیک نیتی اور خوش تدبیری سے کام چلا سکے۔ حکیم مہدی بلائے گئے۔ وہ منتظم تو اعلیٰ درجے کے تھے مگر چاہتے تھے کہ سلطنت کو اپنی ہی میراث بنا لیں۔ روشن الدولہ وزیر ہوئے۔ اُن میں نہ مادہ تھا نہ طبیعت داری۔ اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی۔ بادشاہ کی فضول خرچیوں کی یہ حالت تھی کہ سعادت علی خان کا جمع کیا ہوا سارا روپیہ پانی کی طرح اُڑ گیا۔ اور ملک کی آمدنی محل کے مصارف کے لیے کفایت ہی نہ کرتی تھی۔ اسپر طرہ یہ کہ بادشاہ اور اُن کی ماں غازی الدین حیدر کی خاص محل میں جھگڑے پیدا ہوئے۔ وہ منّا جان کو بادشاہ کا بیٹا بتاتی تھیں اور بادشاہ اُسکو اپنا بیٹا تسلیم نہ کرتے تھے۔ ان باتوں نے ملک کی ایسی حالت کر دی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ فرمانروان میں حکومت کرنے اور ملک کے سنبھالنے کی مطلق صلاحیت نہیں ہے۔

صاحب رزیڈنٹ اور گورنر جنرل ہند نے بار بار سمجھایا۔ ڈرایا۔ دھمکایا۔ انجام سے مطلع کیا۔ اور برابر کان کھولتے رہے مگر یہاں کسی کے کان پر جوں نہ رینگی۔ نصیر الدین حیدر میں عورتوں میں رہتے رہتے اس درجہ زنانہ مزاجی پیدا ہو گئی تھی کہ عورتوں کی سی باتیں کرتے۔ اور عورتوں ہی کا سا لباس پہنتے۔ زنانہ مزاجی کے ساتھ مذہبی

عقیدت نے یہ شان پیدا کر دی کہ ائمۂ اثنا عشر کی فرضی بیبیاں اچھوتیاں) اور اُنکی ولادت کی تقریبیں جو اُن کی ماں نے قائم کی تھیں اُن کو اور زیادہ ترقی دی۔ یہاں تک کہ ولادت ائمہ کی تقریبوں میں خود حاملہ عورت بن کے زچہ خانے میں بیٹھتے چھپرے اور حرکات سے وضعِ حمل کی تکلیف ظاہر کرتے۔ اور پھر خود ایک فرضی بچہ جنتے۔ جس کے لیے ولادت۔ چھٹی۔ اور نہان کے سامان بالکل اصل کے مطابق کیے جاتے۔ یہ تقریبیں اس قدر زیادہ تھیں کہ سال بھر بادشاہ کو انھیں سے فرصت نہ ملتی سلطنت کی طرف کون توجہ کرتا۔

دربارِ اودھ اور سرکارِ انگریزی کے تعلقات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر گورنر جنرل اور رزیڈنٹوں کی نظرِ عنایت نہ ہوتی اور انگلستان کا جو بورڈ ایسٹ انڈیا کمپنی کا نگران تھا کمپنی کو روکے تھامے نہ رہتا تو انتزاعِ سلطنت کی کارروائی اسی زمانے میں ہو گئی ہوتی۔ مگر اس طفلانہ مزاجی کے دربار کی زندگی ابھی باقی تھی۔ انگریز ملک کے لینے کا ارادہ کر کر کے رہ گئے۔

نصیر الدین حیدر کی نسبت لکھنؤ کے معتبر پُرانے لوگوں کا بیان ہے کہ اس زنانہ مزاجی اور ان طفلانہ حرکتوں کے ساتھ نہایت ہی ظالم بھی تھے۔ لیکن چونکہ ساری زندگی عورتوں میں بسر ہوتی تھی اس لیے اُن کے مظالم کا شکار بھی زیادہ تر عورتیں ہی ہوتیں بیسیوں عورتوں کو ادنیٰ قصور اور معمولی بدگمانی پر دیواروں میں چنوا دیا۔ کہتے ہیں کہ راہ چلتے کسی مرد کو کسی عورت کے سینے پر ہاتھ رکھے دیکھ لیا تھا۔ فوراً عورت کی چھاتیاں اور مرد کے ہاتھ کٹوا ڈالے۔

آخر دس برس کی بے اعتدالیوں کے بعد جبکہ اندر باہر کے تمام اہلِ دربار زندگی سے عاجز آ گئے تھے بادشاہ خود اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ہاتھ کا شکار ہوئے۔ اور کسی نے زہر دے کے سنہ ۱۲۵۳ ہجری (۱۸۳۷ء) میں قصہ تمام کر دیا۔ نصیر الدین حیدر لاولد مرے تھے۔ مُنّا جان کو غازی الدین حیدر کی بیگم نے ہمیشہ اپنا پوتا اور سچا وارثِ سلطنت بنا کے پیش کیا مگر غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر دونوں نے اُنکے نسلِ شاہی ہونے سے انکار کیا تھا۔ اسی بنا پر گورنمنٹ انگریزی نے نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدولہ محمد علی خان کی تخت نشینی

کا پہلے سے بندوبست کر لیا تھا۔ مگر بیگم صاحبہ نے نہ مانا۔ مُنّا جان کو لے کے لال بارہ دری یعنی تخت گاہ مین آگئین۔ رزیڈنٹ نے ہزار روکا اور سمجھایا مگر ایک نہ سُنی اور زبردستی مُنّا جان کو تخت پر بٹھا دیا۔ جنھون نے تخت پر قدم رکھتے ہی نذرین لین اور اپنے دشمنون سے فوراً بدلہ لینا بھی شروع کر دیا۔ بہتون کے گھر لُٹوا ئے۔ بعض کو گرفتار کر لیا۔ بعض قتل ہوے۔ اور شہر مین ایک ہڑبونگ مچ گیا۔

صاحب رزیڈنٹ اور اُنکے اسسٹنٹ فوراً دربار مین پہونچے۔ بادشاہ بیگم کو سمجھایا کہ مُنّا جان وارث سلطنت نہین ہو سکتے۔ اور اس مین آپ کو ہرگز کامیابی نہ ہوگی۔ پھر لاٹ صاحب کا تحریری فرمان دکھایا اور کہا بہتر یہی ہے کہ مُنّا جان تخت کو خالی کر دین اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل مین آجائے۔ مگر کسی نے سماعت نہ کی۔ بلکہ کسی نے اسسٹنٹ رزیڈنٹ پر حملہ کیا جس سے اُن کا چہرہ خون آلود ہو گیا۔ رزیڈنٹ نے منڈیاؤن سے انگریزی فوج پہلے ہی سے بُلوا لی تھی اور اس نے تختگاہ کے سامنے توپین لگا دی تھین اور سپاہی صفین باندھے کھڑے تھے۔ مجبوراً صاحب عالیشان نے گھڑی ہاتھ مین لی اور کہا دس منٹ کی مہلت دی جاتی ہے اس زمانے کے اندر اگر منا جان تخت سے نہ اُتر گئے تو جبریہ کارروائی کی جائے گی۔۔ اس کا بھی کسی نے خیال نہ کیا۔ حالانکہ رزیڈنٹ بار بار کہتے جاتے تھے کہ اب پانچ منٹ باقی ہین۔ اب دو ہی منٹ رہ گئے۔ اور اب دیکھیے پورا ایک منٹ بھی نہین۔

ان تنبیہون کا کسی نے خیال نہ کیا۔ اور یکایک توپون نے گرّا مین مارنا شروع کین۔ آناً فاناً مین تیس چالیس آدمی گر گئے۔ درباری بدحواسی کے ساتھ گرتے پڑتے بھاگے۔ جو طائفہ مجرا کر رہا تھا اُس مین سے بھی کئی آدمی زخمی ہوے۔ شیشہ آلات جھنا جھن ٹوٹ ٹوٹ کے گرنے لگے۔ جب کئی وفادار بہادر جو سینہ سپر تھے مارے جا چکے تو مُنّا جان نے بھی تخت سے گر کے بھاگنے کا قصد کیا مگر پکڑ لیے گئے۔ غرض بیگم صاحب اور انھین دونون کو انگریزون نے گرفتار کر لیا۔ ساتھ ہی نصیر الدولہ کی تخت نشینی عمل مین آئی جو محمد علی شاہ کے لقب سے بادشاہ اودھ قرار پائے۔ اور مُنّا جان اور اُنکی دادی سخت حراست مین لکھنؤ سے کانپور اور کانپور سے قلعہ چنار گڑھ

مین بھیج دیے گئے۔ اور دو ہزار چار سو روپیہ ماہوار اُن کی تنخواہ لکھنؤ کے خزانے سے مقرر کر دی گئی۔

محمد علی شاہ کی عمر تخت نشینی کے وقت تر سٹھ برس کی تھی۔ بوڑھے تجربہ کار تھے زمانے کے سرد و گرم اور دربار کی طفلانہ مزاجیان دیکھتے رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ نواب سعادت علی خان کے بیٹے تھے اور اُن کی آنکھین دیکھے ہوے تھے۔ انھون نے بہت سنبھل کے کام کیا۔ کفایت شعاری کے اصول جاری کیے اور جہان تک بنا انتظام کے سنبھالنے کی کوشش کی۔ مگر عمر زیادہ آ چکی تھی اور قُوے جواب دیتے جاتے تھے۔ تخت پر بیٹھتے ہی اُنھون نے حکیم مہدی کو فرخ آباد سے بُلوا کے خلعت وزارت دیا۔ مگر چند ہی روز بعد وہ مر گئے۔ تب ظہیر الدولہ کو خلعت وزارت ہوا۔ دو تین مہینے بعد وہ بھی دنیا سے رخصت ہوے۔ اور منور الدولہ وزیر قرار پائے۔ جنھون نے دو چار مہینے کے بعد ہی استعفا دے دیا اور کربلاے معلّے چلے گئے۔ پھر اشرف الدولہ محمد ابراہیم خان وزیر قرار پائے جو اَوروں کے دیکھتے ذی ہوش اور متین تھے۔

محمد علی شاہ کی تخت نشینی پر گورنمنٹ انگریزی اور سلطنت اودھ مین ایک نیا معاہدہ ہوا۔ جس کی رُو سے سرکار انگریزی نے جو فوج اودھ کی نگرانی کے لیے رکھی تھی اُس مین معتد بہ اضافہ ہوا۔ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ کو یہ اختیار حاصل ہوا کہ ساری قلمرو اودھ یا اُسکے جس علاقے مین بدنظمی دیکھے اُسے جب تک چاہے اپنے زیر انتظام رکھے۔ بادشاہ نے ناگواری کے ساتھ اس عہدنامے پر دستخط کیے اور جہان تک بنا ملک کی اصلاح کرنے لگے۔

تخت نشینی کے دوسرے ہی برس اُنھون نے اپنا مشہور امام باڑہ حسین آباد اور اور اُسکے قریب ایک عالیشان مسجد تعمیر کرانا شروع کی۔ جس کی بابت اہتمام کیا گیا کہ دہلی کی جامع مسجد سے رونق اور وسعت مین بڑھ جائے۔

اُن دنون لکھنؤ کی آبادی و رونق اس قدر ترقی کر گئی تھی اور اس کثرت سے آدمی اُس کی سواد مین آباد تھے کہ اُسے ہندوستان کا بابل کہنا بیجا نہ تھا۔ واقعی یہ شہر ہر حیثیت سے اُس عہد کا زندہ بابل تھا۔

اس مشابہت کو شاید انگریزون یا کسی درباری سے سُن کے محمد علی شاہ نے ارادہ کیا کہ لکھنؤ کو پورا پورا بابل بنا دین۔ اور اپنی ایک ایسی یادگار قائم کر دین جو اُنکے نام کو تمام شاہان اودھ سے زیادہ بلندی پر دکھائے۔ اُنھون نے بابل کے مینار یا وہان کے ہوائی باغ کی طرح کی ایک عمارت حسین آباد سے قریب اور موجودہ گھنٹہ گھر کے پاس تعمیر کرانا شروع کی۔ جس مین محرابون کے مدور حلقے پر دوسرا حلقہ اور دوسرے حلقے پر تیسرا حلقہ۔ غرض یون ہی تلے اوپر قائم ہوتے چلے جاتے تھے۔ ارادہ تھا کہ یونہین سات منزلون تک اُسے بلند کر کے ایک اتنا بڑا اور اونچا برج بنا دیا جائے کہ جو دنیا بھر مین لاجواب ہو۔ اور اُسکے اوپر سے سارے لکھنؤ اور اُسکے گرد کی فضا نظر آئے۔ یہ عمارت اگر پوری بن جاتی تو یقیناً لاجواب اور عجیب و غریب ہوتی۔ اس کا نام "ست کھنڈا" قرار دیا گیا تھا۔ اور بڑے اہتمام سے بن رہی تھی۔ مگر پانچ ہی منزلین بننے پائی تھین کہ محمد علی شاہ نے ۱۲۵۸ھ محمدی (۱۸۴۲ء) مین سفر آخرت کیا۔

محمد علی شاہ نے اپنے مختصر زمانے مین بغیر اس کے کہ اندرونی جھگڑے پیدا ہون یا ملک مین بدنظمی کی فریاد بلند ہو لکھنؤ کو نہایت ہی خوبصورت شہر بنا دیا۔ حسین آباد کے پھاٹک سے رومی دروازے تک دریا کنارے کنارے ایک سڑک نکالی جو چوک کہلاتی تھی۔ اس سڑک پر باوجود دو طرفہ عالیشان مکانون کے ایک طرف رومی دروازہ آصف الدولہ کا امام باڑہ اور اُس کی مسجد تھی۔ دوسری طرف ست کھنڈا اور حسین آباد کا پھاٹک تھا۔ اس نئے امام باڑے کی مختلف سر بفلک عمارتین تھین۔ اور انکے پہلو مین جامع مسجد واقع تھی۔ ان سب عمارتون نے مل کے دونون جانب ایک ایسا خوشنما اور نظر فریب منظر پیدا کر دیا تھا جو دنیا کے تمام مشہور و خوش سواد مناظر پر چشمک زنی کرتا تھا۔ اور اب بھی گو کہ درمیان مین باشندگان شہر کے جتنے مکانات واقع تھے سب کھد گئے مگر دنیا کا ایک بہترین منظر تصور کیا جاتا ہے۔

(۷)

محمد علی شاہ کے بعد امجد علی شاہ اریکہ آرائے سریر شہریاری ہوئے۔ محمد علی شاہ نے کوشش کی تھی کہ ولیعہد سلطنت کی تعلیم اعلیٰ درجے کی ہو۔ چنانچہ انھین علما و فضلا کی صحبت مین رکھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امجد علی شاہ بجائے اسکے کہ تعلیم مین کوئی نمایان ترقی

کرین اخلاق و عادات کے لحاظ سے ایک ثقہ مولوی بن گئے۔ عنان حکومت ہاتھ مین لینے کے بعد اُن کا جو کچھ حوصلہ تھا یہ تھا کہ وہ اور اُنکے ساتھ ساری رعایا جناب قبلۂ و کعبہ کی حلقہ بگوش ارادت بن جائے۔ لیکن ظاہر ہی کہ علماے دین و مقتدایان ملت کو پالٹکس سے کسی قسم کا واسطہ نہین ہو سکتا۔ وہ نہ مدبر سلطنت ہو سکتے ہین نہ اسٹیٹسمین۔ اُن سے جو کچھ ہدایت مل سکتی تھی یہ تھی کہ سیدون کی خدمتگذاری کی جائے۔ اور سلطنت کا روپیہ مومنین کی اعانت و دستگیری مین صرف ہو۔ اور یہ کام بھی ارادت کیش اور محتاط فرمانرواے اودھ امجد علی شاہ کی نظر مین اُسی وقت قابل اطمینان ہو سکتا تھا جب خود مجتہد العصر کے مبارک ہاتھون سے انجام پائے۔ چنانچہ ملک کی آمدنی مین سے لاکھون روپیہ زکوۃ کے نام سے اُنکی نذر کیا جاتا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی خیرات کی رقمین اُنھین کے ہاتھ مین جاتین۔

امجد علی شاہ کے لیے تقوے طہارت کا خیال مرض بن گیا تھا۔ انھین اپنے خیال کی پابندی شرع سے اتنی فرصت ہی نہ ملتی تھی کہ نظم و نسق مملکت کی طرف توجہ کرین۔ جس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ محمد علی شاہ نے اپنی تجربہ کاری و بیدار مغزی سے جو کچھ انتظامات کیے تھے سب درہم و برہم ہو گئے۔ اور یہ حالت ہو گئی کہ (قاضی محمد صادق خان آختر کے بیان کے مطابق) "تمام عمال بدکار و بد باطن اور خود غرض تھے۔ رعایا تباہ تھی۔ زبردست کا ٹھینگا سر پر تھا۔ ظالم و مجرم کو سزا نہ ملتی۔ خزانہ خالی تھا۔ رشوت ستانی کی گرم بازاری تھی۔ اور جو فتنے پیدا ہوتے کسی کے مٹائے نہ مٹ سکتے"

لیکن اس اتقا کی خاموشی اور تدبیری غفلت و بے پروائی پر بھی اُنھون نے محلۂ حضرت گنج آباد کیا جو آج لکھنؤ مین تمام محلون سے زیادہ صاف ستھرا خوب آباد۔ نہایت خوبصورت۔ دولتمند تاجرون کا اعلیٰ ترین بازار ہے۔ اور سول لائن کا سب سے زیادہ بارونق حصہ ہے۔ اُنھون نے لکھنؤ سے کانپور تک براہ راست ایک پختہ سڑک بنوائی۔ اُنکے عہد مین سب سے بڑا کام یہ ہوا کہ لوہے کے پل کی عمارت بن کے تیار ہو گئی۔ اس پل کی تعمیر کا واقعہ یہ ہے کہ اسکے اجزا اور پرزے غازی الدین

حیدر نے انگلستان سے منگوائے تھے۔ مگر وہ پُرزے جب تک لکھنؤ مین پہونچین پہونچین بادشاہ رنگیلے عالم جاودان ہو چکے تھے۔ نصیرالدین حیدر کے عہد مین جب وہ پُرزے ولایت سے آئے تو اُنھون نے اپنے دربار کے انجینیر مسٹر سنکلیر کو اُن پُرزون کے جوڑنے اور پُل کو بنا کے کھڑا کر دینے کا ٹھیکہ دیا۔ اور حکم دیا کہ وہ پُرزے رزیڈنسی کے سامنے پار دریا کے کنارے ڈال دیے جائین۔ جس مقام پر پُل کے یہ آہنی پُرزے ڈالے گئے تھے اُس جگہ کا پتہ دینے کے لیے آج وہین ایک گھاٹ اور شوالہ قائم ہے۔ مسٹر سنکلیر نے دریا کے اندر ستون قائم کرنے کے لیے گہرے کنوئین کھدوائے۔ اور ستونون کی جڑائی بھی کرلائے۔ مگر اسکے بعد اُن سے کچھ کرتے دھرتے نہ بنی اور پُل کی تکمیل مین ناکامی ہوئی۔ محمد علی شاہ کے زمانے مین یہ کام ناتمام پڑا رہا۔ مگر امجد علی شاہ نے اپنے عہد مین اسکی جانب توجہ کی اور پُل بن کے تیار ہو گیا۔ لیکن جو لوہے کا پُل آج کل قائم ہے یہ وہ امجد علی شاہ کے زمانے کا پُل نہین ہے۔ وہ ایک ہینگنگ برج یعنی لٹکنے والا پُل تھا جس کا سارا بار چار بلند اور زبردست آہنی کھمبون پر لٹک رہا تھا۔ انگریزی زمانے مین جب اُسکے پُرزے زنگ آلود ہو کے کمزور ہوے اور اُس پر عام آمد و رفت مین خطرہ نظر آیا تو اُسے منہدم کرا کے اُس کی جگہ دوسرا آہنی پُل قائم کیا گیا۔ اور وہی پُل اسوقت موجود ہے۔

امجد علی شاہ ہی کے زمانے مین اُنکے وزیر امین الدولہ نے امین آباد آباد کیا۔ جس کی آبادی و رونق آج کل روز افزون ترقی کر رہی ہے۔ امجد علی شاہ نے اپنے زمانے مین اگرچہ کچھ نہین کیا اور نہ اپنے شوق سے کوئی ایسی عمارت بنوائی جو آج کل اُنکی یادگار ہو۔ مگر شاید اپنے اتقا و پرہیزگاری کے صلے مین اُنھین یہ قدرتی ناموری حاصل ہو گئی کہ لکھنؤ کے آج کل کے دو سب سے زیادہ مشہور۔ سب سے زیادہ آباد۔ سب سے زیادہ بارونق۔ اور سب سے زیادہ دولتمند محلے۔ امین آباد اور حضرت گنج اُنھین کے عہد کی یادگار ہین۔

آخر زمانے نے اُنکے دور کا ورق بھی اُلٹا۔ اور ۱۲۶۳ھ ہجری (۱۸۴۷ع) مین جبکہ عمر اڑتالیس برس سے کچھ ہی دن زیادہ تھی مرض سرطان مین مبتلا ہو کے

دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اور اپنے آباد کیے ہوے محلے حضرت گنج مین مینڈو خان رسالدار کی چھاؤنی کے اندر دفن ہوے۔ اُن کا امام باڑہ جس مین وہ مدفون ہین حضرت گنج کے مغربی حصے مین لب سڑک موجود ہے جس کی عمارت اُن کی وفات کے بعد واجد علی شاہ نے دس لاکھ روپیہ صرف کر کے بنوائی تھی۔ یہ امام باڑہ حسین آباد کی ایک ناقص نقل ہے۔ اور اگر حسین آباد کی طرح اس مین بھی روشنی ہوتی تو محرم مین لکھنؤ کا مشرقی حصہ بھی عالم نور پہنچایا کرتا۔ اگرچہ اُس کے لیے کوئی وثیقہ نہین معین ہے لیکن اس کی آمدنی بھی کم نہین۔ احاطے کی عمارت کے بیرونی رُخ کی دوکانون مین بہت سے اچھے اچھے تاجرون کی دُکانین ہین۔ اور اندرونی عمارتون مین بہت سے پوربئین وغیرہ رہتے ہین۔ جن سے کرایے کی معتد بہ رقم وصول ہوتی ہے۔ مگر کرایہ وصول کرنے والون کا یہ بھی احسان ہے جو محرم مین خاص قبر اور امام باڑے مین چند چراغ روشن کر دیا کرتے ہین۔

اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوے اُن کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیۂ باستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتزاع سلطنت اُنھین کے عہد مین ہوا اس لیے تمام اہل الرائے کے ہدف سہام اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے۔ اور قریب قریب تسلیم کر لیا گیا کہ زوال سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے مین انکی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے اُن دنون ہندوستان کی تمام وطنی قوتین ٹوٹ رہی تھین۔ اور بُری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتین دنیا سے مٹتی جاتی ہین پنجاب مین سکھون کا اور دکن مین مرہٹون کا دفتر کیون اُلٹا جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے ہین؟ دہلی مین مغل شہنشاہی کا اور بنگالے مین نواب ناظم بنگالہ کا استیصال کیون ہوا؟ حالانکہ اُن مین اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اورنگ آرائے سلطنت مین بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چارون دربارون مین کوئی واجد علی شاہ نہ تھا۔ حالانکہ اُنکی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔

اصل یہ ہے کہ اس عہد مین ادھر اہل ہند کی غفلت وجہالت کا پیمانہ چھلکنے

کے قریب پہونچ گیا تھا۔ اور اُدھر دولت برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی
عاقبت اندیشی۔ قابلیت۔ جفاکشی اپنی کوششون اور اپنی اعلیٰ تہذیب و
شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانایان
فرنگ کی ذہانت وطباعی۔ خوش تدبیری و باضابطگی ہندوستان کی جہالت و
خود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا مین تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا
تھا اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق مین میرا ساتھ نہ دے گا
مٹ جائے گا۔ زمانے کے اس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان مین کسی نے نہ سُنی
اور سب مٹ گئے۔ انھین مٹنے والون مین اودھ کی سلطنت بھی تھی جسکے زوال
کا بار غریب واجد علی شاہ پر ڈالدینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔

پابند شرع باپ نے واجد علی شاہ کو بھی علما کی صحبت مین رکھ کے اپنا سا بنانا
چاہا تھا۔ اور یہ رنگ ایک حد تک واجد علی شاہ پر چڑھا بھی جو اقتضاے عمر کے
ساتھ زیادہ کھُلتا گیا۔ مگر واجد علی شاہ کا اس مین کچھ زور نہ چلا کہ وارث سلطنت
فرزند کا فطری رُجحان عیاشی اور فنون طرب و نشاط کی طرف تھا۔ اگرچہ باپ
کی تاکید سے پڑھنے لکھنے کی تعلیم بھی اچھی تھی لیکن موسیقی کا شوق غالب تھا۔
ولیعہدی ہی مین اپنے ذاتی شوق سے اُنھون نے باپ کے منشا کے خلاف گویون
اور ڈھاڑیون کو اپنی صحبت مین رکھا۔ گانا بجانا سیکھا۔ آوارہ عورتون اور ڈوم
ڈھاریون سے ربط و ضبط بڑھایا۔ اور انجام یہ ہوا کہ جو لطف اُنھین حسین عورتون
اور گویون کی صحبت مین آتا علمی مذاق کی مہذب صحبتون مین نہ آتا۔

باپ کے خلاف انھین عمارت کا بڑا شوق تھا۔ اور ولیعہدی ہی مین اُنھون نے
خاص اپنی محفل طرب اور عیش کے لیے ایک پُر فضا باغ اور اُس مین دو ایک
مختصر۔ خوبصورت اور پُرتکلف مکان بنوائے۔ علی نقی خان جنھین تخت پر بیٹھتے ہی
خلعت وزارت عطا کیا اُن سے زمانہ ولیعہدی مین ایک رنڈی کے گھر پر ملاقات
ہوئی۔ اُنکی [illegible] شوخ مزاجی نے مزاج مین درخور پیدا کیا۔ اور جب مذکورہ
بالا باغ اور عمارت اُن کے اہتمام مین تعمیر ہو کے پسند آگئے تو سمجھ لیا گیا کہ وزارت
اور انتظام مملکت کے لیے اُن سے زیادہ موزون دوسرا کوئی شخص نہین ہے۔

واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان بانکے بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی توجہ تھی۔ سواری مین آگے آگے دو نقرئی صندوق چلتے۔ جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے اُن مین ڈال دیتا۔ کنجی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل مین پہونچ کے حضور اُن عرضیون کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔ اس طرح کئی نئے رسالے اور کئی پلٹنین بھرتی ہوئین۔ رسالون کے نام بادشاہ نے اپنی منشیانہ طباعی سے بانکا۔ ترچھا۔ گھنگھور رکھے۔ اور پلٹنون کے نام اختری۔ نادری رکھے گئے۔ خود بدولت بنفس نفیس گھوڑے پر سوار ہوکے جاتے اور گھنٹون دھوپ مین کھڑے ہوکے اُن کی قواعد اور فنون جنگ مین اُن کی مشاقی دیکھتے۔ اور خوش ہو ہو کے باکمال سپاہیون کو انعام و اکرام سے سرفراز فرماتے۔ فوجی قواعد کے لیے خود ہی فارسی اصطلاحات اور کلمات مقرر کیے۔ "راست رو" "پس بیا" "دست چپ بگرد"۔ چند بانکی جوان حسین عورتون کی ایک چھوٹی زنانی فوج مرتب کی گئی۔ اور اُن کو بھی انھین اصطلاحون مین قواعد سکھائی گئی۔

مگر جدید عہد کا یہ نقش اولین چند روزہ تھا۔ پورا ایک سال بھی نہ گذرا ہوگا کہ طبیعت ان چیزون سے اُکتا گئی۔ زمانۂ ولیعہدی کا وہی پُرانا مذاق پھر عود کر آیا حسین اور آوارہ عورتون سے صحبت بڑھی۔ ارباب نشاط کا بازار گرم ہوا۔ اور تھوڑے ہی دنون مین ڈوم ڈھاڑی ہی ارکان دولت اور معززین سلطنت تھے بادشاہ کے دل مین اب اگر کوئی علمی اور شریفانہ مذاق باقی تھا تو وہ شاعری تھی کیونکہ خود شعر کہتے اور شعرا کی قدر کرتے تھے۔

لکھنؤ مین اُن دنون شاعری کا چرچا حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اکیلے لکھنؤ مین اتنے شاعر موجود تھے کہ اگر سارے ہندوستان کے شعرا جمع کیے جاتے تو اُنکی تعداد لکھنؤ کے شاعرون سے نہ بڑھ سکتی۔ میر اور سودا کی پُرانی شاعری تقویم پارینہ ہو چکی تھی۔ اب ناسخ کی زبان اور آتش کے خیالات دماغون مین بسے ہوئے تھے جن مین رند و صبا کے رندانہ کلام اور نواب مرزا شوق کی مثنویون نے شہوت پرستیون کی روح پھونک دی تھی۔ اور اسی مذاق کو بادشاہ کی طبیعت کا اصلی

رنگ چاہتا اور پسند کرتا تھا۔

اسلامی شاعری کا رنگ خلافت اسلامیہ کی پہلی صدی تک تو یہ تھا کہ شاعر ایک خاص عورت پر عاشق ہوتے۔ اُس کا نام لے لے کے اُس کے حسن کی خوبیون اور اُس کی اداؤن کی دلفریبیون کو بیان کرتے۔ اور اُس کی طرف خطاب کر کر کے اپنی بیتابیون اور بیقراریون کو ظاہر کرتے۔ اکثر چھپ چھپ کے اُس سے ملتے مگر تہذیب و عفت کے دائرے سے کبھی قدم باہر نہ نکالتے۔ چند روز بعد عرب ہی مین معشوق گمنام ہو گیا۔ اور عموماً شعرا کا معشوق اُنکے خیال کا ایک پُتلا بن گیا۔ جسے رندمشرب تو کوئی حسین عورت یا کوئی خوبرو لڑکا بتاتے۔ مگر صوفی تھوڑی سی معنوی تاویل کر کے اُسے اپنا حسین مطلق یعنی خلاق عالم بتا دیتے۔ یہی سمویا ہوا چھپا ڈھکا مذاق رندی فارسی شاعری مین رہا اور یہی مذاق اس وقت تک اُردو شاعری کا بھی تھا۔ مگر نواب مرزا شوق نے اپنی شاعری کو حسین پردہ دار عورتون پر عاشق ہو کے اُن کے خراب کرنے کا آلہ بنایا۔ اور قیامت یہ تھی کہ اُن کی مثنویون کی زبان ایسی خوبصورت۔ بے تکلف اور شستہ و رفتہ تھی اور اُن مین عاشقانہ جذبات اس کثرت سے بھر دیے گئے تھے کہ مہذب و شایستہ لوگون سے بھی۔ بے دیکھے اور مزہ لیے نہ رہا جاتا۔

واجد علی شاہ نے بھی اِن مثنویون کو دیکھا اور چونکہ ماشاءاللہ سے خود شاعر تھے اس رنگ کو اختیار کر کے اپنے بہت سے عشقون اور اپنی عنفوان شباب کی صدہا رندانہ بے اعتدالیون کو خود ہی موزون کر کے ملک مین پھیلا دیا۔ اور خلاقی دنیا مین اقراری مجرم بن گئے۔ مین سمجھتا ہون کہ بادشاہ تو بادشاہ وزرا و امرا مین بھی شاذ و نادر ہی ایسے گذرے ہون گے جنھون نے عنفوان شباب مین اپنی شہوت پرستی کی ہوسون کو جی بھر کے نہ نکال لیا ہو۔ مگر واجد علی شاہ کی طرح کسی نے اپنے ان بے شرمی کے جرائم کو خود ہی پبلک کے سامنے پیش نہین کیا تھا۔ واجد علی شاہ زور مین آئے تو چاہے شاعری مین نہ بڑھ سکین مگر اپنے جذبات و خیالات اور اپنے کارنامون کے عالم آشکارا کرنے مین نواب مرزا سے بھی دو قدم آگے نکل گئے۔ اور یہان تک ترقی کی کہ بعض موقعون پر انھین مبتذل بازاری مذاق

اور فحش الفاظ کے استعمال مین بھی تامل نہین ہوتا۔

وہ کہاریون۔ رنڈیون۔ خواصون۔ محل مین آنے جانے والی عورتون۔ غرض صدہا عورتون پر عاشق ہوے۔ اور چونکہ ولیعہد سلطنت تھے اپنے عشق مین خوب کامیاب ہوے۔ جن کی شرمناک داستانین اُنکی نظمون۔ تحریرون۔ اور تصنیفون مین خود اُن کی زبان سے سُن لی جا سکتی ہین۔ اور یہی سبب ہے کہ تاریخ مین اُنکا کیریکٹر سب سے زیادہ ناپاک اور تاریک نظر آتا ہے۔

چونکہ عمارت کا بیحد شوق تھا اس لیے تخت نشین ہوتے ہی قیصر باغ کی عمارت بنوانا شروع کردی۔ جو چاہے آصف الدولہ کی عمارتون کی طرح مضبوط نہ ہو مگر خوبصورتی اور شانداری مین لاجواب ہے۔ اس مین بہت سی خوشنما اور با شان و شوکت دو منزلی عمارتون کا ایک مربع مستطیل رقبہ دُور تک چلا گیا تھا۔ جس کا ایک رُخ جو دریا کی جانب تھا غدر کے بعد کھود ڈالا گیا۔ اور تین ضلعے اب تک قائم ہین۔ جن کو مختلف قطعات پر بانٹ کے گورنمنٹ نے تعلقداران اودھ کے حوالے کر دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اُن مین رہین اور اُنکو اسی وضع مین قائم و برقرار رکھین۔

قیصر باغ کا اندرونی صحن جس مین چمن بندی تھی جلو خانہ کہلاتا تھا۔ درمیان مین پتھر والی بارہ دری تھی جو آج کل لکھنؤ کا ٹاؤن ہال ہے۔ اس مین اور کئی عمارتین بھی تھین جو اب نہین باقی ہین۔ اسکے باہر یہان سے متصل ہی بہت سی شاہی عمارتین تھین جنھون نے اس قطعۂ زمین کو اعجوبۂ روزگار بنا دیا تھا۔ یہ عمارتین قیصر باغ کے مشرقی پھاٹک کے باہر تھین۔ لوگون کو اس پھاٹک سے نکلتے ہی دونون جانب چوبی اسکرینین ملتی تھین۔ جن مین سے گذر کے وہ چینی باغ مین پہونچتے۔ وہان سے بائین ہاتھ کی طرف مُڑکر آپ جل پریون کے ایک عالیشان پھاٹک پر پہونچتے جسپر مدار المہام سلطنت نواب علی نقی خان کا قیام رہتا تھا۔ تاکہ ہر وقت جہان پناہ سے قریب رہین اور بوقت ضرورت فوراً بُلالیے جا سکین۔ اس پھاٹک کے اُس طرف حضرت باغ تھا۔ اور اندر ہی داہنی طرف چاندی والی بارہ دری تھی۔ یہ ایک معمولی اینٹ چونے کی عمارت تھی گر چھت مین چاندی کے پتّر جڑے ہونے کی وجہ سے

چاندی والی بارہ دری کہلاتی - اسی سے ملحق کوٹھی خاص مقام تھی جس مین خود جہان پناہ سلامت رہتے - اور وہین نواب سعادت علی خان کی بنائی ہوئی پرانی کوٹھی بادشاہ منزل تھی -

پھر ان چوبی اسکرینون کے گلیارے سے نکل کے دوسری طرف مُڑیئے تو پیچیدہ عمارتون کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا جو چوکلکھی کے نام سے مشہور تھین - ان عمارتون کا بانی حضوری نائی عظیم اللہ تھا - جنھین بادشاہ نے چار لاکھ روپے دیکے مول لیا تھا - نواب خاص محل اور معزز محلات عالیات اس مین رہتی تھین - اسی کے اندر غدر کے زمانے مین حضرت محل کا قیام رہا اور یہین اُن کا دربار ہوا کرتا تھا -

یہان سے ایک سڑک قیصر باغ کی طرف آئی تھی جسکے کنارے ایک بڑا بھاری سایہ دار درخت تھا اُسکے نیچے گرداگرد سنگ مرمر کا ایک نفیس گول چبوترہ بنایا گیا تھا جسپر قیصر باغ کے میلون کے زمانے مین جہاہ پناہ جوگی بنکے اور گیروے کپڑے پہنکے آتے اور دھونی رما کے بیٹھتے - اس چبوترے سے آگے بڑھکے ایک عالیشان پھاٹک تھا جو لکھی پھاٹک کہلاتا - اس لیے کہ اسکی تعمیر مین ایک لاکھ روپے صرف ہوے تھے - اور اس سے بڑھ کے آپ پھر قیصر باغ مین آ جاتے - قیصر باغ کی عمارت مین سلطنت کے اسی لاکھ روپے صرف ہوے تھے - اور اُسکے چارون طرف کی عمارتون مین جہاہ پناہ کی بیگمین اور پری تمثال وماہ طلعت خاتونین رہتین - جن کی جگہ اب عجیب وعزیب صورتون کو دیکھکے بعض پرانے زمانے والے کہہ اُٹھا کرتے ہین -

"پری نہفتہ رُخ ودیو درکرشمہ وناز   بسوخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبیست"

قیصر باغ کے مغربی پھاٹک کے باہر روشن الدولہ کی کوٹھی تھی - اسے واجد علی شاہ نے ضبط کرکے اس کا نام قیصر پسند رکھدیا تھا - اور اُنکی ایک محبوبہ نواب معشوق محل اس مین رہتی تھین - اب اُس مین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر کی عدالت ہے - اُس کے سامنے اور قیصر باغ کے اس مغربی پہلو پہ بھی ایک دوسرا جلو خانہ تھا -

سال مین ایک مرتبہ قیصر باغ مین ایک عظیم الشان میلہ ہوتا تھا جس مین پبلک کو بھی قیصر باغ مین آنے اور جہان پناہ کی عشرت پرستیون کا رنگ دیکھنے کا موقع مل جاتا - بادشاہ نے سری کرشن جی کا رہس جو ہندوؤن مین مروج ہے دیکھا تھا - اور سری

کرشن جی کی معشوقانہ وش عاشقی اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُس رہس سے ڈراما کے طور پر ایک کھیل ایجاد کیا تھا جس مین خود کنھیا بنتے۔ مخدرات عصمت آیات گوپیان بنتین۔ اور ناچ رنگ کی محفلین گرم ہوتین۔ کبھی جوش جوانی کے جذبات سے جوگی بن جاتے۔ موتیون کو جلا کے بھبوت بنائی جاتی۔ جس کی بدولت فقیری مین بھی شاہی کے کرشمے نظر آتے۔ میلے کے زمانے مین ان صحبتون مین شریک ہونے کی عام اہل شہر کو اجازت ہو جاتی مگر اس شرط کے ساتھ کہ گیروے کپڑے پہن کے آئین جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اسّی اسّی برس کے بُڈھے بھی شنگرفی کپڑے پہن کے چھیلا بن جاتے اور بادشاہ کی جوانی کے بادۂ طرب سے اپنے بُڑھاپے کا جام بھر لیتے۔

یہی رنگ چلا جاتا تھا اور لکھنؤ مین کمال بے فکری کے ساتھ رنگ رلیان منائی جا رہی تھین کہ گورنمنٹ برطانیہ کو رزیڈنٹون نے یہان کے حالات سے آگاہ کیا اور وہان کے بورڈ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ ملک اودھ قلمرو برطانیہ مین شامل کر لیا جائے۔ اس حکم کی تعمیل کے لیے انگریزی فوج لکھنؤ مین آئی۔ اور یکایک خلاف توقع بادشاہ کو حکم سُنایا گیا کہ "آپ کا ملک انگریزی ممالک محروسہ مین شامل کر لیا گیا۔ آپ کے لیے بارہ لاکھ روپیہ سالانہ اور آپ کے جلوسی لشکر کے لیے تین لاکھ روپیہ ماہوار جو آپ کی اور وابستگان دامن کی ضرورتون کے لیے بخوبی کافی ہے مقرر کی گئی۔ اور آپ کو اجازت ہے کہ شہر کے اندر آرام سے بفکرے بن کے بیٹھیے اور رعایا کی فکرون سے آزاد ہو کے بے غل و غش رنگ رلیان منائیے"۔ یہ احکام سنتے ہی شہر مین سنّاٹا ہو گیا۔ خود بادشاہ نے رو دھو کے بہت کچھ عذر خواہی کی۔ بادشاہ کی مان اور خاص محل نے حق وکالت ادا کیا مگر گورنر جنرل بہادر کے حکم مین ردو بدل کرنا صاحب رزیڈنٹ کے اقتدار سے باہر تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی گورنمنٹ نے بغیر کسی زحمت و مزاحمت کے ملک اودھ پر قبضہ کر لیا۔ اور بادشاہ مع اپنی والدہ۔ بعض خاص خاص محلات اور جان نثار رفقا کے کلکتے روانہ ہوئے کہ انگلستان جا کے اپیل کرین اور اپنی بیگناہی ثابت کر کے انتزاع سلطنت کے حکم کو منسوخ کرائین۔

(۸)

واجد علی شاہ کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ تاج و تخت سے جدا ہوتے ہی آخر

۱۲۸۵ھ محمدی (۱۸۵۶ء) میں لکھنؤ چھوڑ کے کلکتے کی طرف روانہ ہو گئے۔ تاکہ اپنے معاملے میں باضابطہ پیروی کریں۔ اور گورنر جنرل ہند کے دربار سے کامیابی نہ ہو تو لندن پہونچ کے مقدمے کو پارلیمنٹ اور ملکۂ انگلستان کے سامنے پیش کر دیں۔ چنانچہ جب کلکتے میں کام نہ نکلا تو انگلستان کا قصد کیا۔ مگر اطبا نے بحری سفر کو بادشاہ کے لیے مضر تصور کیا۔ اور مشیروں نے روکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بادشاہ تو کلکتے ہی میں ٹھہر گئے مگر اپنی ماں اور بھائی کے ساتھ ولی عہد کو انگلستان روانہ کیا۔ اس سفر میں میرے نانا منشی قمر الدین صاحب مرحوم بھی اس خانمان برباد شاہی قافلے کے ہمراہ تھے۔ بادشاہ کو سرکار انگریزی کی مجوزہ تنخواہ لینے سے انکار تھا اور اڑے ہوئے تھے کہ ہم تو اپنا تاج و تخت ہی لیں گے جو بے قصور چھینا گیا ہے۔

بادشاہ کلکتے میں تھے۔ اُن کا خاندان لندن میں تھا۔ اور معاملہ زیر غور تھا کہ یکایک کارتوسوں کے جھگڑوں اور گورنمنٹ کی ضد نے ۱۲۷۳ھ محمدی (۱۸۵۷ء) میں غدر پیدا کرا دیا۔ اور میرٹھ سے بنگالے تک ایسی آگ لگی کہ اپنے پرائے سب کے گھر جل اُٹھے۔ اور ایسا فتنۂ عظیم پیدا ہوا کہ ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کی بنیاد ہی متزلزل نظر آتی تھی۔ جس طرح میرٹھ وغیرہ کے باغی ہر طرف سے سمٹ کے دہلی میں جمع ہوئے تھے اور ظفر شاہ کو ہندوستان کا شہنشاہ بنایا تھا ویسے ہی الہ آباد و فیض آباد کے باغی مئی ۱۸۵۷ء میں جوش و خروش کے ساتھ لکھنؤ پہونچے۔ اُنکے آتے ہی یہاں کے بھی ہمت سے بیفکرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور شاہی خاندان اودھ کا اور کوئی رکن نہ ملا تو واجد علی شاہ کے ایک دس برس کے نابالغ بچے مرزا برجیس قدر کو تخت پر بٹھا دیا۔ اور اُن کی ماں نواب حضرت محل سلطنت کی مختار کل بنیں۔ تھوڑی سی انگریزی فوج جو یہاں موجود تھی اور اُسکے ساتھ یہاں کے تمام یورپین عہدہ داران مملکت جو باغیوں کے ہاتھ سے جان بر ہو سکے بیلی گارد میں قلعہ بند ہو گئے۔ جس کے گرد باغیوں کے پہونچنے سے پہلے ہی دھس بنا لیے گئے تھے۔ اور حفاظت و بسر کا کافی بندوبست کر لیا گیا تھا۔ غنیمت ہوا یا یہ کہیے کہ قسمت اچھی تھی کہ واجد علی شاہ لکھنؤ سے جا چکے تھے۔ ورنہ وہی خواہ مخواہ بادشاہ بنائے جاتے۔ ان کا حشر ظفر شاہ سے بھی بدتر ہوتا۔ اور اودھ کے پریشان بختوں کو ذرا

پہنچنے کے لیے مٹیا برج کے دربار کا جو ایک عارضی سہارا مل گیا تھا یہ بھی نہ نصیب ہوتا۔

اب لکھنؤ مین انگریزون کی باغی فوج کے علاوہ اودھ کے اکثر زمیندار و تعلقدار اور عہد شاہی کے برطرف شدہ سپاہی کثرت سے جمع تھے۔ اور اُن مین شہر کے بہت سے اوباشون اور ہر طبقے کے لوگون کا طوفان بے تمیزی بھی شریک ہو گیا تھا معلوم ہوتا تھا کہ تھوڑے سے انگریزون پر ایک خدائی کا نرغہ ہے۔ مگر فرق یہ تھا کہ محاصرہ کرنے والون مین سوا اوباش اہل شہر اور بے اصول و خود سر مدعیان شجاعت کے ایک بھی ایسا شخص نہ تھا جو اصول جنگ سے واقف ہو۔ اور تمام منتشر قوتون کو یکجا کر کے ایک باضابطہ فوج بنا سکے۔ بخلاف اسکے انگریز اپنی جان پہ کھیل کے اپنی حفاظت کرتے سر ہتھیلی پر لیے حملہ آورون کو روکتے تھے۔ اور جدید اصول جنگ سے بخوبی واقف تھے۔

اب لکھنؤ مین برجیس قدر کا زمانہ اور حضرت محل کی حکومت تھی۔ برجیس قدر کے نام کا سکہ جاری ہوا۔ عہدہ داران سلطنت مقرر ہوے۔ ملک سے تحصیل وصول ہونے لگی۔ اور صرف تفنن طبع کے طور پر محاصرے کی کارروائی بھی جاری تھی۔ لوگ حضرت محل کی مستعدی و نیک نفسی کی تعریف کرتے ہین۔ وہ سپاہیون کی نہایت قدر کرتی اور اُن کے کام اور حوصلے سے زیادہ انعام دیتی تھین۔ مگر اس کا کیا علاج کہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہ خود پردے سے نکل کے فوج کی سپہ سالاری کرتین۔ مشیر اچھے نہ تھے اور سپاہی کام کے نہ تھے۔ ہر شخص غرض کا بندہ تھا۔ اور کوئی کسی کا کہنا نہ مانتا تھا۔ انگریزی فوج کے باغی اس غرور مین تھے کہ یہ فقط ہمارے دم کا ظہور ہے۔ اصلی حاکم ہم ہی ہین۔ اور جسکے سر پہ جُوتا رکھ دین وہی بادشاہ ہو جائے۔ احمد اللہ نام ایک شاہ صاحب جو فیض آباد کے باغیون کے ساتھ آئے تھے اور کئی معرکون مین لڑ چکے تھے وہ الگ اپنا رعب جما رہے تھے۔ بلکہ خود اپنی حکومت قائم کرنا چاہتے تھے۔ برجیس قدر کے مقابل لکھنؤ ہی مین اُن کا دربار الگ قائم تھا اور دونون درباروں مین پولٹیکل اختلاف کے ساتھ شیعہ سُنّی کا جھگڑا اور تعصب بھی نمایان ہونے لگا۔ غرض بادشاہ اور شاہ صاحب مین رقابت بڑھتی جاتی تھی۔ آخر اسی سال نومبر کے مہینے مین برجیس قدر کی تخت نشینی کو چھ ہی سات مہینے ہوے تھے کہ انگریزی

فوج لکھنؤ پر تسلط حاصل کرنے کے لیے آ گئی ۔ جسکے ساتھ پنجاب کے سکھ اور بھوٹان کے پہاڑی بھی تھے ۔ اور کہا جاتا ہے کہ انھین لوگون نے زیادہ مظالم کیے ۔ دو ہی تین دن کی گولہ باری مین نئی سلطنت کا جو نقش قائم ہوا تھا کڑی کے جالے کی طرح ٹوٹ کے رہ گیا ۔ ہزارہا مفرورین کے ساتھ حضرت محل اور برجیس قدر نیپال کی طرف بھاگ گئے ۔ شاہ صاحب نے دو تین دن لڑ لڑ کے اگرچہ برجیس قدر کے لیے آزادی سے بھاگنے کا موقع پیدا کر دیا مگر خود اپنی جان نہ بچا سکے ۔ شکست کھا کے بھاگے باڑی اور محمدی ہوتے ہوے پوائین مین پہونچے ۔ وہان کسی نے گولی مار دی ۔ پوائین کے راجہ نے سر کاٹ کے انگریزون کے پاس بھیجا اور صلے مین انعام و جاگیر پائی ۔

آبادی کو باغیون سے صاف کرنے کے لیے انگریزون نے شہر مین سخت گولہ باری کی ۔ ساری رعایا گھبرا اُٹھی ۔ زن و مرد گھر چھوڑ چھوڑ کے بھاگے ۔ اور ایک ایسی قیامت بپا ہو گئی کہ جن لوگون نے دیکھا ہے آج تک یاد کر کے کانپ جاتے ہین ۔ محلون کی بیٹھنے والیان جن کی صورت کبھی آفتاب تک نے نہ دیکھی تھی برہنہ پا جنگلون کی خاک چھانتی پھرتی تھین ۔ بیکسی مین ایک ایک کا دامن پکڑتی تھین ۔ اور جو ملتا تھا دشمن ہی ملتا تھا ۔ اور سعدی کا یہ مصرعہ پوری طرح صادق آ رہا تھا کہ "یاران فراموش کردند عشق" ۔ اسی حالت مین فتحیاب فوج نے شہر کو لوٹا ۔ اور بعد خرابی بصرہ خدا خدا کر کے لوگون کو پھر اپنے گھرون مین آنے کی اجازت ملی ۔ اب ایک تہلکہ کے بعد جو امن قائم ہوا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج تک قائم اور روز بروز ترقی کرتا جاتا ہے ۔ لیکن پرانی دولت کے وابستگان دامن اور اعزائے شاہی جو انقلاب سلطنت کے بعد بالکل بیکار ہو گئے اور نئی سلطنت سے فائدہ اُٹھانے کی لیاقت نہ رکھتے تھے مٹتے ہی چلے گئے ۔ چنانچہ بڑے بڑے دولتمند اور معزز گھرانون کے پامال و تباہ ہونے کا سلسلہ مدت تک برابر جاری رہا ۔ محلے کے محلے اُجڑتے چلے جاتے تھے ۔ اور خاندان کے بعد خاندان مٹ رہا تھا ۔ اور اکثر لوگون کو یقین ہو گیا تھا کہ چند روز کے بعد لکھنؤ کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا ۔ لیکن انجام مین سرکار انگریزی کی وہ تدبیرین جنھون نے ساری دنیا مین انگریزون کی نوآبادیان قائم کرا دی ہین غالب

آئین اور لکھنؤ حوادث زمانہ کی دست برد سے بچ کے پڑتا۔ جن کو مٹنا تھا مٹ گئے اور جو باقی رہے سنبھلنے کے قابل ہو گئے۔ اور اگر مسٹر ٹبلر کے ایسے چند اور حاکم لکھنؤ کو مل گئے تو اُمید ہے کہ آیندہ بہت ترقی کرے گا۔

ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ اسی سلسلۂ واقعات میں ہم واجد علی شاہ کی باقیماندہ زندگی اور اُنکے قیام کلکتہ کے حالات بھی اپنے ناظرین کے سامنے پیش کر دین۔ کیونکہ بغیر اس کے اس تاریخ کا تکملہ نہین ہو سکتا۔ کلکتے مین خود ہمارا بچپن بادشاہ کے ظل حمایت مین بسر ہوا ہے۔ اور گذشتہ واقعات کے حالات اگرچہ ہم نے لوگون سے سُن کے اور اوراق تاریخ مین پڑھ کے بیان کیے ہین تو آیندہ اکثر چشم دید حالات بیان کرین گے۔

کلکتے سے تین چار میل کی مسافت پر جنوب کی طرف دریاے بھاگا رتی (ہوگلی) کے کنارے "گارڈن ریچ" نام ایک خاموش محلہ ہے۔ اور چونکہ وہان ایک مٹی کا تودہ سا تھا اس لیے عام لوگ اُسے مٹیا برج کہتے تھے۔ یہان کئی عالیشان کوٹھیان تھین جن کی زمین دریا کے کنارے کنارے تقریباً دو ڈھائی میل تک چلی گئی ہے جب واجد علی شاہ کلکتے مین پہونچے تو گورنمنٹ آف انڈیا نے یہ کوٹھیان اُنھین دیدین۔ دو خاص بادشاہ کے لیے۔ ایک نواب خاص محل کے واسطے اور ایک علی نقی خان کی سکونت کے لیے جو بادشاہ کے ساتھ تھے۔ اور ان کے گرد زمین کا ایک بڑا قطعہ جو عرض مین دریا کنارے سے تقریباً میل ڈیڑھ میل تک چلا گیا تھا اور اُس کا حلقہ چھ سات میل سے کم نہ ہوگا بادشاہ کو اپنے اور اپنے ملازمین کے قیام کے لیے دیا گیا۔ میونسپلٹی کی سڑک اس رقبے کو طولاً قطع کرتی تھی۔ وہ دو کوٹھیان جو بادشاہ کو دی گئی تھین اُنکے نام بادشاہ نے سلطان خانہ اور اسد منزل قرار دیے۔ اور نواب خاص محل کی کوٹھی پر بھی جب بادشاہ نے قبضہ کر لیا تو اُس کا نام مرصّع منزل رکھا۔ اور علی نقی خان کی کوٹھی آخر تک اُنھین کے قبضے مین اور اُن کے بعد اُن کی اولاد خصوصاً نواب اختر محل کے قبضے مین رہی جو علی نقی خان کی بیٹی اور بادشاہ کی ممتاز بی بی بلکہ اُن کے دوسرے ولی عہد مرزا خوش بخت بہادر کی مان تھین۔

غدر کے زمانے میں انگریزی فوج کے باغی افسروں نے ارادہ کیا کہ اگر بادشاہ اُنکے حکمران بنیں تو وہ کلکتے میں بھی غدر کر دیں۔ مگر بادشاہ نے گورنمنٹ آف انڈیا کے معاملے میں یہ روش نہ تخت وتاج سے جدا ہوتے وقت اختیار کی تھی اور نہ اب پسند کی۔ بلکہ لاٹ صاحب کو اُن لوگوں کے ارادے کی اطلاع کر دی۔ جسپر اُن کا شکریہ ادا کیا گیا۔ مگر دو ہی چار روز بعد مناسب سمجھا گیا کہ بادشاہ کو قلعۂ فورٹ ولیم میں رکھا جائے تاکہ پھر کبھی باغیوں کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے۔ لندن میں اُنکی جانب سے جو مقدمہ پیش تھا وہ اس بنا پر ملتوی کر دیا گیا کہ جس ملک کے لیے یہ دعویٰ ہے وہ اب ہمارے قبضے ہی میں نہیں جب اُسپر پھر دولت برطانیہ کا قبضہ ہوئے گا تب دیکھا جائے گا۔

بادشاہ اس حراست ہی میں تھے کہ لکھنؤ کا غدر فرو ہو گیا۔ اور مسیح الدین خان نے جو لندن میں بادشاہ کے مختارعام تھے پھر اپنا دعویٰ پیش کیا۔ اُنھیں بادی النظر میں کامیابی اور استرداد سلطنت کی پوری امید تھی۔ مگر بدقسمتی سے اُن لوگوں میں جو قلعے میں بادشاہ کے مشیر اور مصاحب تھے خواہ کسی بیرونی تحریک سے یا خود اپنے نفع کے خیال سے ایک سازش ہوئی۔ ان لوگوں نے خیال کیا کہ اگر مسیح الدین خان مقدمہ جیت گئے تو ہمارا بازار سرد پڑ جائے گا اور وہی وہ رہ جائینگے لہذا سب نے بادشاہ کو سمجھانا شروع کیا کہ "جہان پناہ بھلا کبھی کسی نے ملک لے کے دیا ہے؟ مسیح الدین خان نے حضور کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ ہونا ہوانا کچھ نہیں ہے۔ اور جہان پناہ مفت میں تکلیف اُٹھا رہے ہیں۔ ڈیڑھ دو سال سے تنخواہ نہیں لی ہے۔ ہر بات کی تنگی ہے۔ اور ہم ملازمان دولت بھی پیسے پیسے کو محتاج ہیں۔ مناسب یہ ہے کہ حضور گورنمنٹ انگریزی کی تجویز دن کو قبول کر لیں۔ اور تنخواہ وصول کر کے اطمینان و فارغ البالی سے اپنے محلات عالیات، اور آستانۂ بوسان دولت کے ساتھ بسر فرمائیں۔" بادشاہ کو خرچ کی تنگی تھی۔ اور بادشاہ سے زیادہ اُن کے رفقا پریشان تھے۔ مصاحبوں نے جب بار بار یہ تجویز پیش کی تو بلا تکلف حضور وئسیرائے کی خدمت میں لکھ بھیجا "مجھے سرکار انگریزی کی مجوزہ ماہوار لینا منظور ہے۔ لہذا میری اس وقت تک کی تنخواہ دی جائے۔ اور مقدمہ جو لندن

مین داخل ہے خارج کیا جائے۔" جواب ملا " اب آپ کو اول تو گذشتہ ایام کی ماہوارہ دی جائے گی - صرف اسی وقت سے ماہوار جاری ہو گی - دوسرے فقط بارہ لاکھ روپیہ سالانہ دیے جائین گے - اور جو تین لاکھ روپیہ سالانہ آپ کے ملازمین کے لیے تجویز کیے گئے تھے اب اُن کے دینے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی"

بظن غالب بادشاہ اس نقصان کو گوارا نہ کرتے - مگر مصاحبون نے اس پر بھی راضی کر دیا - اور گورنمنٹ آف انڈیا نے انگلستان مین اطلاع دی کہ واجد علی شاہ نے گورنمنٹ کی تجویز کو منظور کر لیا - لہذا اُن کا مقدمہ خارج کیا جائے - یہ واقعات مین نے خود اپنے نانا منشی قمرالدین صاحب کی زبان سے سُنے ہین - جو جناب عالیہ کے ہمراہی دفتر کے میر منشی اور مولوی مسیح الدین خان کے نائب خاص تھے - اور کل کارروائیان اُنھین کے ہاتھ سے عمل مین آتی تھین بادشاہ کے ماہوار پر راضی ہو جانے کی خبر جیسے ہی لندن مین پہونچی مسیح الدین خان کے حواس جاتے رہے - بادشاہ کی ماں - اُنکے بھائی - اور ولیعہد نے سر پیٹ لیا - اور حیران تھے کہ یہ کیا غضب ہو گیا - افسوس اس وقت تک کا سب کیا دھرا خاک مین ملا جاتا ہے - آخر مسیح الدین خان نے سوچتے سوچتے ایک بات پیدا کی - اور پارلیمنٹ مین یہ قانونی عذر پیش کیا کہ " بادشاہ فی الحال گورنمنٹ آف انڈیا کی حراست مین ہین اور ایسی حالت مین اُنکی کوئی تحریر پایۂ اعتبار کو نہین پہونچ سکتی" - عذر معقول تھا - تسلیم کیا گیا - اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بادشاہ کے مختار کی عذرداری سے مطلع کیا گیا - ساتھ مین مسیح الدین خان اور تمام ارکان خاندان شاہی نے بادشاہ کو لکھا کہ " یہ آپ کیا غضب کر رہے ہین ہمین ملک اودھ کے واپس ملنے کی پوری اُمید ہے" اب غدر فرو ہو چکا تھا - گورنمنٹ نے بادشاہ کو چھوڑ دیا - اور وہ خوشی خوشی قلعے سے نکل کے مٹیا برج مین آئے - اور آزادی حاصل ہوئی ہی تھی کہ مصاحبون نے عرض کیا " حضور! مسیح الدین خان لندن مین یہ کہ رہے ہین کہ جہان پناہ نے تنخواہ لینے کو صرف قید ہونے کی وجہ سے منظور کر لیا ہے" یہ سنتے ہی بادشاہ نے برافروختہ ہو کے اُسی وقت لکھ بھیجا کہ " ہم نے آزادی سے بہ رضا و رغبت گورنمنٹ کی تجویز کو منظور

کیا ہے۔ اور مسیح الدین خان کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ ہم نے قید مین ہوتے یا کسی جبر و اکراہ کی وجہ سے منظوری دی ہے۔ لہٰذا ہم آیندہ کے لیے اُس مختار نامے ہی کو منسوخ کیے دیتے ہین جس کی رُو سے وہ ہمارے مختار عام بنائے گئے ہین "

اب کیا تھا؟ ساری کارروائی ختم ہو گئی۔ بادشاہ مٹیا برج مین رنگ رلیان منانے لگے۔ مصاحبون کے گھرون مین ہُن برسنے لگا۔ اور شاہی خاندان کا شکستہ حال قافلہ جو انگلستان مین پڑا ہوا تھا۔ قریب قریب وہین تباہ ہو گیا۔ اکثر ہمراہیون نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بادشاہ کی مان جناب عالیہ اس صدمے سے بیمار ہو گئین۔ اور اُسی بیماری مین چلین کہ ملک فرانس سے ہوتی ہوئی مقامات متبرکہ مین جائین۔ اور انکی زیارت سے شرفیاب ہو کے کلکتے پہونچین۔ مگر موت نے پیرس سے آگے قدم نہ بڑھانے دیا۔ وہین انتقال کیا۔ اور عثمانی سفارت خانۂ فرانس کی مسجد کے متصل مسلمانون کا ایک قبرستان ہے اُسی مین دفن ہوئین۔ مرزا سکندر حشمت کو مان کے مرنے کا اس قدر صدمہ ہوا کہ مان کے مرتے ہی خود بھی بیمار پڑ گئے۔ اور مان کے چودہ پندرہ روز بعد وہ بھی مان کے برابر یوم جزا کا انتظار کرنے کے لیے لٹا دیے گئے۔ اکیلے مرزا ولی عہد بہادر کلکتہ واپس آکے ماں باپ سے ملے۔

کہتے ہین کہ ابتداءً مٹیا برج مین بھی بادشاہ کی زندگی نہایت ہی بیدار مغزی اور ہوشیاری کی تھی۔ یہ حالت دیکھ کے گرد و پیش کے لوگون نے چند آلات موسیقی فراہم کر دیے۔ فوراً سرو دبستان یاد دہانیدن کا پورا پورا مضمون صادق آگیا۔ اور ارباب نشاط کا گروہ وہان بھی جمع ہونے لگا۔ ہندوستان کے اچھے اچھے گویئے آکے ملازم ہوے اور مٹیا برُج مین موسیقی دانون کا ایسا مجمع ہو گیا تھا کہ اور کسی جگہ نہ تھا۔

خوبصورت عورتون کے جمع کرنے اور حسن و عشق کے کرشمون مین پھنسے رہنے کا وہان بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا کہ لکھنؤ مین سنا جاتا ہے۔ مگر مٹیا برج مین اس شوق مین مذہبی احتیاط کا پورا لحاظ رہتا۔ بادشاہ شیعہ تھے۔ اور شیعون کی شرع مین متعہ بغیر کسی تحدید اور روک کے جائز ہے۔ اس مذہبی آزادی سے فائدہ اُٹھا کے بادشاہ جی بھر کے اپنا شوق پورا کر لیتے۔ اور قاعدہ تھا کہ غیر ممتوعہ عورت کی صورت

تک دیکھنا گوارا نہ کرتے - یہ احتیاط اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایک جوان
بہشتن جو بادشاہ کے سامنے زنانے مین پانی لاتی اُس سے بھی متعہ کرکے اُسے
نواب آب رسان بیگم کا خطاب دے دیا - ایک جوان خاکروبن جس کی حضوری
مین آمد و رفت رہتی وہ بھی ممتوعات مین داخل ہوکے نواب مصفا بیگم کے خطاب
سے سرفراز ہوتی - اسی طرح موسیقی کا شوق بھی ممتوعات ہی تک محدود رہتا - شاید
شاذ و نادر ہی اس کا اتفاق ہوا ہوگا کہ بادشاہ نے کبھی کسی بازاری طوائف کا
مجرا دیکھا ہو - خود ممتوعات کی مختلف پارٹیان بنادی گئی تھین جن کو مختلف طرز پر
رقص و سرود کی تعلیمین دی جاتین - ایک رادھا منزل والیان - ایک جھومر
والیان - ایک لٹکن والیان - ایک ساردھا منزل والیان - ایک نتھ والیان -
ایک گھونگھٹ والیان - ایک رہس والیان - ایک نقل والیان - اور اسی طرح
کے بیسیون گروہ تھے جن کو رقص و سرود کی اعلیٰ تعلیم دی گئی تھی - اور انھین کے
ناچ گانے مین اُن کا دل بہلتا - ان سب سے متعہ ہو گیا تھا - بیگمین کہلاتی تھین -
اور دو ایک گروہون مین اگر چند کمسن و نابالغ لڑکیان غیر ممتوعہ تھین تو اس لیے
تھین کہ بعد بلوغ داخل ممتوعات کرلی جائین گی - ان مین سے اکثر خود بادشاہ
کے قریب خاص سلطان خانے مین رہتین - اور بعض کو دوسری کوٹھیون مین جدا
محلسرائین ملی تھین - ان ممتوعات مین سے جو صاحب اولاد ہو جاتین اُن کو
محل کا خطاب دیا جاتا - رہنے کو جداگانہ محلسرا ملتی - اور اُن کی تنخواہ اور عزت
بڑھ جاتی -

اس سے صاف ظاہر ہے کہ موسیقی کے سوا اور تمام حیثیتون سے بادشاہ بڑے
متقی و پرہیزگار اور پابند شرع تھے - نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی - تیسون روزے
رکھتے تھے - افیون - شراب - فلک سیر - یا اور کسی قسم کے نشے سے زندگی بھر احتراز
رہا - اور محرم کی عزاداری نہایت ہی خلوص عقیدت سے بجا لاتے تھے -

تیسرا شوق اُنھین عمارت کا تھا - سلطان خانہ کے گرد بیسیون محلسرائین تعمیر
ہو گئین - اور بہت سی نئی کوٹھیان اور اُن مین محلسرائین بنین - گورنمنٹ سے
صرف سلطان خانہ - اسد منزل - اور مرصع منزل ملی تھین - مگر بادشاہ کے شوق

نے چند ہی روز مین بیبیون کو ٹھیان تعمیر کرا دین جن کے گرد نہایت ہی پرفضا باغ اور فرحت بخش چمن تھے - جس وقت مین نے دیکھا ہے بادشاہ کے قبضے مین مندرجہ ذیل عالیشان کوٹھیان تھین جو جنوب سے شمال تک ترتیب وار چلی گئی تھین - سلطان خانہ - قصر البیضا - گوشۂ سلطانی - شہنشاہ منزل - مرصع منزل - اسد منزل - شاہ منزل - نور منزل - تفریح بخش - بادامی - آسمانی - تہنیت منزل - قصر سلطانی - سعد سلطانی - عدالت منزل - ان کے علاوہ اور بھی کئی کوٹھیان تھین جن کے نام مجھے یاد نہین رہے -

ان کے ماسوا باغون کے اندر تالابون کے کنارے بہت سے کمرے - بنگلے - اور چھوٹی چھوٹی کوشکین تھین - ان تمام کوٹھیون - متفرق کمرون - بنگلون اور کوشکون مین صاف ستھرا - پُر تکلف فرش بچھا رہتا - چاندی کے پلنگ بچھونون اور تکیون سے مکمل لگے رہتے - تصویرین اور طرح طرح کا فرنیچر آراستہ ہوتا - اور محض پرورش کے خیال سے ضرورت سے زیادہ مکاندار مقرر تھے جو روز جھاڑتے اور ہر چیز کو صفائی اور قرینے سے آراستہ رکھتے - غرض ہر کوٹھی بجائے خود اس قدر آراستہ و پیراستہ نظر آتی کہ انسان عش عش کرجاتا - کوٹھیون کے گرد کے باغ اور چمن ایسی ہندسی ترتیبون اور اقلیدس کی شکلون کے مطابق بنائے گئے تھے کہ دیکھنے والون کو بادشاہ کی مناسبت طبعی پر تعجب ہوتا -

لکھنؤ مین تو بادشاہ نے صرف قیصر باغ اور اُس کے پاس کی چند عمارتین یا اپنے والد مرحوم کا امام باڑہ اور مقبرہ ہی تعمیر کیا تھا مگر مٹیا برج مین نفیس اور اعلیٰ عمارتون کا ایک خوبصورت شہر بسا دیا تھا - دریا کے اُس پار مٹیا برج کے عین مقابل کلکتے کا مشہور بوٹنیکل گارڈن ہے - مگر وہ مٹیا برج کی دنیوی جنت اور اُس کے دلکش عجائبات کے سامنے مٹ گیا تھا - ان تمام عمارتون - چمنون - کنجون - اور وسیع و نزہت بخش مرغزارون کے گرد بلند دیوارون کا احاطہ تھا مگر میونسپلٹی کی شاہراہ عام کے کنارے کنارے تقریباً ایک میل تک شاندار دُکانین تھین اور اُن مین وہی ادنیٰ درجے کے ملازمین رہنے پاتے تھے جن کو اپنے فرائض کے لحاظ سے وہان رہنے کی ضرورت تھی - مگر اندر جانے کا راستہ

سوا پھاٹکون کے جن پر پہرہ رہتا کسی دکان مین سے نہین رکھا گیا تھا۔ خاص سلطان خانے کے پھاٹک پر نہایت عالیشان نوبت خانہ تھا۔ نقارچی نوبت بجاتے۔ اور پُرانے پہرون اور گھڑیون ہی کے حساب سے شب وروز گھڑیال بجا کرتا۔

دنیا مین عمارت کے شوقین ہزارون بادشاہ گذرے ہین۔ مگر غالباً اپنی ذات سے کسی تاجدار نے اتنی عمارتین اور اتنے باغ نہ بنوائے ہونگے جتنے کہ واجدعلی شاہ نے اپنی ناکام زندگی اور برائے نام شاہی کے مختصر زمانے مین بنائے۔ شاہجہان کے بعد اس بارۂ خاص مین اگر کسی کا نام لیا جا سکتا ہے تو وہ اسی ستم زدہ شاہ اودھ کا نام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی خاص عمارت سیکڑون ہزارون سال تک باقی رہی اور کسی کی صدہا عمارتین زمانے نے چندہی روز مین مٹا کے رکھدین۔

عمارت کے علاوہ بادشاہ کو جانورون کا شوق تھا۔ اور اس شوق کو بھی اُنھون نے اس درجے تک پہونچا دیا کہ دنیا اُس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ اور شاید کوئی شخصی کوشش آج تک اُس کے نصف درجے کو بھی نہ پہونچ سکی ہوگی۔

نور منزل کے سامنے خوشنما آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا۔ جس مین صدہا چیتل۔ ہرن۔ اور وحشی چوپائے چھوٹے پھرتے تھے۔ اسی کے درمیان سنگ مرمر کا ایک پختہ تالاب تھا جو ہر وقت لبالب رہتا۔ اور اُس مین شتر مرغ۔ کٹھوری۔ فیل مرغ۔ سارس۔ قازین۔ بگلے۔ قرقرے۔ ہنس۔ مور۔ چکور اور صدہا قسم کے طیور اور کچھوے چھوڑ دیے گئے تھے۔ صفائی کا اس قدر اہتمام تھا کہ مجال کیا جو کہین بیٹ یا کسی جانور کا پر بھی نظر آجائے۔ ایک طرف تالاب کے کنارے کٹہرون مین شیر تھے۔ اور اس رمنے کے پاس ہی سے لکڑی کے سلاخون دار بڑے بڑے جانون کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تھا جس مین بیسیون طرح کے اور خدا جانے کہان کہان کے بندر لاکے جمع کیے گئے تھے جو عجیب عجیب حرکتین کرتے۔ اور انسان کو بغیر اپنا تماشا دکھائے آگے نہ بڑھنے دیتے۔

مختلف جگہ حوضون مین مچھلیان پالی گئی تھین جو اشارے پر جمع ہو جاتین۔ اور کوئی کھانے کی چیز ڈالیے تو اپنی اُچھل کود سے خوب بہار دکھاتین۔ سب پر طرہ یہ کہ شہنشاہ منزل کے سامنے ایک بڑا سا لمبا اور گہرا حوض قائم کرکے اور اُس

کے کناروں کو چاروں طرف سے خوب چکنا کرکے اور آگے کی طرف جھکا کے اُس کے بیچ میں ایک مصنوعی پہاڑ بنایا گیا تھا جس کے اندر سیکڑوں نالیاں دوڑائی گئی تھیں۔ اور اوپر سے دو ایک جگہ کاٹ کے پانی کا چشمہ بھی بہا دیا گیا تھا۔ اس پہاڑ میں ہزاروں بڑے بڑے دو دو تین تین گز کے لمبے سانپ چھوڑ دیے گئے تھے جو برابر دوڑتے اور رینگتے پھرتے۔ پہاڑ کی چوٹی تک چڑھ جاتے اور پھر نیچے اُتر آتے۔ مینڈکیں چھوڑی جاتیں۔ اُنھیں دوڑ دوڑ کے پکڑتے۔ پہاڑ کے گرداگرد نہر کی شان سے ایک نالی تھی۔ اُس میں سانپ لہرا لہرا کے دوڑتے اور مینڈکوں کا تعاقب کرتے۔ اور لوگ بلا کسی خوف کے پاس کھڑے سیر دیکھا کرتے۔ اس پہاڑ کے نیچے بھی دو کٹہرے تھے جن میں دو بڑی بڑی چیتیں رکھی گئی تھیں۔ یوں تو خاموش پڑی رہتیں لیکن جس وقت مرغ لا کے چھوڑا جاتا اُسے جھپٹ کے پکڑتیں اور مسلّم نگل جاتیں۔ سانپوں کے رکھنے کا انتظام اس سے پہلے شاید کہیں نہ کیا گیا ہوگا۔ اور یہ خاص واجد علی شاہ کی ایجاد تھی جسکو یورپ کے سیاح حیرت سے دیکھتے اور اس کی تصویریں اور مشرح کیفیت قلم بند کرتے جاتے تھے۔

مذکورہ جانوروں کے علاوہ ہزارہا طیور کے چہکتے ہوئے برنجی پنجرے خاص سلطان خانے کے اندر تھے۔ بیسیوں بڑے بڑے ہال تھے جو لوہے کے جال سے محفوظ کر دیے گئے تھے اور گنج کہلاتے تھے۔ اُن میں قسم قسم کے طیور کثرت سے لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔ اور اُنکے رہنے اور نشو و نما پانے کا پورا سامان فراہم کیا گیا تھا۔ بادشاہ کی کوشش تھی کہ چرند و پرند میں سے جتنی قسم کے جانور دستیاب ہو سکیں سب جمع کر لیے جائیں۔ اور واقعی ایسا مکمل زندہ عجائب خانہ شاید روے زمین پر کہیں موجود نہ ہوگا۔ اِن جانوروں کی فراہمی میں بے روک روپیہ صرف کیا جاتا۔ اور کوئی شخص کوئی نیا جانور لائے تو مُنہ مانگے دام پاتا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ نے ریشم پرے کبوتروں کا جوڑا چوبیس ہزار روپے کو اور سفید مور کا جوڑا گیارہ ہزار روپئے کو لیا تھا۔ زرافہ جو افریقہ کا بہت بڑا اور نہایت عجیب جانور ہے اُس کا بھی ایک جوڑا موجود تھا۔ دو کوہان کے بغدادی اونٹ ہندوستان میں کہیں نہیں نظر آتے اور بادشاہ کے وہاں تھے۔ کلکتے میں ہاتھی مطلق نہیں ہیں؛

مگر بادشاہ کے اِس زندہ نیچرل ہسٹری میوزیم مین ایک ہاتھی بھی تھا۔ محض اس خیال سے کہ کوئی جانور رہ نہ جائے دو گدھے بھی رہنے مین لا کے چھوڑ دیے گئے تھے۔

درندون مین سے شیر ببر۔ دیسی شیر۔ چیتے۔ تیندوے۔ ریچھ۔ سیاہ گوش۔ چرغ۔ بھیڑیے۔ سب کٹہرون مین بند تھے اور بڑی خاطر داشت سے رکھے جاتے۔

کبوترون کا انتظام دیگر جانورون سے الگ تھا۔ بادشاہ کی مختلف کوٹھیون مین سب ملا کے چوبیس پچیس ہزار کبوتر تھے۔ جن کے اُڑانے مین کبوتر بازون نے بڑے بڑے کمالات دکھائے تھے۔

جانورون پر جو صرف ہو رہا تھا اُس کا ناقص اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ آٹھ سو سے زیادہ جانور باز تھے۔ تین سو کے قریب کبوتر باز تھے۔ اَسّی کے قریب ماہی پرور تھے۔ اور تیس چالیس مار پرور تھے۔ جن کو دس روپیہ ماہوار سے لے کے چھ روپیہ ماہوار تک تنخواہین ملتی تھین۔ افسرون کی تنخواہین تیس سے بیس روپیہ تک تھین۔ اور کبوترون سانپون اور مچھلیون کے علاوہ دیگر جانورون کی خوراک مین کچھ کم نو ہزار روپیہ ماہوار صرف ہوتے تھے۔

عمارت کا کام زیادہ تر مونس الدولہ اور ریحان الدولہ کے سپرد رہا جن کو عمارت کی مد مین تقریباً پچیس ہزار ماہوار ملا کرتے تھے۔

ہزار کے قریب پہرے کے سپاہی تھے جن کی تنخواہین عموماً چھ روپیہ ماہوار تھین۔ بعض بعض آٹھ یا دس روپے بھی پاتے۔ یہی تنخواہ مکان دارون کی تھی جن کا شمار پانچ سو سے زیادہ تھا۔ مالیون کی بھی یہی تنخواہ تھی۔ اور اُن کا شمار بھی پانچ سو سے زیادہ تھا۔ تقریباً اسّی اہل قلم یعنی محرر تھے جو تیس سے دس روپیہ ماہوار تک تنخواہ پاتے تھے۔ معزز مصاحبون اور اعلیٰ عہدہ دارون کا شمار چالیس پچاس سے کم نہ ہوگا جو اٹھاسی روپیہ ماہوار پاتے تھے۔ سو سے زیادہ کہار تھے انکے علاوہ بیسیون چھوٹے چھوٹے محکمے تھے۔ باورچی خانہ۔ آبدارخانہ۔ بھنڈی خانہ۔ خس خانہ۔ اور خدا جانے کیا کیا تھا۔ پھر ایک مد لواحق بیگمات یعنے ممتوعات کے رشتہ دارون اور بھائی بندون کی تھی جنھین حسب حیثیت تنخواہین ملتی تھین۔

ان سب لوگوں نے کوٹھیوں کے احاطے سے باہر زیادہ تر اُسی زمین پر جو بادشاہ کو دی گئی تھی اور بہتوں نے پاس کی دوسری زمینوں پر مکان بنا لیے تھے۔ اور ایک شہر بس گیا تھا جس کی مردم شماری چالیس ہزار سے زیادہ تھی۔ ان سب کی زندگی بادشاہ کی تنخواہ کے ایک لاکھ روپیہ ماہوار سے وابستہ تھی۔ اور کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اتنی خلقت عظیم اس تھوڑی سی رقم میں کیونکر زندگی بسر کر لیتی ہے۔ بنگالہ کے عوام میں یہ مشہور تھا کہ بادشاہ کے پاس پارس پتھر ہے۔ جب ضرورت ہوتی ہے لوہے یا تانبے کو اُس میں رگڑ کے سونا بنا لیا کرتے ہیں۔

حقیقت حال یہ ہے کہ بادشاہ کے قیام سے کلکتے کے پڑوس میں ایک دوسرا لکھنؤ آباد ہو گیا تھا۔ اصلی لکھنؤ مٹ گیا تھا اور اُس کی منتخب صحبت مٹیا بُرج میں چلی گئی تھی۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُن دنوں لکھنؤ لکھنؤ نہیں رہا تھا مٹیا برج لکھنؤ تھا۔ یہی چہل پہل تھی۔ یہی زبان تھی۔ یہی شاعری تھی۔ یہی صحبتیں اور بذلہ سنجیاں تھیں۔ یہیں کے علما و اتقیا تھے۔ یہیں کے امرا و رؤسا تھے۔ اور یہیں کے عوام تھے۔ کسی کو نظر ہی نہ آتا تھا کہ ہم بنگالے میں ہیں۔ یہی پتنگ بازیاں تھیں۔ یہی مرغ بازیاں تھیں۔ یہی بٹیر بازیاں تھیں۔ یہی افیونی تھے۔ یہی داستان گوئی تھی۔ یہی تعزیہ داری تھی۔ یہی مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی تھی۔ یہی امام باڑے تھے۔ اور یہی کربلا تھی۔ بلکہ جس جلوس اور شان و شوکت سے بادشاہ کی ضریح اُٹھتی تھی لکھنؤ میں عہد شاہی میں شاید اُٹھ سکی ہو۔ غدر کے بعد تو کبھی کوئی تعزیہ نہیں اُٹھ سکا۔ کلکتے کی ہزارہا خلقت اور انگریز تک زیارت کو مٹیا بُرج میں آ جاتے تھے۔

بادشاہ اگرچہ شیعہ تھے مگر مزاج میں مطلق تعصب نہ تھا۔ اُن کا پرانا مقولہ تھا کہ "میری دو آنکھوں میں سے ایک شیعہ ہے اور ایک سُنّی ہے"۔ ایک بار دو شخصوں میں مذہبی اختلاف پر مارپیٹ ہو گئی۔ بادشاہ نے دونوں کی معزولی کا حکم دیا۔ بلکہ اپنے وہاں ممنوع الملازمۃ کر دیا اور فرمایا "ایسے لوگوں کا میرے یہاں گذر نہیں ہو سکتا"۔ آخر آخر میں بادشاہ کی ایک کتاب میں بعض ایسے ناگوار الفاظ چھپ گئے تھے جن پر کلکتے کے سُنّیوں میں بڑی شورش ہوئی۔ مگر

اس سے لوگ واقف نہیں ہیں کہ وہ الفاظ اصل کتاب میں نہیں بلکہ دوسروں کی تاریخ یا تقریظ میں تھے۔ اور بادشاہ کو جیسے ہی اطلاع ہوئی بغیر کسی تحریک کے معافی مانگنے کو تیار ہو گئے۔ بے تعصبی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہوگا کہ سارا انتظامی کاروبار سُنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وزیر اعظم منفرم الدولہ بہادر سُنی تھے۔ منشی السلطان جو ایک زمانے میں سب سے زیادہ مقرب اور سارے جانور خانے۔ کُل اہل قلم۔ اور کئی اور محکموں کے افسر اعلیٰ تھے سُنی تھے۔ بخشی امانت الدولہ بہادر جن کے ہاتھ سے کُل ملازموں حتیٰ کہ محلوں اور شاہزادوں تک کو تنخواہ ملتی تھی سُنی تھے۔ عطارد الدولہ اور داروغہ معتبر علی خان جو آخر میں سب سے بڑے عہدہ دار اور کُل کاروبار کے مالک تھے دونوں سُنی تھے۔ اس سے بڑھ کے کیا ہوگا کہ امام باڑہ سبطین آباد کا اور محل کے خاص امام باڑے بیت البکا کا انتظام اور مجلسوں اور مذہبی تقریبوں کے بجا لانے کا انصرام بھی سُنیوں ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہاں کبھی کسی نے اس کو محسوس ہی نہیں کیا کہ کون سُنی ہے اور کون شیعہ ہے۔

مٹیا برج کے دکاندار اور مہاجن تک لکھنؤ کے تھے۔ اور لکھنؤ کی کوئی چیز نہ تھی جو مکمل ترین صورت میں وہاں موجود نہ ہو۔ جدھر گذر جایئے ایک عجیب رونق اور چہل پہل نظر آتی۔ اور اُس لطف میں لوگ اس قدر محو اور مست و از خود رفتہ ہو رہے تھے کہ کسی کو انجام کی خبر ہی نہ تھی۔ عمارات شاہی اور زمنہ وغیرہ کے اندر جانے کی اہل لکھنؤ جملہ ملازمین بلکہ ساکنین مٹیا برج کو عام آزادی حاصل تھی۔ باغوں میں پھر لیے تو اُس سے زیادہ پُر فضا مقام کہیں نصیب نہ ہو سکتا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہو جایئے تو عجب لطف نظر آتا۔ کلکتے کو آنے جانے والے جہاز سامنے سے ہو کے گذرتے۔ جو فورٹ ولیم کی سلامی کے لیے یہیں سے اپنی جھنڈیاں اُتارنا شروع کر دیتے۔ اور لوگ سمجھتے کہ بادشاہ کی سلامی لے رہے ہیں۔ محلات کی ڈیوڑھیوں اور محلسراؤں کے دروازوں پر کھڑے ہو جایئے تو عجب لطف کی دھوم دھام میں کبھی کبھی ایسی صورتیں نظر آ جاتیں اور ایسی فصیح و دلکش زبان اور ایسی مزے مزے کی پیاری باتیں سننے میں

آ جاتیں کہ انسان دو تین بلکہ زندگی بھر مزہ لیا کرتا۔

آہ! یہ خوبصورت اور دلفریب نقش تو مٹنے کے قابل نہ تھا۔ اگر ہائے زمانے نے مٹا ہی دیا۔ اور ایسا مٹایا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ۱۳۱۶ھ ہجری (۱۸۹۸ء) میں یکایک بادشاہ کی آنکھ بند ہوئی اور معلوم ہوا کہ "خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا" سب باتیں خواب و خیال تھیں۔ ایک طلسم تھا کہ یکایک ٹوٹ گیا۔ اور وہ خوبصورت بقعہ جس کی زیارت کی تمنا یورپ کے سلاطین اور ہندوستان کے والیان ملک کو رہا کرتی تھی آج ایک دشتستان فنا اور عبرت کدہ ہے۔ جہاں کچھ بھی نہیں۔ جس نے اس اگلے رنگ کو کبھی دیکھا تھا اب وہاں کے سناٹے کو دیکھ کے سوا اس کے کہ کمال حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے کہے "رہے نام اللہ کا!" اور کیا کر سکتا ہے؟

(۹)

اس دربار کے فرمان رواؤں کی تاریخ میں سے اب صرف اس قدر بتانا باقی ہے کہ مرزا برجیس قدر بہادر لکھنؤ سے بھاگے تو سرحد نیپال پر دم لیا۔ ہمراہ رکاب تقریباً ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع تھا۔ ان لوگوں نے ارادہ کیا کہ ہمالیہ کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو جائیں۔ اور جب موقع ملے نکل کے انگریزوں پر حملہ کریں۔ فتح ہو تو اپنے وطن پہونچیں۔ شکست ہو تو پھر بھاگ کے پہاڑوں میں ہو رہیں۔ مگر یہ نبھنے والی صورت نہ تھی۔ ریاست نیپال نہ اتنے آدمیوں کو اپنے وہاں پناہ دے سکتی تھی اور نہ اُنکے لیے انگریزوں سے لڑ سکتی تھی۔ اُس میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انگریزوں کا مقابلہ کرتی۔ لہذا حکومت نیپال نے صرف مرزا برجیس قدر اور اُن کی ماں کو تو پناہ دے دی۔ مگر اُنکے ہمراہی طوفان بے تمیزی کو قطعی حکم دے دیا کہ فوراً واپس جائیں۔ اور نہ جائیں تو مار کے نکال دیے جائیں۔ نیپال کی قلمرو فوراً ان سے خالی کرا لی جائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سب کے سب وہاں سے نکل نکل کے بھاگے۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھیس بدل بدل کے کسی طرف نکل گئے۔ اور مرزا برجیس قدر مع اپنی والدہ کے خاص نیپال میں جا کے سکونت پذیر ہو گئے۔ دربار نیپال سے اُنکے لیے کچھ معمولی وظیفہ مقرر ہو گیا

اور کہتے ہین اُن کے ساتھ جس قدر جواہرات تھا سب دولت نیپال کی نذر ہو۔ آخر حضرت محل وہین پیوند زمین ہوئین۔ اور اُن کے بعد ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی کے موقع پر دولت برطانیہ نے مرزا برجیس قدر کا قصور معاف کر دیا۔ اُنھین واپس آنے کی اجازت ملی تو بغیر کسی کو اطلاع دیے نیپال سے بھاگ کے کلکتے پہونچے یہان واجد علی شاہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بحیثیت اولاد اکبر مرزا قمر قدر سب سے زیادہ تنخواہ پا رہے تھے۔ برجیس قدر نے دعوے کیا کہ بادشاہ کے تمام بیٹون سے زیادہ معزز و مستحق مین ہون۔ از روے قانون پنشن بادشاہ کی پنشن مین سے ایک ثلث گھٹا کے باقی تنخواہ مجھ پر جاری کی جائے۔ اور اُنکے تمام ورثاء اور وابستگان دامن کی خبر گیری میرے ذمے کی جائے۔ اس کی پیروی مین وہ انگلستان مین جانے کی تیاریان کر رہی رہے تھے کہ اُنکے خاندان والون ہی مین سے کسی نے دعوت کی۔ دعوت سے واپس آئے تو قے و دست جاری ہو گئے۔ آناً فاناً حالت خراب ہو گئی۔ اور ایک ہی دن مین وہ۔ اُنکی بی بی۔ اور اُنکے کئی فرزند سب کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔ اور دنیا اس خاندان کی اُن تمام یادگارون سے خالی ہو گئی جنھون نے کبھی تخت و تاج کی صورت دیکھی تھی۔

تاہم مٹیا برج کی چہل پہل اور اُس نئی بستی کی رونق و آبادی نے ایسی صورت پیدا کر لی تھی کہ اگر چشم زخم حوادث سے بچ جاتا تو مدتون تک یاد دلاتا رہتا کہ اس بخت برگشتہ بادشاہ کے دربار اور اُس کے وابستگان دامن کی کیا وضع قطع تھی۔ اور اُن کا کیا مذاق تھا۔ مگر برٹش گورنمنٹ کی عدالت گستری نے واجد علی شاہ کا ترکہ تقسیم کرنے اور اُن کے ورثا کی دادرسی مین یہ شان عدالت دکھائی کہ ساری جائداد اور سارا گھر بار بیچ کے حصہ رسدی سب مین تقسیم کر دیا جائے۔ اور جو کچھ ہے نقد روپئے کی صورت مین کر لیا جائے۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مٹیا برج کی اینٹ سے اینٹ بج گئی۔ لاکھون کا سامان کوڑیون کو بک گیا۔ اور وہی بقعہ جو چند روز مین باغ ارم بن گیا تھا حضیض ادبار کا جہنم ہو کے رہ گیا۔ اب تم وہان جا کے خاک اُڑاؤ کچھ نہ نظر آئے گا۔ اگر

آنکھیں اگلی رونق اور چہل پہل کو ڈھونڈتی ہوں تو کسی امرأ القیس[1] کو بلاؤ جو
ہر نسو بہاتا جائے اور تمھیں بتاتا جائے کہ یہاں مرجع منزل تھی - یہاں نور منزل
تھی - یہاں سلطان خانہ تھا - اور یہاں اسد منزل تھی - وہاں مشاعرے ہوتے
تھے - وہاں علمائے باکمال کی مجلس تھی - وہاں یاران باصفا کی بذلہ سنجیاں
تھیں - اور وہاں فصحائے جادو بیان کی سحر طرازیاں تھیں - اس مقام پر منتخب
حسینانِ جہان کا جھرمٹ تھا - اس مقام پر رقص و سرود کی محفل گرم تھی - اس
مقام پر حور وش مہ جبینوں کو گانے ناچنے کی تعلیم ہوتی تھی - اور اس مقام پر
جہان پناہ ناز آفرین ممتوعات کے بیچ میں بیٹھ کے جشن منایا کرتے تھے - اِس
جگہ افیونیوں کے مجمع میں داستان ہوتی تھی - اس جگہ بٹیروں کی پالیاں ہوتی
تھیں - اس جگہ کبوتر اُڑتے تھے - اور اس جگہ لنگوٹے کے میدان بدے
جاتے تھے - اِس ڈیوڑھی پر ماہ وش جادو نگاہیں پردے سے سر نکالے جھانکتی
نظر آتی تھیں - اس ڈیوڑھی پر ماما اصیلوں کی آمد و رفت سے ہر وقت ایک عجیب
جوش و خروش نمایاں رہتا تھا - اس ڈیوڑھی پر خاص خاص شعرا حاضر رہتے اسلیے
کہ محلسرا والی کو فن شعر سے دلچسپی تھی - اور اس ڈیوڑھی پر روز رنگین عبارت لکھنے
والے جوان مزاج ادیبوں کی تلاش رہتی تھی - اس لیے کہ دوسرے تیسرے یہاں
سے ایک نئے رنگ کا توڑونامہ[2] جا کے بادشاہ کے ملاحظے میں پیش ہوتا -

لیکن ٹیا برج کے مٹ جانے پر بھی اس مرحوم دربار کی ہزاروں یادگاریں
باقی ہیں - خود شہر لکھنؤ اور اُسکی سوسائٹی اس دربار دُربار کو یاد دلا رہی ہے اور
اودھ کی سرزمین کا چپہ چپہ اُسکی عظمت کی یادگار ہے - اس لیے کہ اُس پر جا بجا
سلطنت ماضیہ کے مارکے بنے ہوے ہیں - اہل لکھنؤ کی ہر حرکت اور ادا اگلے ارکان
دربار کی زندہ تاریخ ہے - اور اُنکی چال دیکھ کے بے اختیار زبان سے نکل جاتا ہے -
"اے گل بتو خرسندم تو بوے کسے داری" - لہذا ان دیرپا آثار سلف کی یاد تازہ

[1] جاہلیت عرب کا ایک نہایت مشہور شاعر جسنے اپنے قدیم عشرت کدے کی ویرانی اور تباہی کی تصویر
نہایت ہی سوز و گداز کے الفاظ میں دکھائی ہے - [2] توڑونامہ اُن خطوط کو کہتے تھے جو بیگمات و محلات
عالیات جہان پناہ کی خدمت میں بھیجتیں جو عموماً عاشقانہ رنگ میں ہوتے -

کرنے کی غرض سے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ اس دربار کے قائم ہونے سے لکھنؤ مین جو سوسائٹی پیدا ہو گئی تھی وہ کیا تھی ؟ کیسی تھی ؟ اور اُس نے کس کس عنوان سے ہندوستان کی معاشرت پر اثر ڈال رکھا تھا۔

ہندوستان مین اُن دنون فارسی زبان کورٹ لینگوج (درباری زبان) تھی اور اہل ہندوستان کی بہترین معاشرت ایرانی تہذیب سے ماخوذ تھی - دولت صفویہ کے عہد مین ایرانیون کا عام مذہب شیعۂ اثنا عشری ہو گیا تھا - اور ہندوستان کا حکمران خاندان مغلیۂ چغتائیہ مذہب اہل سنت کا پیرو تھا۔ مگر معاشرت پر فارسیت کا سکہ جاری ہونے کا یہ اثر تھا کہ باوجود اختلاف مذہب کے جو عجمی یہان آتے ادب کے ہاتھون سے لیے جاتے تھے - اسی اخلاقی رجحان نے نورجہان بیگم کو جہانگیر کے تاج وتخت کا مالک بنا دیا - اسی کی بدولت دہلی کے اکثر معزز عہدہ دار آخر عہد مین شیعہ تھے - اور اسی کی وجہ سے امین الدین خان نیشاپوری یہان پہونچتے ہی نواب بُرہان الملک بن کے وادی گنگا کے سارے وسیع علاقے کے مالک ہو گئے - بُرہان الملک کا اثر اور اقتدار جس قدر بڑھتا اور ترقی کرتا گیا اُسی قدر زیادہ وہ باکمالان دہلی کے مرجع وماویٰ بنتے گئے - باوجود اس کے اُن کی اور نواب صفدر جنگ کی زندگی چونکہ ایک نئی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے مین صرف ہوئی اس وجہ سے سوا بہادر سپہ گرون کی قدردانی کے اُنھین قومی تمدن اور معاشرتی امور کی طرف متوجہ ہونے کی بہت ہی کم مہلت ملی - کیونکہ ان باتون کو بمقابل فوجکشی وفتحمندی کے امن وامان کے پرعیش زمانے سے زیادہ تعلق ہوا کرتا ہے -

لیکن جب شجاع الدولہ نے بکسر کی لڑائی مین ہمت ہارنے کے بعد انگریزون سے نیا معاہدہ کیا - اور مجبور ہو کے فیض آباد مین خاموش بیٹھے تو سرزمین اودھ مین ایک نئے تمدن کی بنیاد پڑ گئی - اس مضمون کے آغاز مین ہم بتا چکے ہین کہ شجاع الدولہ کے زمانے مین کس کثرت سے باکمالان دہلی وطن چھوڑ چھوڑ کے یہان آنے لگے تھے - دہلی سے فیض آباد تک ہر پیشے اور ہر طبقے کے لوگون کے آنے کا کیسا تانتا بندھ گیا تھا - اور صرف نو سال کی مدت مین فیض آباد کیا

سے کیا ہو گیا تھا؟ شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ نے جب لکھنؤ میں قیام کیا تو فیض آباد کا جما جمایا اکھاڑہ کیا رگی فیض آباد سے اُکھڑ کے لکھنؤ میں آ گیا۔ اور دہلی کے اعلیٰ خاندانوں اور باکمالوں کا جو سیلاب فیض آباد کو جا رہا تھا لکھنؤ ہی میں روک لیا گیا جو کہ عین سر راہ واقع ہوا تھا۔ اور آخر میں چند شرفا و صاحب ہنر جو فیض آباد میں بیگموں کی سرکاروں میں اُلجھے رہ گئے تھے رفتہ رفتہ وہ بھی لکھنؤ میں آ گئے۔ اس لیے کہ آصف الدولہ نے یہاں دولت کی ایسی گنگا نہیں بہا رکھی تھی کہ کوئی سنتا اور سیراب ہونے کے شوق میں بے اختیار نہ دوڑ پڑتا۔

اُن دنوں یوں تو بہت سی ہندو ریاستیں موجود تھیں مگر مہذب اور شائستہ دربار مسلمان حکمرانوں ہی کے سمجھے جاتے تھے۔ اور ہندو راجہ خود معترف تھے کہ تمدن اور معاشرت میں ہم مسلمان درباروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اپنی قدیم تہذیب کو زندہ کر کے اپنے لیے نیا تمدن اور نیا لٹریچر پیدا کرنے کا خیال ابھی اُن میں انگریزی تعلیم نے نہیں پیدا کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کوئی باکمال عالم شاعر۔ یا سپاہی مسلمان امراے بر خاستہ خاطر ہو کے ہندو امرا کے علاقے میں پہونچ جاتا تو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا اور دیوتاؤں کی طرح اُس کی قدر و منزلت کی جاتی۔

مسلمان دربار اِن دنوں چند گنتی کے تھے۔ سب سے پہلے تو دہلی کا دربار مغلیہ تھا۔ اور اس کی قدامت اور گذشتہ شوکت کی وجہ سے ہر قسم کے باکمالوں اور مستند خاندانی شرفا کی کان دہلی بنی ہوئی تھی۔ اور اسی سرزمین کے منتشر روڑے تھے جنھوں نے دور و دراز صوبوں میں جا کے نئے نئے دربار قائم کیے تھے۔ جن میں سے دکن میں آصف جاہ کا دربار تھا۔ وہاں سے آگے بڑھ کے ٹیپو سلطان اور نواب ارکاٹ کے دربار تھے۔ شمال میں دہلی سے چلیے تو پہلے روہیلکھنڈ کے بہادر خوانین کی قلمرو ملتی۔ اس کے بعد یہ اودھ کا دربار تھا۔ پھر اُس سے آگے مرشد آباد میں نواب ناظم بنگالہ کا دربار تھا۔ مذکورہ اسلامی درباروں سے دکن کے دربار نہایت ہی دور تھے۔ اُن کا راستہ اول تو جنگلوں اور پہاڑوں کی وجہ سے نہایت ہی دشوار گذار تھا۔ اور اس پر بھی جرأت کر کے کوئی چل کھڑا ہوتا تو ٹھگ اور ڈاکو

جو سارے ملک میں پھیلے ہوئے تھے۔ راستے ہی میں اُس کی زندگی کا خاتمہ کر دیتے۔ ٹیپو سلطان اور نواب کرناٹک کی قلمرو تک جانا درکنار کسی کو نظام حیدرآباد کی مملکت تک پہونچنا بھی مشکل سے نصیب ہوتا۔ اس لیے جب دہلی بگڑنا شروع ہوئی اور تاجداران مغلیہ کی حالت خراب ہونے سے قدردانی کا بازار وہان سرد پڑا تو لوگون نے عموماً شمالی ہندوستان کا رُخ کیا۔ اس مین شک نہین کہ روہیلکھنڈ بہت قریب تھا۔ یہان کے خوانین اگر قدردانی کرتے تو اُن سے زیادہ موقع کسی کو نہین حاصل تھا۔ مگر اُن مین دینداری تھی۔ شجاعت تھی۔ اور بہت سی خوبیان تھین مگر علمی مذاق اور معاشرتی رنگینیون سے وہ لوگ بالکل معرّا تھے۔ انکی حالت کا صحیح اندازہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ خالص فوجی مذاق کے لوگ تھے۔ جنھین اپنے ہموطنون کے جمع کرنے اور اپنے جرگون کی تعداد بڑھا کے اپنی جنگی قوت کو ترقی دینے کے سوا اور کسی بات کا شوق نہ تھا۔ معاشرت کے رسیلے پن اور تمدنی زندگی کے آداب و اخلاق کے لحاظ سے دیکھیے تو انکی حالت بالکل وحشی گنوارون کی سی تھی۔ ایسے لوگ بھلا شاعرون ادیبون اور دیگر قسم کے باکمالون کی کیا قدر کر سکتے تھے؟ لہٰذا اُن کی سرزمین مین جو داخل ہوا قدم بڑھاتا ہوا آگے نکل گیا۔ چار پانچ منزلین طے کر کے لکھنؤ مین پہونچا تو دیکھا کہ رئیس سے لے کے ادنیٰ طبقے والے تک استقبال مین آنکھین بچھا رہے ہین۔ اور ہر طرح خدمتگذاری کو طیار رہین۔ ایسی جگہ پہونچ کے پھر بھلا کون واپس آ سکتا ہے؟ جو گیا وہین کا ہو گیا۔ اور دہلی کا ہر فانان برباد یہان آتے ہی پانوٗن توڑ کے بیٹھ گیا۔ نہ وطن ہی یاد رہا اور نہ کسی اور دربار کے دیکھنے کی ہوس ہی دل مین باقی رہی چند لوگ یہان سے آگے بڑھ کے نواب ناظم بنگالہ تک بھی پہونچ گئے مگر وہ وہی تھے جنکی لکھنؤ قدر نہ کر سکا۔ مگر ایسے چند گنتی ہی کے لوگ تھے ورنہ دہلی سے جتنے باکمال آئے سب لکھنؤ ہی مین کھپتے چلے گئے۔ تھوڑے ہی زمانے کے اندر یہ حالت ہو گئی کہ اُس دَور کی مہذب ترین سوسائٹی کے جتنے مشہور اور نامور بزرگ تھے سب لکھنؤ کے اندر جمع تھے۔

فقط ایک چیز لکھنؤ مین اس دربار کے قائم ہونے سے پہلے موجود تھی۔ اور وہ

عربی کا علم و فضل تھا۔ جس کی بنیاد اُس وقت پڑ گئی تھی جب شہنشاہ اورنگ زیب نے فرنگی محل کے مکانات ملا نظام الدین سہالوی کو عطا کیے تھے۔ ملا صاحب ممدوح اور اُنکے خاندان کے قیام نے چند ہی روز مین فرنگی محل کو ہندوستان کی ایک ایسی اعلیٰ ترین یونیورسٹی بنا دیا کہ سارے ہندوستان کے علما و فضلا کا مرکز لکھنؤ کا یہی چھوٹا سا محلہ قرار پا گیا۔ شیخ عبدالحق دہلوی کے بعد دہلی مین بھی کوئی نمود کا عالم نہین پیدا ہو سکا تھا۔ آخر مین شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان نے البتہ بہت بڑا عروج حاصل کیا مگر ان کی شہرت علم حدیث تک محدود تھی۔ مگر حدیث کے علاوہ اور جتنے علوم ہین ان سب کی یونیورسٹی لکھنؤ ہی تھا۔ اُن دنون لکھنؤ ایک گمنام شہر تھا۔ مگر ایسے ایک گمنام مقام کا اتنی بڑی یونیورسٹی بنجانا کہ ہندوستان درکنار بخارا خوارزم۔ اور ہرات و کابل اس کے آگے سر جھکا دین بہت ہی حیرت کے قابل ہے ساری اسلامی دنیا یہین کی شاگردی پر فخر کر رہی تھی اور یہین کے منتخب کیے ہوے نصاب تعلیم یعنی سلسلۂ نظامیہ کی پیرو تھی۔ غرض علماے فرنگی محل کی بدولت اس نئے دربار کے قائم ہونے سے پہلے ہی لکھنؤ حکمت و فلسفہ۔ منطق و کلام۔ فقہ و اصول فقہ اور دیگر مختلف علوم کا معدن و مرجع بن چکا تھا۔ لہذا ایک اس چیز مین تو لکھنؤ اس نئے دربار کا زیر بار احسان نہین ہے باقی اور تمام ترقیان اس سلطنت کے قائم ہونے ہی سے پیدا ہوئین۔

اب ہم جدا جدا بیان کرنا چاہتے ہین کہ دہلی سے لکھنؤ مین کون کون سی چیزین آئین۔ اور یہان آکے اُنھون نے کیا رنگ پکڑا؟ سب سے مقدم اُردو زبان ہے جو دہلی کے اُن شرفا اور سردارانِ فوج کی زبان تھی جو آپ برہان الملک بہادر کے ساتھ لکھنؤ مین آئے تھے۔ یہ زبان دہلی مین پیدا ہوئی۔ اور اسکی شاعری کا آغاز دکن سے ہوا۔ ولی گجراتی نے دہلی مین آکے اپنا دیوان پیش کیا۔ اور اپنے نغمۂ دلکش سے اہل زبان کو خواب غفلت سے جگایا۔ اس نغمے مین کچھ ایسا جادو تھا کہ سنتے ہی سب کی زبان پر یہی نغمہ جاری ہو گیا۔ اور دہلی مین اُردو شاعری شروع ہو گئی۔

ابتداءً چند ہی بزرگ تھے جنھون نے اُستادی کی شان سے دہلی مین داد سخن

دینا شروع کی - مگر اس زمانے کو اگر اُردو زبان کی طفلی نہین تو اُردو شاعری کا بچپن کہنا چاہیے - دنیاے اُردو کے ان سابقین الاولین مین سب سے زیادہ صاحب علم و فضل اور سب سے بڑے باکمال خان آرزو تھے - جنھین مولانا آزاد مرحوم نے دوسرے دَور شاعری مین رکھا ہے - زمانۂ مابعد کے بڑے بڑے باکمال جن مین سودا - میر - میرزا مظہر جان جانان اور خواجہ میر درد شامل ہین سب ان کے شاگرد تھے - شاعری اور کمال زباندانی کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد انھین اُستادِ اول خان آرزو سے پڑی - نواب شجاع الدولہ کے ماموں سالار جنگ نے کمال قدردانی سے اُنھین لکھنؤ بلوایا - اور ایک زمانے تک اودھ مین اقامت گزین رہ کے وہ شجاع الدولہ کی مسند نشینی کے دو برس بعد سنہ ۱۱۶۹ھ (سنہ ۱۱۴۲ محمدی مطابق سنہ ۱۷۵۶ء) مین خاص لکھنؤ کے اندر رہگراے آخرت ہوے - وہی پہلے اُستادِ اردو شاعری کے تھے - اور اُنھین سے اُردو شعر و سخن کے لکھنؤ مین آنے کی بنیاد پڑی - مگر افسوس کہ اُنکی ہڈیان سرزمین لکھنؤ کے دامن شوق سے چھین کے خاک دہلی کو سونپی گئین -

اس کے بعد اسی دَور کے دوسرے نامی اُستادِ سخن اشرف علی خان فغان نے جو احمد شاہ بادشاہ کے کوکا تھے قدردانی کی تلاش مین لکھنؤ کی راہ لی - شجاع الدولہ نے نہایت ہی تعظیم و تکریم کی - ہاتھوں ہاتھ لیا اور ایک زمانے تک اپنے دربار مین رکھا - مگر شعرا نازک خیال سے زیادہ نازک دماغ ہوا کرتے ہین - کسی خفیف سی بات پر رُوٹھ کے عظیم آباد چلے گئے - اور شجاع الدولہ کی وفات سے دو برس پہلے وہین پیوند زمین ہو گئے -

اب مولانا آزاد کا مقرر کیا ہوا تیسرا دَور شاعری شروع ہوا - جبکہ خان آرزو کے شاگرد نظم اُردو پر حکومت کر رہے تھے - اس زمانے کی حالت دیکھنے سے نظر آتا ہے کہ دہلی اپنے باکمالون کو اپنے آغوش مین سنبھال نہین سکتی - ہر طرح کے صاحبان کمال اُسکی سواد سے نکلتے چلے جاتے ہین - اور جو جاتا ہے پھر نہین آتا اس کے مقابل لکھنؤ کی یہ حالت ہے کہ جو صاحب فن آتا ہے چاہے کہین کا ہو یہین کا ہو جاتا ہے - مرزا رفیع سودا - میر تقی میر - سید محمد میر سوز جو اس تیسرے

دور کے پیمبران سخن ہیں سب دہلی چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ مین آئے اور یہین پیوند زمین ہوگئے۔

ان کے علاوہ جو باکمالان سخن اس زمانے مین وارد لکھنؤ ہوے اور یہین کے ہو گئے۔ میرزا جعفر علی حسرت۔ میر حیدر علی حیران۔ خواجہ حسن حسن۔ میرزا فاخر مکین۔ میر ضاحک۔ بقاء اللہ خان بقا۔ میر حسن دہلوی۔ میر ضاحک کے فرزند (صاحب مثنوی) اور انھین کے ایسے بیسیون شعرا ہین۔ میر قمرالدین منت۔ میر ضیاءالدین ضیا۔ اشرف علی خان فغان دہلی سے لکھنؤ مین آکے ایک مدت تک رہے اور یہین چمکے۔ مگر آخر مین بیرونی قدردانون کی کشش سے نکلتے۔ اور عظیم آباد مین جاکے نذر اجل ہوے۔ شیخ محمد قائم قائم کا انتقال اگرچہ اُسکے وطن نگینے مین ہوا مگر وہ بھی ایک مدت تک اسی لکھنؤ کی سبھا کے ایک اکیٹر تھے

صرف میرزا مظہر جان جانان اور خواجہ میر درد کے ایسے چند بزرگ دہلی مین پڑے رہ گئے جن کو فقیرانہ قناعت اور مرجعیت کی وجہ سے دہلی مین قدم جمانے کا موقع مل گیا تھا۔ اور سجادہ نشینی کی وجہ سے اپنی مسند درویشی کو نہ چھوڑ سکتے تھے۔ غرض شاعری کا یہ تیسرا دور وہ زمانہ ہے جبکہ دہلی کی سبھا وہان سے اُکھڑ کے لکھنؤ مین جم رہی تھی۔ اور لکھنؤ مین ایک جوش قدردانی تھا جس سے ہندوستان کی تاریخ خالی ہے۔

اب چوتھا دور شروع ہوا۔ اس کے ارکان بھی اگرچہ دہلی واکبرآباد وغیرہ کی خاک سے پیدا ہوے تھے مگر سب کی شاعری لکھنؤ ہی مین چمکی۔ یہین سے ان کا نام مشہور ہوا۔ یہین کے مشاعرون کے میر مجلس تھے۔ یہ لوگ علی العموم یہین سے نکلے۔ یہین رہے۔ یہین عروج پایا اور یہین مر کھپ گئے۔ اس دور کے رکن رکین جرأت۔ سید انشا۔ مصحفی۔ قتیل اور رنگین وغیرہ تھے۔ یہ لوگ اپنے عہد مین زبان پر حکومت کر رہے تھے۔ اور انکی شاعری کا غلغلہ اس قدر بلند تھا کہ ان کے سامنے کسی اُردو شاعر کا نام چمک ہی نہ سکا۔ ان سب کی ہڈیان کہان ہین؟ لکھنؤ کی خاک مین۔

اس زمانے مین دہلی کے صاحبان مذاق جس کثرت سے لکھنؤ مین آرہے تھے

اُس کا اندازہ سید انشا کی ایک روایت سے ہو سکتا ہے جس میں اُنھوں نے اُس عہد کے ایک شریف وضعدار بڑھے اور نورًا نام ایک کسبی کی گفتگو نقل کی ہے - وہ بزرگ اور کسبی دونوں دہلی کے ہیں مگر دونوں لکھنؤ میں باتیں کر رہے ہیں - بی نورا کہتی ہیں " اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کا چاند ہو گئے - دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے - لکھنؤ میں تمھیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھاتے - آپ کی کربلا میں کتنا میں نے ڈھونڈھا کہیں تمھارا اثر آثار معلوم نہ ہوا - ایسا نہ کیجیو کہ آٹھوں میں بھی نہ چلو - تمھیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو " اس کا جواب جو میر صاحب نے دیا ہے وہ اگرچہ نہایت ہی دلچسپ ہے مگر ہم تطویل سے بچنے کے خیال سے اُسے چھوڑے دیتے ہیں - اُنھوں نے دہلی و لکھنؤ کے موجودہ رنگ پر اعتراضات کیے ہیں - اور معاصر شعرا پر نکتہ چینیاں کی ہیں جس سے ہمیں بحث نہیں - ہمیں صرف یہ بتانا ہے کہ اُس زمانے میں شرفا و کملا در کنار رنڈیاں تک لکھنؤ میں آ آ کے بستی جاتی تھیں - اور جو لوگ دہلی میں پھول والوں کی سیر کے رسیا تھے اب کربلا اور آٹھوں کے میلے میں اپنا دل بہلاتے تھے -

شمس العلما مولانا آزاد مرحوم نے بعد کے تمام شعرائے دہلی و لکھنؤ کو بلا لحاظ امتیاز و عہد ایک جگہ جمع کر کے اور زمانے کی طنابیں کھینچ کے پانچواں دور بنا دیا ہے - لیکن یہ ناانصافی ہے - اصلی پانچواں دور صرف ناسخ و آتش کا تھا جس میں زبان نے نئی وضع اختیار کی - بہت سے پُرانے محاورات ترک ہو گئے - نئی بندشیں پیدا ہوئیں - اور اُس زبان کی بنیاد پڑی جو بعد کے شعرائے دہلی و لکھنؤ میں یکساں طور پر مقبول ہوئی - اور قریب قریب وہ زبان بن گئی جو اب ہندوستان میں مستند ہے - اور یہی وہ زمانہ تھا جب شاعری کی قلمرو میں پہلے پہل لکھنؤ کا سکہ جاری ہوا -

اس کے بعد چھٹا دور وہ تھا جب لکھنؤ میں وزیر - صبا - رند - گویا - رشک - نسیم دہلوی - اسیر - نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم صاحبان مثنوی کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا - اور دہلی میں مومن - ذوق - غالب نغز شاعرانہ

مشاق رہے تھے۔ اس دور نے سچ یہ ہے کہ زبان کو بلحاظ خیالات سب سے زیادہ ترقی کے درجے پر پہونچا دیا۔

اس کے بعد ساتوان دور امیر۔ داغ۔ منیر۔ تسلیم۔ مجروح۔ جلال۔ لطافت۔ افضل اور حکیم وغیرہ کا تھا۔

ان آخری دورون پر غائر نظر ڈالنے سے صاف نظر آجاتا ہے کہ فصاحت زبان اور شاعری نے لکھنؤ مین کیسی مضبوط جگہ پکڑ لی تھی۔ چند ہی روز مین شعر کہنا لکھنؤ مین ایک وضعداری بن گیا۔ اور شعرا کی یہان اس قدر کثرت ہوگئی کہ شاید کہین کسی زبان مین نہ ہوئی ہوگی عورتون تک مین شعر و سخن کا چرچا ہوا۔ اور جہلا کے کلام مین بھی شاعرانہ خیال آفرینیون۔ تشبیہون اور استعارون کی جھلک نظر آنے لگی۔

(۱۰)

فارسی شاعری کا اصلی اُٹھان مثنوی سے ہوا ہے۔ اور یہ صنفت شاعری ہمیشہ سب سے زیادہ اہم اور باوقعت سمجھی گئی۔ ابتدا فردوسی کی رزمیہ مثنوی شاہنامے سے پڑی۔ پھر نظامی۔ سعدی۔ مولانائے روم۔ خسرو۔ جامی۔ اور ہاتفی وغیرہ نے اس مین اعلیٰ ترین شہرت و ناموری حاصل کی۔ اُردو مین میر تقی میر نے چھوٹی چھوٹی بہت سی مثنویان دہلی و لکھنؤ کے قیام کے زمانے مین لکھی تھین مگر وہ اس قدر مختصر اور معمولی ہین کہ مثنویون کے تذکرے مین اُن کا ذکر بھی بےمحل سا معلوم ہوتا ہے۔

مثنوی لکھنے کا آغاز اُردو مین میر ضاحک کے بیٹے میر غلام حسن حسن سے ہوا۔ جو بچپن ہی مین اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے تھے۔ یہین کی صحبت مین اُن کا نشو و نما ہوا تھا۔ یہین پرورش پائی تھی۔ اور یہین کی آب و ہوا کے آغوش مین اُن کی شاعری پلی تھی۔ کیونکہ جس تعلیم اور جس سوسائٹی نے اُن کی مثنوی "بےنظیر و بدر منیر" لکھوائی وہ خالص لکھنؤ کی تھی۔ اسی زمانے مین مرزا محمد تقی خان ہوس نے مثنوی لیلیٰ مجنون لکھی۔ اور لکھنؤ مین مثنویت کا مذاق بڑھنا شروع ہوا۔ آتش و ناسخ کے زمانے مین تو ذرا خاموشی رہی۔ مگر پھر جو یہ مذاق اُبھرا تو پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم۔ آفتاب الدولہ قلق نے طلسم الفت۔ اور نواب مرزا شوق نے بہار عشق۔

زہر عشق اور فریب عشق لکھین - اور انھین اس قدر عام نمود و شہرت اور عالمگیر مقبولیت حاصل ہوئی کہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ کی زبان پر ان مثنویون کے اشعار چڑھ گئے - اس سے پیشتر کے زمانے مین کسی صاحب نے مثنوی میر حسن کے جواب مین لذت عشق نام ایک مثنوی لکھی تھی وہ نواب مرزا شوق کی مثنویون کے ساتھ شایع ہونے کی وجہ سے اُنھین کی جانب منسوب ہو گئی - لیکن حقیقت مین نہ وہ اُن کی ہے اور نہ اُنکے زمانے کی ہے -

ان سب مثنویون کے دیکھتے مثنوی گلزار نسیم باوجود عام مقبولیت کے صدہا غلطیون سے مملو ہے - دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نازک خیال نومشق ہے جو ہر قسم کی شاعرانہ خوبیان اپنے کلام مین پیدا کرنا چاہتا ہے مگر قادر الکلامی کے نہ ہونے سے قدم قدم پر ٹھوکرین کھاتا ہے اور کسی جگہ اپنے مقصد کو نہین حاصل کر سکتا - اس کے جواب مین آغا علی شمس نے جو ایک بہت ہی کہنہ مشق شاعر تھے اسی بحر مین ایک مثنوی لکھی تھی جس مین غلطیون سے پاک رہ کے تشبیہات - استعارات - اور رعایت لفظی کے کمالات دکھائے تھے - مگر افسوس وہ مثنوی مٹ گئی - اور گلزار نسیم کو جو شہرت حاصل ہو چکی تھی اُسپر غالب نہ آ سکی - دلی مین ان دنون مومن خان نے چند چھوٹی چھوٹی بے مثل مثنویان لکھین جو بہت ہی مقبول اور مشہور ہوئین -

مومن خان کے مذاق شاعری مین نازک خیالی بڑھی ہوئی تھی - خیالی تشبیہون اور استعارون پر وہ اپنی سخن آفرینی کی عمارت قائم کرتے تھے - مثنویون مین وہ زیادہ تر خیالی جذبات و صفات کو متشخص کر کے اپنے کلام مین ایک خاص لطف پیدا کیا کرتے تھے - مومن خان کے ایک شاگرد نسیم دہلوی لکھنؤ مین آئے - اور یہان کے مشاعرون مین اپنا رنگ ایسا جمایا کہ بہت سے لوگ اُن کے شاگرد ہو گئے - نسیم دہلوی نے لکھنؤ مین اپنے اُستاد کے رنگ کو خوب چمکایا - اور اُنکے شاگرد تسلیم لکھنوی نے اُردو مثنون مین نظیری و عرفی و صائب کی خیال آرائیان دکھا دین - اور نظم اُردو مین جیتے جاگتے فیضی و غنیمت لا کے کھڑے کر دیے - ادھر آخر زمانے مین مولوی میر علی حیدر طباطبائی نظم لکھنوی نے شراب کی مذمت مین ساقی نامۂ شفقتیہ کے نام سے ایک ایسی بے نظیر اخلاقی نظم اُردو پبلک کے سامنے پیش کر دی کہ اُس کا

جواب نہیں ہو سکتا۔ غرض کہ مومن خان کی چند مختصر مثنویوں سے اگر قطع نظر کر لی جائے تو اُردو مثنوی گوئی کا آغاز بھی لکھنؤ میں ہوا۔ اور ترقی بھی یہیں ہوئی۔

بعض حضرات مثنوی میرحسن اور گلزار نسیم کے ذریعے سے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا مقابلہ و موازنہ کیا کرتے ہیں۔ جس خیال کو مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے اور زیادہ قوت دے دی۔ لیکن اول تو گلزار نسیم کو نظیر اکبرآبادی کے بنجارہ نامے کی طرح اگر شہرت ہو بھی گئی تو اُسے مثنوی میرحسن کے مقابلے میں رکھنا اُردو شاعری کی سخت تذلیل و توہین ہے۔ صحیح مقابلہ ہو سکتا ہے تو مثنوی میرحسن اور اور مثنوی طلسم الفت کا۔ اور اگر گلزار نسیم کی زبان زبردستی لکھنؤ کی زبان مان بھی لی جائے تو مثنوی میرحسن اور گلزار نسیم کا مقابلہ دہلی اور لکھنؤ کی شاعری کا نہیں بلکہ خود لکھنؤ کی اگلی پچھلی زبانوں کا مقابلہ ہے۔ اس لیے کہ مثنوی میرحسن لکھنؤ کی پہلی زبان کا نمونہ ہے اور یہ آخری زبان کا۔

شاعری کی ایک اہم اور قدیم ترین صنف مرثیہ خوانی ہے۔ قدیم عربی شاعری میں زیادہ تر مرثیے اور رجز ہی شعر و سخن میں اظہار کمال کا ذریعہ تھے۔ فارسی میں مرثیہ خوانی کمزور پڑ گئی تھی۔ لیکن بعہد سلاطین صفویہ ایران میں مذہب شیعہ کو فروغ حاصل ہوا تو مصائب اہل بیت رسالت کی یاد تازہ کرنے کے لیے شعرا کو مرثیہ خوانی کی طرف توجہ ہوئی۔ مولانا محتشم کاشی نے چند بندوں کا ایک بے مثل مرثیہ لکھا تھا جو عموماً مقبول ہوا۔ اس کے بعد سے رواج تھا کہ شعرا کبھی کبھی ماتم حسینؑ میں دو ایک مرثیے بھی موزون کر دیا کرتے۔ لیکن شعر و سخن کی دنیا میں مرثیہ گوئی کی دقعت اس قدر کم تھی کہ مشہور تھا "بگڑا شاعر مرثیہ گو"۔ پھر جب مذہبی اعتبار سے دولت صفویۂ مرحومہ کی جانشین اودھ کی سلطنت قرار پائی تو لکھنؤ میں مجالس کی ترقی و عزاداری کے جوش و خروش نے مرثیہ گوئی کی ایسی قدردانی کی کہ اس فن کو غیر معمولی عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ اور در اصل لکھنؤ کے عروج کا سارا راز اسی تاریخی واقعے میں مستتر ہے۔ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت تھی جنھوں نے فارسی زبان کو درباری زبان قرار دیا۔ اور فارسی معاشرت اُن کی امیرانہ زندگی اور اُن کے تمام کمالات کا مرکز تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ ہر ایرانی ہندوستان میں آتے ہی

آنکھوں پر بٹھایا جاتا۔ اور اس کی ہر حرکت اور ہر وضع مقبولیت کی نگاہوں سے دیکھی جاتی۔ دہلی کی سلطنت میں بادشاہوں کا مذہب سُنّی ہونے کی وجہ سے ایرانی اپنی بہت سی باتوں کو چھپاتے۔ اور وہاں کی محفلوں میں اس قدر شگفتہ نہ ہونے پاتے جس قدر کہ وہ اصل میں تھے۔ اودھ کا دربار شیعہ تھا۔ اور یہاں کا خاندان حکمرانی خاص خراسان سے آیا تھا۔ اس لیے یہاں ایرانی بالکل کھل گئے۔ اور اپنے اصلی رنگ میں نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ جس قدر شگفتہ ہوئے اُسی قدر زیادہ ہم مذہبی کے باعث یہاں کے اہل دربار نے اُنکے اوضاع و اطوار کو حاصل کرنا شروع کیا۔ اور ایرانیت جو دراصل ساسانی اور عباسی شان و شوکت کے آغوش میں پلی ہوئی تھی چند ہی روز کے اندر لکھنؤ کی معاشرت میں سرایت کر گئی۔

غرض سودا و میر کے زمانے میں میاں سکندر۔ گدا۔ مسکین۔ اور افسردہ مرثیہ گو تھے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں شہادت امام حسین کے بیان میں تصنیف کر کے مجلسوں میں سُنا دیا کرتے۔ اُن کے بعد میر خلیق اور میر ضمیر نے مرثیہ گوئی کو بہت ترقی دی۔ اور مرثیوں کی موجودہ وضع انھیں کے زمانے میں ایجاد ہوئی۔ یہاں تک کہ زمانہ میر ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر خلیق کے صاحبزادے میر انیس کو ناموری کے شہ نشین پر لایا۔ اور ان دونوں بزرگوں نے مرثیہ خوانی میں ایسے ایسے کمالات شاعری دکھائے کہ شعر و سخن کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کے چمکے۔ وہی مقابلہ جو میر و سودا اور آتش و ناسخ میں رہا تھا اب میر انیس اور مرزا دبیر میں قائم ہوا۔ مرزا دبیر میں شوکت الفاظ تھی۔ بلند خیالی تھی۔ اور علم و فضل کا زور تھا میر انیس میں سادی بے تکلف اور جذبات انسانی پر حکومت کرنے والی زبان کی وہ خوبیاں تھیں جو سوا مبدأ فیاض کی عنایت کے سیکھنے سے نہیں آسکتیں۔ ان دونوں بزرگوں نے فن مرثیہ گوئی کو شاعری کی اور تمام اصناف سے بڑھا دیا۔ اور ادب اُردو میں وہ نئی چیزیں پیدا کر دیں جن کو انگریزی تعلیم کے اثر سے طبیعتیں ڈھونڈھنے لگی تھیں۔

انیس و دبیر نے مرثیہ گوئی کو اس درجۂ کمال پر پہونچا دیا تھا کہ اب مرثیہ گوئی

بجاے معیوب ہونے کے سب سے بڑا شاعرانہ ہنر بن گئی تھی۔ تمام اہل لکھنؤ ان دونون بزرگون کے اس قدر معرف و مداح ہوے کہ سارا شہر دو گروہون مین بٹا ہوا تھا اور ہر سخن سنج یا انیسیا تھا یا دبیریا۔ اور ان دونون گروہون مین ہمیشہ باہمی مخالفت رہتی۔

میر انیس نے مرثیہ گوئی کے ساتھ مرثیہ خوانی کو بھی ایک فن بنا دیا۔ یونانیون کے بعض مقررون اور خطیبون کی نسبت سنا جاتا ہے کہ اُنھون نے اپنی تقریرون مین اثر پیدا کرنے کے لیے خاص خاص کوششین کی تھین اور آواز کے نشیب و فراز اور اوضاع و اطوار کے تغیرات سے گفتگو مین اثر پیدا کرتے تھے۔ اسلام کی اس طولانی عمر مین اس نہایت ضروری فن کو اصول کے ساتھ خاص میر انیس نے زندہ کیا۔ الفاظ کے مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے۔ کلام کو اعضا و جوارح کے متناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن خاص لکھنؤ کی اور وہ بھی میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔ جسکی ترقی مین اب تک کوششین جاری ہین۔ اور ہمارے اسپیکر اپنی فصیح البیانی مین اثر پیدا کرنے کے لیے اگر ان باکمالون کی شاگردی کرین تو نہایت ہی کامیاب اسپیکر ثابت ہون۔

ڈراما کا فن سخن جو مغربی شاعری کی جان ہے اُس سے عربی و فارسی کا ادب مطلقاً خالی تھا۔ اور فارسی کی شاگردی کی وجہ سے اُردو مین بھی اُس کی طرف کبھی توجہ نہین کی گئی۔ سنسکرت مین اعلیٰ درجے کے ڈراما تھے۔ مگر اُن سے ہندوستان کی آخری سوسائٹی بالکل نا آشنا ہو چکی تھی۔ رامچندر جی اور سری کرشن جی کے کارنامے البتہ ہندوون مین مذہبی آداب کے ساتھ دکھائے جاتے تھے۔ مگر اُردو شاعری کو اُن سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ رام چندر جی کے حالات انگلستان کے اُلمپیا کی طرح کھُلے میدانون مین رزمیہ نقالیون کی شان سے دکھائے جاتے۔ اور سری کرشن جی کے حالات رقص و سرود اور موسیقی کے پیرائے مین مذہبی اسٹیجون پر بعینہٖ اُپیرا کے طریقے سے نظر آتے جو "رہس" کہلاتے۔ واجد علی شاہ کو رہس سے خاص دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اور رہس کے پلاٹ سے ماخوذ کر کے اُنھون نے اپنا ایک ڈراما تیار کیا جس مین وہ کنھیا جی بنتے یا عشق کے ستائے ہوے جوگی بن کے دھونی رماتے۔ اور بہت سی عورتین پریان اور عاشق مزاج

گویا ان بن کے اُنھیں ڈھونڈھتی پھرتیں۔ پھر جب قیصر باغ کے سیلون کا دروازہ عوام الناس کے لیے بھی کھُل گیا تو سارے شہر کے شوقینوں میں ڈراما کا فن خود بخود ترقی کرنے لگا۔ اور چند ہی روز میں اس شوق کو اس قدر ترقی ہوئی کہ بعض مشہور شعرا بھی اُس زمانے کے مذاق کے موافق طبع آزمائیاں کرنے اور ڈراما لکھنے لگے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے شوق کے ساتھ ہی میاں امانت نے جو ایک مشاق شاعر تھے اندر سبھا لکھی۔ اور موجودہ عہد کی کمپنیوں کی طرح شہر میں جا بجا مختلف جماعتیں اُن کی "اندر سبھا" کو اسٹیج پر کھیلنے لگیں۔ جن میں کہیں عورتیں اور کہیں لڑکے ایکٹ کرتے۔ اس اندر سبھا میں اصول موسیقی کے مطابق دلکش دُھنیں قائم کی گئیں۔ اور سارا شہر اندر سبھا کے جلسے دیکھنے کا مشتاق تھا۔ میاں امانت کی اندر سبھا کی کامیابیاں دیکھ کے اور لوگوں کو بھی شوق ہوا۔ اور اس قسم کے بہت سے ڈرامے ایجاد ہو گئے۔ اور سب کا نام "سبھا" قرار پایا۔ چنانچہ شہر میں مداری لال وغیرہ کی بہت سی سبھائیں قائم ہو گئیں جن کے پلاٹ بدلے ہوئے تھے۔

سبھا کے نئے رنگ نے شہر میں ایسی زندہ دلی پیدا کر دی کہ سوا اندر سبھا کے لوگ کسی اور قسم کا ناچ گانا پسند ہی نہ کرتے تھے۔ ہر طرف سبھاؤں کی دھوم تھی۔ اور اس کی بنیاد پڑ گئی کہ سوسائٹی کے مذاق کے مطابق اگلے عاشقانہ قصے نقل کے طور پر اچھی نظموں میں اور دلکش مضمون کے ساتھ پبلک کے سامنے پیش کیے جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ پارسی تھیٹروں نے اپنی انتظامی خوبیوں اور نمایشی دل فریبیوں کی وجہ سے سبھاؤں کا رنگ پھیکا کر دیا۔ لیکن یہ نہ سمجھو کہ ڈراما کا وہ پُرانا مذاق جو لکھنؤ میں ایجاد ہو کے مروج ہوا تھا مٹ گیا۔ اول تو پارسیوں نے بھی اس چیز کو لکھنؤ سے لیا ہے۔ اُن کا پہلا عام کھیل امانت کی اندر سبھا تھا۔ اور باوجود اس کے لکھنؤ کے تمام قومی جلسوں میں آج تک سیپہرے۔ ہرش چندر وغیرہ کے ایسے بیسیوں پد فارسیں ہو رہے ہیں۔ اور اس مذاق کے ایکٹروں کا ایک مستقل گروہ پیدا ہو گیا ہے جو شرفا میں سے قومی مذاق اُٹھ جانے پر بھی عوام کو محظوظ کرتا ہے۔ بہر تقدیر اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ اُردو ڈراما کی بنیاد خاص لکھنؤ ہی میں پڑی اور یہیں سے سارے ہندوستان میں اس کا رواج ہوا۔

اُردو شاعری کی ایک قسم واسوخت ہین - یہ خاص قسم کے عاشقانہ مسدس ہوتے ہین - اور اُن کا مضمون عموماً یہ ہوتا ہے کہ پہلے اپنے عشق کا اظہار - اس کے بعد معشوق کا سراپا - اُس کی بے وفائیان - پھر اُس سے روٹھ کے اُسے یہ باور کرانا کہ ہم کسی اور معشوق پر عاشق ہوگئے - اس فرضی معشوق کے حسن و جمال کی تعریف کرکے معشوق کو جلانا چھیڑنا - جلی کٹی سُنانا - اور یون اُس کا غرور توڑکے پھر ملاپ کر لینا - نظم اُردو کی یہ قسم لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی - زمانۂ وسط کے قریب قریب تمام شاعرون نے واسوخت لکھے ہین اور اُن مین بڑے بڑے لطف پیدا کیے ہین - دہلی مین بھی بعد کے زمانے مین مختلف واسوخت لکھے گئے - خصوصاً مومن خان نے کئی بہت اچھے واسوخت لکھے - مگر آغاز لکھنؤ ہی سے ہوا -

امراکی عیاشانہ طبیعتون نے شاعری کی کئی اور صنفون کو بھی پیدا کرایا جن کا آغاز دہلی ہی سے ہوا تھا - ان مین سب سے زیادہ پھل ہزل گوئی ہے اور کسی قدر پُر لطف ریختی ہے - ہزل گوئی کا آغاز دہلی مین جعفر زٹلی سے ہوا جو غالباً محمد شاہ کے زمانے مین تھے - اُنکے کلام کو مین نے اول سے آخر تک دیکھا ہے - سوا فحش گوئی اور حد سے گذری ہوئی بیحیائی کے نہ کوئی شاعرانہ خوبی نظر آتی ہے اور نہ زبان کا کوئی لطف ہے - اسکے بعد دہلی ہی کی خاک نے صاحبقران تخلص بلگرام کے ایک ہزل گو لکھنؤ مین آئے - اور یہین چمکے - ان کا نام سید آغا علی تھا - اور آصف الدولہ کے زمانے مین وارد لکھنؤ ہوے تھے - معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے مبتذل مذاق والے رئیس زادون مین اُن کا نشو ونما ہوا - اُن کا دیوان ملتا ہے اور گو کہ کلام فحش اور تہذیب سے کوسون دُور ہے مگر پھر بھی اُس مین ایک بات ہے - شاعرانہ خوبیون کے ساتھ زبان اور محاورون کا پورا لطف ہے - لیکن اس فن کو لکھنؤ کے آخری دور مین میان مشیر نے جو مرزا دبیر کے شاگرد تھے کمال کے درجے کو پہونچا دیا -

مجھے اس موقع پر بلا لحاظ اس کے کہ شیعون اور سُنّیون کے متعصبانہ جذبات کا لحاظ کرون یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لکھنؤ مین جب شیعہ سلطنت قائم ہوئی تو شیعیت نے اپنے اصلی رنگ کو قائم رکھ کے کمال آزادی کے ساتھ اپنے ہرا صول مین ترقی

شروع کی۔ مذہب شیعہ کی بنیاد دو چیزون پر ہے۔ ایک تولاّ۔ یعنی اہلبیت کرام اور خاندان نبوت کے ساتھ اظہار محبت۔ اور دوسرا تبرّا یعنی اُس خاندان محترم کے دشمنون سے اپنی براءت ظاہر کرنا۔ جس نے باہمی رقابت و تعصب کے بڑھنے سے سب وشتم کی صورت اختیار کرلی۔ اصولاً اس عقیدے مین سُنّی بھی اُن کے ساتھ شریک ہین مگر فرق یہ آپڑا کہ پہلے تینون جانشینان رسالت کو اہل سنت افضل الناس بعد انبیا و رسل اور سچے جانشینانِ رسالت مانتے ہین۔ اور شیعہ اُن کو غاصب وظالم بتاتے ہین۔ اور جب یہ بزرگ بھی اُن کے عقائد مین خاندان رسالت کے دشمن قرار پائے تو اُن سے بھی تبرا واجب ہوگیا۔ جس کو مہذب اور صاحب علم لوگون نے اگر حرف براءت کے صحیح معنون کی حد تک رکھا تو عوام شیعہ اپنے مذاق کے مطابق اُن پر زبان سب وشتم دراز کرنے لگے۔ اور یہی چیز سُنی شیعون کے باہمی تعصب کی بنا قرار پاگئی۔

ان دونون مذہبی چیزون نے لکھنؤ کی شاعری پر نہایت ہی عمدہ اور مناسب اثر ڈالا۔ تولاّ نے مرثیہ گوئی کے فن کو اپنے آغوش مین لے کے جملہ اصناف شاعری سے بڑھادیا تو دشمنان خاندان نبوت سے تبرا کرنے کے جوش نے پُرانی ہجوگوئی کو اختیار کرکے اُسے ہرزیہ گوئی کے نام سے ترقی دی۔ اس فن کے متعدد باکمال لکھنؤ مین مشہور ہوے مگر افسوس یہ چیز بالتخصیص اہل سنت کو ناگوار گذرنے والی تھی۔ عہد شاہی مین اس پر تلوارین نکل پڑا کرتی تھین۔ اور انگریزی مین بھی آج تک کبھی کبھی فوجداریان اور مقدمہ بازیان ہوجایا کرتی ہین۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہرزیہ گوئی وہرزیہ خوانی کو مکانون کی چاردیواری سے باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوسکی۔ اگر ہرزیہ گوئی کا عام سبجکٹ ایسا محدود اور مابہ النزاع نہ ہوتا تو زمانہ دیکھتا کہ لکھنؤ کے ہرزیہ گوؤن نے اپنی بیہودہ گوئیون اور فحاشیون مین بھی کیسے کیسے کمال دکھائے ہین۔

اس فن مین سب سے زیادہ شہرت مرزا دبیر کے شاگرد میان مشیر کو حاصل ہوئی۔ ہجوگوئی اور فحاشی پہلے بھی تھی مگر "مشیر" نے جس قسم کے محاورات سے کام لیا۔ بندش الفاظ۔ طرز ادا۔ اور استعمال تشبیہات مین جیسی مضحکہ خیزی پیدا

کی۔ اور صحبت کو مارے ہنسی کے لٹا دینے اور سامعین کے پیٹ مین بل ڈال دینے کے لیے جو زبان اور جیسا اسلوب سخن اختیار کیا اُس کی خوبیان اور حد بیان سے باہر ہین۔ ابتذال مین بھی لطف پیدا کر کے اُسے شایستہ لوگون کے سامنے پیش کرنے کے قابل بنا دیا اُن کا خاص جوہر تھا جو اُن سے پہلے اور اُنکے بعد کسی کو نہین نصیب ہوا۔

ہزل گوئی ہی کے سلسلے مین میان چرکین کا نام بھی لینا چاہیے۔ لکھنؤ کے زمانۂ وسطیٰ مین عاشور علی خان نام ایک زندہ دل اور نہایت ہی قابل و با مذاق رئیس تھے۔ اُن کے وہان کی صحبت اِسوقت کی سوسائٹی کا ایک اکمل ترین نمونہ تھی۔ انھین نے جان صاحب اور چرکین کو پیدا کیا۔ اور بعض لوگ کہتے ہین کہ انھین کی صحبت مین صاحبقران کا بھی نشو و نما ہوا تھا۔ چرکین اپنے ہر شعر مین پیشاب پیخانے کی رعایت رکھتے۔ اور اُن کے اشعار سے ایسی تعفن آتی ہے کہ نام سنتے ہی ہمارے ناظرین کے دماغ سڑ گئے ہونگے۔ مگر چونکہ انکو ایک قسم کی خصوصیت تھی ہم نے اُن کا ذکر کر دیا۔ اُنکے کلام مین بعض شاعرانہ خوبیان اور اچھی تشبیہین بھی ہین مگر اُن کے مذاق نے اُن خوبیون کو بھی گندہ اور پلید کر دیا ہے۔

لیکن ریختی کا فن باوجود غیر مہذب ہونے کے دلچسپ ہے اور چرکین کی شاعری کی طرح اذیت رسان نہین۔ مردون اور عورتون کے محاورون اور لہجے مین تھوڑا بہت فرق ہر زبان مین ہوا کرتا ہے۔ مگر اتنا نہین جتنا ہمین اپنی زبان مین نظر آتا ہے۔ فارسی عربی سب زبانون مین یہ امتیاز موجود ہے۔ مگر اُردو اس خصوصیت مین بڑھی ہوئی ہے۔ فارسی اور عربی کا پُرانا مذاق تھا کہ عورتین شعر کہتین تو اپنی زبان مین کہتین۔ اور مرد کبھی عورتون کی زبان سے کوئی خیال ادا کرتے ہین تو زبان مین لطف پیدا کرنے کے لیے اُن کی زبان اختیار کر لیتے یہی حال انگریزی کا ہے۔ اُردو شاعری ہمیشہ سے صرف مردون کی زبان مین رہی یہان تک کہ اس مین عورتین کہتی بھی ہین تو مرد بن کے کہتی ہین۔ مردون ہی کی زبان اختیار کرتی ہین اور اپنے لیے ضمیرین تک مذکر استعمال کرتی ہین۔ اگر شاعر

کا نام نہ معلوم ہو تو کوئی نہین پہچان سکتا کہ یہ کسی مرد کا کلام ہے یا عورت کا۔

اُردو شاعری کا تیسرا یا چوتھا ہی دور تھا کہ شوخ طبع جوانون مین خیال پیدا ہوا کہ ریختہ کی طرح ایک ریختی ایجاد کی جائے۔ میر حسن نے اپنی مثنوی مین ضرورت کے موقعون پر یہ زبان موزون کی تھی۔ مگر وہان تک مضائقہ نہ تھا۔ میان رنگین نے اس رنگ کو مستقل طور پر اختیار کیا۔ جو دہلی کے رہنے والے تھے اور لکھنؤ کی صحبتون مین شریک رہا کرتے تھے۔ ابتداءً مہذب لوگون کی صحبت نے اس رنگ کو بے شرمی اور خلاف تہذیب جانا۔ چنانچہ سید انشا کی زبانی ہم نے لکھنؤ مین دہلی کے جن مہذب سن رسیدہ بزرگ اور وہین کی ایک رنڈی نورا کی گفتگو لکھی ہے اُس مین وہ بزرگ فرماتے ہین" اور سب سے زیادہ ایک اور سُنیے کہ سعادت یار طہماسب کا بیٹا انوری ریختہ اپنے کو جانتا ہے۔ رنگین تخلص ہے۔ ایک قصہ کہا ہے۔ اس مثنوی کا نام دلپذیر رکھا ہے۔ رنڈیون کی بولی اُس مین باندھی ہے۔ میر حسن پر زہر کھایا ہے۔ ہر چند اُس مرحوم کو بھی کچھ شعور نہ تھا۔ بدر منیر کی مثنوی نہین کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہین۔ بھلا اس کو شعر کیونکر کہیے؟ سارے لوگ دلّی کے لکھنؤ کے رنڈی سے لے کے مرد تک پڑھتے ہین۔

چلی وہان سے دامن اُٹھاتی ہوئی کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

سو اُس بچارے رنگین نے بھی اسی طور پر قصہ کہا ہے۔ کوئی پوچھے کہ بھائی تیرا باپ رسالدار مسلّم۔ لیکن بچارا برچھی بھالے کا ہلانے والا تیغے کا چلانے والا تھا۔ تو ایسا قابل کہان سے ہوا؟ اور تمھارے مزاج مین رنڈی بازی سے آگیا ہے۔ تو ریختہ کے تئین چھوڑ کر ایک ریختی ایجاد کی ہے۔ اس واسطے کہ بھلے آدمیون کی بہو بیٹیان پڑھ کر مشتاق ہون۔ اور اُن کے ساتھ اپنا منہ کالا کرے۔ بھلا یہ کلام کیا ہے؟

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کرلو یہان سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

مرد ہو کر کہتا ہے۔ ع۔ کہین ایسا نہ ہو کمبخت مین ماری جاؤن۔ اور ایک کتاب بنائی ہے اُس مین رنڈیون کی بولی لکھی ہے۔ جس مین اوپر والیان چلین۔ اوپر والا چاند۔ اُجلی دھوبن۔ وغیرہ وغیرہ"

مگر مہذب بڈھے شکایت کرتے کرتے مر گئے۔ نوجوانون کی رنگینی نے رنگین کے مذاق کو ترقی دے ہی کے چھوڑا۔ اور ریختی اُردو کا ایک فن ہو گیا جس کی ایجاد گو ایک دہلی ہی کے شاعر سے ہوئی تھی مگر لکھنؤ مین ہوئی۔ اور یہین اُسے فروغ ہوا۔ قصے کے سلسلے مین اس زبان کو میر حسن کے بعد نواب مرزا شوق نے جس اعلیٰ درجۂ کمال کو پہونچا دیا تعریف نہین ہو سکتی۔ صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جائیے یہی نہین پتہ چلتا کہ موزون کرنے مین شاعرانہ ضرورتون نے بولنے کی زبان پر کہین کچھ تصرف بھی کیا ہے یا نہین۔ لیکن غزل گوئی مین رنگین کی جانشینی جان صاحب نے کی جو لکھنؤ کے ایک معمولی شخص تھے اور عاشور علی خان کی خراد پر چڑھ کے تیار ہوے تھے۔ گو کہ جان صاحب کے بعد اور ریختی گو بھی لکھنؤ مین پیدا ہوے۔ مگر جان صاحب پر کمال اور شہرت کا خاتمہ ہو گیا۔ اُنھون نے غزلین کہین۔ واسوختی کہی اور اور بھی کئی نظمین کہین۔

ریختی مین اگر فحش اور بدکاری کے مذاق سے پرہیز کر کے پاکدامنی کے جذبات اختیار کیے جاتے تو یہ فن ایک حد تک قابل ترقی ہوتا۔ مگر خرابی یہ ہوئی کہ اس کی بنیاد ہی بدکاری کے جذبات اور بے عصمتی کے خیالات پر تھی۔ اس لیے ریختی گویون کا قدم ہمیشہ جادۂ تہذیب و اعتدال سے باہر ہو گیا۔ اور اس سے زبان کو چاہے کسی حد تک فائدہ ہوا ہو مگر اخلاق کو نقصان پہونچا۔

(۱۱)

نثر اُردو کی عمر نظم کے دیکھتے کم ہے۔ مدت تک تعلیم یافتہ لوگون کی یہ وضع رہی کہ اگرچہ بعض لوگ فارسی مین بھی شعر کہتے تھے مگر عام رجحان اور میلان اُردو غزل سرائی کی طرف تھا۔ اور ہندوستان مین اُردو شاعرون کی تعداد فارسی شاعرون سے بہت زیادہ تھی۔ مگر نثر مین سارے ملک کو فارسی ہی مین لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ علوم و فنون کی کتابین فارسی مین لکھی جاتین۔ دین و مذہب کی کتابین فارسی مین تصنیف ہوتین۔ یہان تک کہ بوڑھے سے لے کے بچے تک سب فارسی ہی مین خط و کتابت کرتے۔ بچون کو مکتب مین فارسی ہی کی انشائین پڑھائی جاتین اور فارسی ہی مین خط لکھنا اُنھین سکھایا جاتا۔ نتیجہ یہ تھا کہ بول چال مین اُردو زبان

چاہے کیسی ہی شیرین و فصیح ہو گئی ہو لکھنے کی ضرورت پیش آئی اور سب گونگے ہو گئے۔

پہلے پہل اُردو مین میر امّن دہلوی نے انگریزون کی حوصلہ افزائی و ہدایت سے اپنی کتاب چار درویش لکھی۔ اسی زمانے مین میرزا علی لطف نے اپنا تذکرۂ شعرائے اردو تصنیف کیا۔ جو عبداللہ خان صاحب مقیم حیدرآباد کی کوشش سے چھپ گیا ہے۔ اسی زمانے کے قریب مولوی اسمٰعیل صاحب شہید نے توحید و اتباع سنت پر اپنی کتاب تقویۃ الایمان تحریر فرمائی۔ جو کتابین اب چاہے جس نظر سے دیکھی جائین اُن دونون ادبی کمال دکھانے کے لیے نہین لکھی گئی تھین۔ اُن کی تصنیف سے صرف مقصود یہ تھا کہ بے تکلف اور سیدھی سادھی زبان مین مطلب ادا کر دیا جائے اور عوام فائدہ اُٹھا سکین۔ مذکورۂ بالا بزرگون کو اگر ادب اُردو کا کمال دکھانا ہوتا تو اُس زمانے کی انشا پردازی کے اصول کے مطابق ظہوری و نعمت خان عالی اور ابوالفضل و طاہر وحید کا رنگ اختیار کرتے جو اُسوقت ادبی دنیا پر حکومت کر رہا تھا۔ اور جسکے بغیر کوئی تحریر ملک مین قابل داد نہ تصور کی جاتی۔ تحریر ہی نہین گفتگو مین بھی اگر زیادہ تہذیب و شایستگی ملحوظ خاطر ہوتی تو وہی انداز اختیار کر لیا جاتا جیسا کہ سید انشا نے میرزا مظہر جانجانان کی تقریر کے چند الفاظ نقل کر کے بتا دیا ہے۔

سچ پوچھیے تو اُردو کی نثاری لکھنؤ ہی سے شروع ہوئی جبکہ پہلے مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب اور اپنی دوسری کتابون کو شایع کیا۔ اُسی زمانے مین نو طرز مرصع کے بعد نو رتن بھی لکھنؤ مین لکھی گئی جس کے مصنف محمد بخش مہجور شاگرد جرأت لکھنؤ ہی کی صحبت کے ساختہ و پرداختہ تھے۔

رجب علی بیگ سرور نے سچ یہ ہے کہ انشا پردازی کا اعلیٰ کمال دکھا یا ہے۔ اور جسوقت وہ کتاب شایع ہوئی ہے اُردو صحبتون مین حیرت کے ساتھ دیکھی گئی۔ مگر بدقسمتی سے اُنھون نے دیباچے مین میر امّن پر حملہ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اُن کے تمام کمالات اہل دہلی کے نزدیک خاک مین مل گئے۔ یہان تک کہ میر محمد حسین آزاد کے سے مہذب بزرگ بھی اُنھین "لکھنؤ کا شہدا" فرماتے ہین۔ اور معلوم نہین رجب علی

بیگ مرحوم سے اس گستاخی کا انتقام کب تک لیا جائے گا؟ میر امن کا ہنر انشا پردازی انگریزون کو اُن دنون چاہے نظر آگیا ہو مگر ہندوستان کے اہل زبان میں سے کسی کو نہ نظر آیا تھا اور نہ نظر آ سکتا تھا۔ اس لیے کہ انگریزی تعلیم کے اثر نے اُسوقت تک ملکی لٹریچر کا مذاق نہیں بدلا تھا۔ اور مشرقی ادب خیالون اور دماغون مین بسا ہوا تھا۔

ادبی رنگ کے متعلق مین نے کئی بار لکھا ہے اور پھر لکھتا ہون کہ وہ بالکل تعلیم اور مذاق کی پرورش سے وابستہ ہوتا ہے۔ جس طرح غذاؤن خوشبوؤن اور رنگون اور دیگر تمام چیزون کو گرد کی معاشرت پسندیدہ بنا یا کرتی ہے۔ اور مختلف قومون اور ملکون مین اس قدر اختلاف رہتا ہے کہ ایک کی لذیذ ترین اور محبوب ترین چیز دوسرے کے نزدیک نہایت ہی بدمزہ اور سخت قابل نفرت ہوتی ہے۔ ویسے ہی ادب اور لٹریری مذاق کا حال ہے کہ جو رنگ ایک قوم مین پرورش پاکے دماغون اور زبانون پر چڑھ جاتا ہے دوسری قوم کے نزدیک بیہودہ بے لطف اور بدمزہ ہوتا ہے اور صحیح فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا ہے۔

جاہلیت عرب مین فصاحت و بلاغت کا رنگ یہ تھا کہ مقفٰی فقرے لائے جائین عبارت مین تناسب و متداول الفاظ مترادف آئین۔ اور ایک ہی مطلب بار بار ادا کرکے موثر اور دلچسپ بنا یا جائے۔ اسی مذاق کو قرآن نے چونکہ وہ لسان قوم مین تھا نہایت معجزنما طرز سے تکمیل کو پہونچایا۔ پھر وہی مذاق ادب عربی کا عنصر اعظم بن گیا۔ آج کل کے معیار سے دیکھا جائے تو عربی کی فصیح ترین کتابین مقامات حریری و تاریخ تیموری وغیرہ مین قافیہ پیمائی۔ تطویل بیجا۔ اور بے ضرورت الفاظ لانے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جس کا مدتون اور صدیون تک ایک دنیا مزہ لیتی رہی ہے یہی رنگ فارسی کے ادیبون نے اختیار کیا۔ اور جو جو ادبی ترقی ہوتی گئی وہی رنگ پختہ اور گہرا ہوتا گیا۔ اور اُس مذاق کے دماغون مین بسے ہونے کی وجہ سے وہی رنگ اُردو کے اُدبائے اولین نے اختیار کیا اور دنیا سے داد پائی۔ لہذا یہ خیال کرنا کہ چار درویش جن دنون لکھی گئی ہے اُن دنون وہ سوا انگریزون کو پسند ہونے کے جو اُردو کو جانتے ہی نہ تھے ہندوستان کے اہل علم مین کوئی ادبی کمال تصور کی گئی ہو گی بالکل بے اصل ہے۔

اب انگریزی کے اثر سے بیشک ایسا زمانہ آگیا ہے جب اُردو کو پرانے لٹریچر نے جو زیور اور لباس پہنایا تھا اُتار لیا گیا اور نئے مغربی کپڑے پہنائے گئے۔ چار درویش اور اُس کی سی دوسری کتابیں چونکہ پرانے ادبی زیور ولباس سے معریٰ تھیں اس لیے لوگوں کو پسند آئیں۔ اس لیے نہیں کہ اُن میں کوئی خاص خوبی تھی بلکہ اس لیے کہ اُس پرانے مقبول عام قومی لٹریچر کے رنگ سے معریٰ تھیں جو موجودہ لوگوں کو ناپسند ہے۔

اسی زمانے میں لکھنؤ میں مولوی غلام امام شہید نے اپنا مشہور مولد شریف لکھا جو اُس وقت کے ادبی مذاق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا کہ لوگوں کو بہت پسند آیا۔ اور مذہبی مقبولیت کی وجہ سے آج تک بہت پسند ہے۔

مگر موجودہ نثر اُردو اصل میں دہلی ہی سے نکلی اور ہمیشہ دہلی کی زیر بار احسان رہے گی۔ مرزا غالب نے اُردو انشا میں بے تکلفی کا رنگ اختیار کیا جو موجودہ مذاق سے بہت ہی قریب ہے۔ اگرچہ وہ بھی کبھی کبھی قافیہ بندی کی رعایت کرجاتے ہیں لیکن اس بے تکلفی کے ساتھ کہ پڑھنے والے کو قافیہ کا خیال بھی غور کرنے سے آتا ہے۔ موجودہ تعلیم نے لوگوں کو اس رنگ کو قبول کرنے کے لیے خوب تیار کر دیا تھا۔ ہر صحبت میں واہ واہ ہونے لگی۔ اُنکے بعد سرسید نے اس سادگی میں متانت پیدا کی مگر اس کوشش کے ساتھ کہ زبان دقیق نہ ہونے پائے۔ اور ایسی رہے کہ ہر ادنیٰ واعلیٰ اُسے سمجھ لے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس میں متانت کے ساتھ ادبی لطف پیدا کر دیا۔ جبکہ لکھنؤ کے لوگ انگریزی کے اثر سے دُور ہونے کے باعث ہنوز پرانے ہی رنگ کے دیوانے تھے۔ یہاں واجد علی شاہ کے آخر ایام زندگی تک رنگین اور مقفیٰ عبارت لکھی جاتی تھی اور لوگوں کو اس سادگی کا مزہ نہیں ملنے پایا تھا۔

اب علی گڈھ سے تہذیب الاخلاق۔ آگرے سے تیرھویں صدی اور لکھنؤ سے اودھ پنچ نکل رہے تھے جن میں سے ہر ایک نثر اُردو کی ایک ممتاز شان رکھتا تھا۔ تہذیب الاخلاق میں متانت اور عالمانہ وقار کے ساتھ قومی درد کا سوزوگداز تھا۔ سلجھی ہوئی صاف زبان تھی۔ اور نئے مغربی فلسفہ وادب سے لیے ہوے خیالات اور اثر ڈالنے والے مضامین وخطبات تھے۔ تیرھویں صدی میں اعلیٰ منشیانہ قابلیت

کے ساتھ قدیم ادبی مذاق کی نگہداشت نئی خیال آرائیون اور جدتون کے ساتھ کی جاتی تھی۔ اور پرانا مشرقی لٹریچر کچھ ایسی جدت طرازیون کے ساتھ نئے لباس مین ظاہر کیا جاتا تھا۔ کہ نئے اور پرانے دونون گروہون سے بے اختیار "واہ واہ" کے نعرے بلند ہوتے تھے۔

اودھ پنچ مین زبان اپنی اصلی شان مین دکھائی جاتی تھی۔ جس مین مذاق کا پہلو غالب رہتا۔ اس مین مختلف لکھنے والے تھے اور ہر ایک کا مذاق خاص لطف اور خاص خوبیان رکھتا تھا۔ منشی سجاد حسین ایڈیٹر کی شوخیان۔ مرزا مچھو بیگ صاحب کی کوثر کی دھوئی ہوئی زبان۔ منشی احمد علی کسمنڈوی کی فارسیت کی اعلیٰ ادبی اور شاعرانہ دلچسپیان ظاہر کرنے والا رنگ۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر کی ہندی نظمین اور اُنکی خوبیون کو نہایت دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرنے والے مضامین اُردو نثر مین ایک عجیب زندگی و شگفتگی پیدا کر رہے تھے۔

اسی اثنا مین اودھ اخبار کے ساتھ پنڈت رتن ناتھ کا ناول "فسانۂ آزاد" شایع ہونا شروع ہوا۔ جس نے ملک پر بہت بڑا اثر ڈالا۔ اور اُردو دنیا ناول نویسی کے مذاق سے آشنا ہو کے اُسکی بے انتہا فریفتہ ہو گئی۔ فسانۂ آزاد مین جہان مصنف نے اپنے قلم سے کوئی سین دکھایا ہے یا کوئی واقعہ لکھا ہے وہی فسانۂ عجائب کا پُرانا رنگ ترقیون کے ساتھ اختیار کیا ہے اور جہان دوسرون کی زبان سے گفتگو کرائی ہے بہت ہی سادی اور بے تکلف زبان رکھی ہے۔ خصوصاً عورتون کی زبان بہت ہی پاکیزہ ہے۔ گو کہ جابجا غلطیان بھی ہو گئی ہین۔ مگر سچ یہ ہے کہ اپنی کوشش مین وہ جس درجے تک پہونچ گئے ہین اُن سے پہلے کوئی نہین پہونچا تھا۔

یہی زمانہ ہے جبکہ مولوی نذیر احمد صاحب نے گورنمنٹ کی فرمایش سے تعزیرات ہند کا ترجمہ کیا اور اپنی کتابون کے ذریعے سے ایک ایسی زبان ملک کے سامنے پیش کی جو کہین روانی اور صفائی مین بے نظیر ہے اور کہین لغات عربی سے مملو ہونے کے باعث سخت دقیق و بلیغ۔ اور اسی عہد مین مولوی محمد حسین صاحب آزاد کا لٹریچر ایک بہت ہی پسندیدہ رنگ پیش کر رہا تھا۔ خصوصاً اُنھون نے زبان اُردو کی تاریخ اور تذکرۂ شعرائے اُردو لکھ کے ادب اُردو مین خاص ناموری حاصل کی۔

اسی زمانے مین ۱۸۸۲ء مین محشر نام ایک ہفتہ وار رسالہ مین نے مولوی محمد عبد الباسط صاحب محشر کے نام سے نکالا ۔ جس کے ذریعے سے اڈیسن کا رنگ اردو مین ایسے دلکش عنوان اور موزون ومناسب الفاظ وخیالات مین پیش کیا گیا کہ ملک یک بیک چونک سا پڑا ۔ ساتھ ہی میرے مضامین اودھ اخبار کے کالمون مین شایع ہونا شروع ہوے جنھون نے ملک کے سامنے ایک بالکل نیا لٹریچر پیش کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ہر طرف سے مرحبا کی صدائین سُنی جانے لگین ۔ یکایک نظر آیا کہ اکثر مضمون نگار اُسی رنگ کو اختیار کر رہے ہین ۔ اور ملک کا عام رجحان اُسی طرف ہے ۔ اُسی درمیان مین مین نے اپنا ناول دلچسپ اور موثر ڈراما شہید وفا ملک کے سامنے پیش کیا ۔ اور ہر طرف سے حوصلہ افزائی ہونے لگی ۔

آخر ملک کا اصرار وتقاضا دیکھ کے آغاز ۱۸۸۷ء سے مین نے رسالہ دلگداز جاری کیا جس کا لٹریچر انگریزی دانون اور پُرانے مذاق کے لوگون دونون مین مقبول ہوا ۔ پھر ۱۸۸۸ء سے اُس کے ساتھ تاریخی ناولون کا سلسلہ جاری کیا گیا جن مین سب سے پہلا ناول "ملک العزیز ورجنا" ہے ۔ ان ناولون کو ملک نے جس شوق سے لیا اُس کے بیان کرنے کی تو ضرورت نہین ہے مگر اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ اُنھین ناولون کی وجہ سے واقعات کے معلوم کرنے اور کتابون کے مطالعے کا شوق بڑھنے کی بنیاد پڑی ۔ اُنھین ناولون کے ذریعے سے ملک مین تاریخ کے پڑھنے اور واقعات عالم سے دلچسپی حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا ۔ اور اُنھین ناولون اور دلگداز کے مضمون نے وہ رنگ پیدا کیا جس پر موجودہ ادب اُردو کی بنیاد قائم ہے ۔

ہر حال نثر اُردو کا تعلق جہان تک پُرانے ادبی رنگ سے ہے اسکی بنیاد لکھنؤ مین پڑی ۔ ہان جدید رنگ کا آغاز دہلی سے ہوا مگر اس کوشش مین جہان تک ممکن ہوا لکھنؤ نے دہلی کی رفاقت کی ۔ خصوصاً ظرافت کا مذاق تو لکھنؤ ہی سے پیدا ہوا اور لکھنؤ مین تکمیل کو پہونچا ۔

لیکن زبان اُردو کو جو ترقیان لکھنؤ مین حاصل ہوئین وہ شاعرون - ادیبون - نثارون اور مصنفون ہی تک محدود نہین بہین مختلف سوسائٹیون اور طبقون مین ترقی دوست زبان کی نئی نئی صورتین پیدا ہوئین جنھون نے ہرگروہ والون کے لیے خاص دلچسپیان پیدا کین -

ان مین سے زیادہ قابل توجہ داستان گوئی ہے - جو دراصل فی البدیہ تصنیف کرنے کا نام ہے - یہ فن اصل مین عربون کا ہے جہان عہد جاہلیت مین بھی داستان گوئی کی صحبتین مرتب ہوا کرتی تھین - لیکن ہندوستان کی داستان گوئی کی نسبت ہم نہین جانتے کہ عرب کی قصہ خوانی سے اُن کا کوئی رشتہ ہے یا نہین - امیر حمزہ کی داستان جو داستان گوؤن کی اصلی اور حقیقی جولان گاہ ہے وہ دراصل فارسی مین تھی اور کہتے ہین کہ شہنشاہ اکبر کے زمانے مین امیر خسرو نام ایک قابل شخص نے اُسے تصنیف کیا - تاریخ سے ثابت ہے کہ فوک تغلق کے عہد مین داستان امیر حمزہ موجود تھی -
دہلی کے مشہور داستان گو لکھنؤ مین آنا شروع ہوے - یہان امیرون نے اُن کی یہان تک قدر کی کہ داستان سننے کو اپنی صحبتون کا ایک عنصر اعظم قرار دے لیا - چند ہی روز مین لکھنؤ کے اندر اس کو اس قدر فروغ ہو گیا کہ کوئی دولتمند نہ تھا جس کی سرکار مین کوئی داستان گو نہ مقرر ہو - سیکڑون داستان گو پیدا ہوگئے - سچ تو یہ ہے کہ ہمارے آج کل کے مقبول سے مقبول اسپیکرون مین سے ابھی تک کسی کو فصیح البیانی مین وہ درجہ نہین نصیب ہوسکا ہے جو قادر الکلام داستان گوؤن کو حاصل تھا - دہلی مین بھی دو ایک صاحب کمال داستان گو آج تک پڑے ہین مگر لکھنؤ مین اُن کا شمار بہت زیادہ ہے - اور اُن کے طرز تقریر کا اثر عوام شہر کی زبانون پہ بےحد پڑ گیا ہے - ناولون کا ذوق پیدا ہونے کے بعد جب اس بات کی کوشش کی گئی کہ داستان کو داستان گوؤن ہی کی زبان مین قلمبند کرا لیا جائے تو لکھنؤ ہی ایسے باکمال داستان گو پیش کر سکا جنھون نے ضخیم جلدین لکھ کے اُردو دان پبلک مین پھیلا دین - چنانچہ جاہ اور قمر کے تصانیف ملک مین بڑی قدر کی نگاہون سے دیکھے جاتے ہین -

داستان کے چار فن قرار پاگئے ہین - رزم - بزم - حسن وعشق اور عیاری -

ان چاروں فنون میں لکھنؤ کے داستان گوؤں نے ایسے ایسے کمال دکھائے ہیں جن کا اندازہ بغیر دیکھے اور سُنے نہیں ہو سکتا۔ الفاظ میں تصویر کھینچنا اور تصویروں کا نہایت گہرا دیرپا اثر سامعین کے دلوں پر ڈال دینا ان لوگوں کا خاص کمال ہے۔

سوشل تفنن۔ مذاق ظرافت۔ اور دل لگی کے عنوان سے بھی لکھنؤ میں علم زبان کے کئی فن پیدا ہو گئے جن میں کوئی مقام لکھنؤ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ انھیں میں سے ایک فن پھبتی کہنا ہے۔ اسکو دراصل شاعرانہ تشبیہ و استعارے سے تعلق ہے لیکن اس میں اتنی خصوصیت ہے کہ یہ کسی کو بگاڑ کے دکھانے۔ اُسکے عیب کے نمایاں کرنے۔ اور برجستہ کوئی انوکھی۔ ہنسانے والی اور عیب و نقصان ظاہر کرنیوالی تشبیہ پیش کر دینے تک محدود ہے۔ لکھنؤ کے ادنیٰ ادنیٰ لڑکے۔ بازاری عورتیں۔ جاہل دُکاندار۔ ادنیٰ طبقوں کے اہل حرفہ تک ایسی برجستہ پھبتیاں کہہ جاتے ہیں کہ باہر والوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ ایک صاحب کربلاے معلّےٰ کی زیارت کر کے واپس آئے اور براق کپڑے پہن کے دوستوں میں آکے بیٹھے ہی تھے کہ ایک لونڈے نے کہا "آئیں یہ فرات کا بگلا کہاں سے آگیا؟"۔ ایک بوڑھے دولھا خضاب کر کے دولھن بیاہنے کو آئے اور بڑی دھوم کی برات لائے۔ زنانے سے نکل کے وہ محفل میں آرہے تھے۔ جوتا اُتارنے کے لیے جُھکے اور چند قدم فرش پر گھٹنے ٹیک کے چلے۔ کسی کی زبان سے نکلا "دولھا کہاں ہیں؟" شوخ مزاج رنڈی جو کھڑی مجرا کر رہی تھی ہنس کے بولی "اے وہ مینوں مینوں چلا تو آتا ہے"۔ ایک کبڑا چوک میں پونڈے بیچ رہا تھا صدا یہ تھی کہ "ارے بھئی یہ کنکوے کون لوٹے گا؟" کیا اس سے زیادہ بامذاق کوئی استعارہ ہو سکتا ہے؟ نازک ترین استعارہ وہ ہے جس میں مشبہ اور مشبہ بہ دونوں کا نام نہ لیا جائے۔ صرف مشبہ بہ کی کوئی خصوصیت بتا کے کلام میں لطف پیدا کر دیا جائے۔ اس کی اس سے بہتر مثال کون ہو سکتی ہے کہ نہ پونڈے کا نام لیا نہ لگّے کا جس سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں۔ صرف اتنا کہہ کے کہ "کنکوے کون لوٹے گا" یہ بتا دیا کہ یہ پونڈے لگّوں کے برابر ہیں جن سے کنکوے لوٹے جاتے ہیں۔ اور پھر اس سے زیادہ مناسب اور بازاری لوگوں کے مذاق کی کوئی تشبیہ نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح کی صدہا ہزارہا مثالیں ہیں جو یہاں کی

صحبتون مین اُٹھتے بیٹھتے ہر وقت سُنی جاتی ہین۔

دوسرا "ضلع" ہے۔ یہ دراصل شاعرانہ رعایت ہے جس نے عوام کی بات چیت اور مذاق کی گفتگو مین آکے خاص رنگ پیدا کرلیا ہے۔ ضلع مین کوشش کی جاتی ہے کہ جس چیز کا تذکرہ آجائے اُس کے تمام متعلقات کسی نہ کسی پہلو سے باتون مین لے آئے جائین۔ آزاد فقیر جو ایک خاص وضع رکھتے تھے ضلع بولنے مین باکمال مانے جاتے تھے۔ امانت نے اپنی شاعری مین رعایت کی اس قدر کوشش کی کہ تمام شاعرانہ خوبیون سے قطع نظر کرکے رعایت ہی کو اپنا مقصد قرار دے لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کا کلام شاعری کے درجے سے نکل کے ضلع بولنے کے حکم مین داخل ہوگیا۔ مگر لکھنؤ کے اکثر عوام نے اپنی بے تکلفی کی صحبتون مین اس فن کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ امانت کی شاعری پیچھے پڑ گئی۔ سچ یہ ہے کہ کسی جگہ کے لوگ ضلع بولنے مین اہل لکھنؤ کے عُشرِ عشیر درجے کو بھی نہین پہونچ سکتے۔ اس فن مین ایک کتاب بھی شایع ہوگئی

تیسرا فن "تُک بندی" ہے۔ یہ شاعری کی قافیہ پیمائی ہے۔ بہت سے جاہل جب ادھر توجہ کرتے ہین تو جواب سوال مین اس طرح فی البدیہہ قافیہ استعمال کرتے ہین کہ بڑے بڑے شعرا کو حیرت ہوجاتی ہے۔ ہم نے اپنے طالب علمی کے زمانے مین ایک ہندو بُڑھیا کے کاتے والا دیکھا تھا جو صبح کو خوانچہ لگا کے نکلتا۔ صورت دیکھتے ہی صدہا بازاری لونڈے اُسے گھیر لیتے۔ اور وہ سرِراہ خوانچہ رکھ کے بیٹھ جاتا۔ فوراً لونڈون سے اُس سے تُک بندی مین مقابلہ شروع ہوجاتا سارا مجمع ایک طرف ہوتا۔ فریقین مین گالیون کی بوچھار ہوتی۔ مگر شرط تھی کہ کوئی گالی تُک سے باہر نہ ہو۔ اور کوئی قافیہ رہ نہ جائے۔ ہم نے اُسے بیسیون بار دیکھا۔ گھنٹون اُس سے مقابلہ رہتا۔ مگر ہم نے کبھی نہین دیکھا کہ وہ جواب مین کبھی عاجز رہا ہو۔ کوئی نہ کوئی قافیہ ڈھونڈھ کے پیش ہی کر دیتا تھا۔

اسی طرح مذاق اور گفتگو مین طرح طرح کی خیال آفرینیان ہوتی تھین۔ اور جاہل عوام بعض وقت ایسے خیالات پیش کر دیا کرتے تھے کہ بڑے بڑے شعرا حیرت مین رہ جاتے۔ یہ زمانہ دراصل لکھنؤ کا گولڈن ایج تھا۔ شاعری اور ادبی خوبیان لوگون کے رگ و پے مین سرایت کر گئی تھین۔ ہر شخص جو معمولی طور پر پڑھنے مین شُدبُد

ہو جاتا طبع آزمائی شروع کر دیتا - جہلا و عوام - ادنیٰ طبقے کے لوگون - اور گھر کی بیٹھنے والی عورتون تک مین شاعرانہ لوچ اور ادبی نزاکتین پیدا ہو گئی تھین - اَن پڑھ کبڑیے شاعر تھے - اور جہلا کی زبان بھی اس قدر شستہ و رُفتہ - اخلاقی حفظ مراتب کے الفاظ سے مملو - اور تمدنی آداب سے لبریز تھی کہ اکثر صاحب علم اُن کی گفتگو سُن کے ششدر رہ جاتے - اور کسی کو اُن پر جاہل ہونے کا گمان بھی نہ ہوتا - سودا بیچنے والون کی صدائین شاعرانہ نکات اور فصاحت و بلاغت کے غوامض سے اس قدر آراستہ و پیراستہ تھین کہ اورون کو سمجھنا بھی دشوار تھا -

ادنیٰ طبقے والون نے بھی اپنے مذاق کے مطابق خاص ادبی دلچسپیان پیدا کر لی تھین - مثلاً ایک فن خیاؔل کا پیدا ہو گیا - لوگ فی البدیہہ اشعار تصنیف کر کے دائرے پر گاتے - اس کا نام خیال اس لیے رکھا گیا کہ ہر شخص اپنی تخییل کا جوہر دکھائے اور کوئی نئی بات پیدا کرے - اس فن مین یہان بہت سے باکمال پیدا ہوے جن کو اعلیٰ سوسائٹی اور تعلیم یافتہ لوگون کی صحبتون سے گو کوئی تعلق نہ تھا مگر بجاے خود اگر غور کیجیے تو وہ اصلی اور فطری شاعری تھی اور اسی وضع کی شاعری جیسی کہ عہد جاہلیت عرب مین تھی -

اسی طرح ایک گروہ ڈنڈے والون کا پیدا ہو گیا - ان لوگون کی یہ شان تھی کہ قریب کے زمانے کے اہم اور مشہور واقعات کو کمال آزادی کے ساتھ موزون کرتے - جو جیسا ہوتا چاہے وہ کتنا ہی بڑا صاحب اثر اور دولتمند ہو اُسے ویسا ہی بڑی بیباکی سے دکھاتے - اور ثابت کرتے کہ ملک و قوم کو اُس سے کیا فائدہ ہوا یا کتنا بڑا ضرر پہونچا - پھر اپنی اُن نظمون کو ایک شعر خوانی کی خاص وضع مین ڈنڈے بجا بجا کے سُناتے -

عورتون کی زبان مردون کے مقابل ہر ملک اور ہر قوم مین زیادہ شستہ اور دلکش ہوتی ہے - مگر لکھنؤ مین یہ خاص بات تھی کہ محلات اور محترم خاندان کی معزز بیگمون کی زبان مین علاوہ نسائی دلفریبیون کے ادبی اور شاعرانہ نزاکتین پیدا ہو گئی تھین - باتین کرتین تو معلوم ہوتا کہ منہ سے پھول جھڑ رہے ہین - اور غور کیجیے تو صحت الفاظ - پیاری بندشین - اور طرز ادا کی نزاکتین بتاتین کہ زبان

مذہب کی تردید کی ہے۔ اور اب ہم دیکھتے ہین کہ مولوی عبد الشکور صاحب بھی اس فن مین اہل سنت کی طرف سے نمود حاصل کر رہے ہین۔

ہمارے مذاق مین مذہبی ردو قدح چاہے کسی فریق کے لوگون کو خوش کرے مگر بالکل بے نتیجہ چیز ہے۔ اور اس کے نفع سے مضرت بڑھی ہوئی ہے۔ لیکن اس موقع پر ہمین صرف یہ دکھانا ہے کہ اس فن مین بھی لکھنؤ نے جو عروج حاصل کیا ہے اس سے پہلے کبھی کسی شہر کو نہین نصیب ہو سکا تھا۔

علوم دینیہ مین سے لکھنؤ مین تفسیر۔ حدیث۔ رجال۔ اور تاریخ کی کمی تھی۔ ان مین سے تفسیر کا فن ایک معمولی درجے تک لکھنؤ مین موجود تھا۔ اور جتنا تھا اُس سے زیادہ اور بھی کہین نہ تھا۔ تاہم بعض شہرون مین بعض نامور مفسر گذرے ہین مگر اُن کا تبحر و کمال اُنھین کی ذات تک محدود رہا اور اُنھین پر ختم ہوگیا۔ حدیث کو دہلی ہی کے ساتھ خصوصیت رہی۔ آخر عہد مین مولانا محمد عبد الحی مرحوم مکۂ معظمہ کے شیوخ حدیث سے درس و روایت حدیث کی سند حاصل کر کے آئے اور سلسلۂ درس بھی جاری کر دیا۔ مگر اس فن کو یہان اچھا نشو و نما نہین ہونے پایا۔ رجال کا فن حدیث کے تابع ہے۔ حدیث مین جس قدر توغل بڑھتا ہے اُسی قدر فن رجال مین انسان کی بصیرت بڑھتی جاتی ہے۔ لہذا علماے لکھنؤ جس قدر حدیث کے فن مین ناقص تھے اُسی قدر رجال مین بھی ناقص رہ گئے۔ باقی رہی تاریخ اس فن کو ہندوستان مین کبھی عروج نہین حاصل تھا۔ اس مین شک نہین کہ سوسائٹی کی ضرورت سے فارسی دانون مین تاریخ کا بہت کچھ مذاق تھا۔ مگر علماے ہند نے اس فن کو افسانہ خوانی سے زیادہ وقعت کبھی نہ دی۔ جس کی وجہ سے عموماً علما مین ایک بہت بڑا نقص رہ جاتا تھا۔ اور یہی چیز تھی جس نے ہندوستان کے بچے بچے کے ذہن مین یہ خیال پیدا کر دیا کہ "عالمون کو زمانہ شناسی سے کیا کام؟ وہ لوگ تو سیدھے سادے جنتی ہوتے ہین۔"

لیکن زمانے کی ضرورتین دیکھ کے دونون فریق کے علما نے اپنے نصابون مین مناسب اضافہ شروع کر دیا ہے۔ اور دوسری طرف ندوۃ العلما کا دار العلوم قائم ہے جو ان ضروری علوم کی طرف خاص توجہ کر رہا ہے جو اسوقت تک متروک تھے۔

لیکن ان نقصانات کے ساتھ بھی لکھنؤ مین جو کچھ ہوا دیگر مقامات سے بہت زیادہ ہی۔

(۱۴)

یہ ہم بتا چکے ہین کہ شیعہ خاندانِ اجتہاد اور فرنگی محل کے علماے اہلِ سنت کی برکت سے اس [illegible]ی دربار کے عہد مین علم و فضل نے لکھنؤ مین کیسا عروج حاصل کیا اور اپنی سواد مین کیسی علمی کشش اور مرجعیت پیدا کرادی۔ لیکن ابھی ہمین طب یونانی سے بحث کرنا باقی ہے۔

یہ شریف ترین فن جس کو عالم انسانی کے محفوظ رکھنے اور نسل انسانی کو ترقی دینے سے واسطہ ہے کیونکہ اس کا ظہور ہر قدیم ملک مین خود رو طریقے اور جزئی تجربات سے ہوا ہے۔ قدیم الایام مین مغرب کی طرف اہل یونان نے اس فن مین بہت ہی نمایان ترقی کی تھی۔ اور مشرق مین ہندوون کے ناموران سلف نے اسے اعلیٰ درجۂ کمال پر پہونچا دیا تھا۔ مسلمانون مین جب دربار خلافت قائم ہوا تو یہ فن دونون جگہ سے آیا اور دونون سرزمینون کے حاذق اطبا دربارِ بغداد کے طبیب تھے۔ ابتدا [illegible] ایک صدیون تک تمام مستند اطباے دربارِ عباسی ہندو تھے۔ عیسائی تھے۔ یہودی تھے۔ مگر مسلمان نہ تھے۔ مگر اس دور کے اطباے باکمال چاہے کسی مذہب کے پیرو ہون آغوش اسلام کے پروردہ اور عالم اسلامی کے ممتاز ناموَر تھے۔ اور انھین کے ہاتھون سے فن طب ایک نئی شان اور نئے عنوان سے مدوّن و منضبط ہونا شروع ہوا جس مین تھوڑی اصلاح اور رد و بدل کے بعد اصولی ترتیب تو یونانیون کی برقرار رکھی گئی مگر تجربات ہر ملک اور ہر قوم کے یکسان طور پر لیے گئے۔

اس کے چند روز بعد مسلمان اطباے ناموَر پیدا ہونا شروع ہوے۔ اور انھون نے فن طب کو اپنے اجتہادون اور اپنے تجربات سے اپنا بنانا شروع کیا۔ یہان تک کہ ابن سینا نے قانون کی سی بے نظیر و لاجواب کتاب لکھ کے دنیا کے ہاتھ مین دیدی۔ اور اُسکے آگے مشرق و مغرب کی تمام قومون نے سر جھکا دیا۔ اُدھر دربارِ اندلس نے عمل بالید اور تجربات مین مشرق سے بھی زیادہ ترقی کی۔ اور فنِ طب مسلمانون کا خاص فن بن گیا جس کے مرجع و ماوی ہر جگہ وہی تھے۔ ہر قوم اُسے

انھیں سے حاصل کر رہی تھی۔ اور اُسی پر یورپ کی موجودہ ڈاکٹری کی عمارت قائم ہوئی جس کو زیادہ تعلق اُندلس کے اسلامی طبی اسکول سے تھا۔

لیکن ادھر آخری صدیوں میں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو اس کا اثر سب سے پہلے اُن کے علوم و فنون میں اور سب سے زیادہ فن طب میں نمایاں ہوا۔ اور اکثر ممالک میں اُس کی وہی حالت ہو گئی جو عروج یونان کے آغاز میں تھی یعنی معمولی قابلیت کے لوگ بغیر اس کے کہ فن کی اعلیٰ ترین کتابوں پر اُن کی نظر پڑی ہو اپنے جزئی تجربوں سے لوگوں کا علاج کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے ہی روز میں مصر و عرب شام و عراق فن جاننے والے طبیبوں سے خالی ہو گئے۔ صرف ایران اور ہندوستان میں یہ فن باقی تھا۔ لیکن اس پچھلی صدی میں ایران کے طبیبوں سے خالی ہو گیا۔ اور تمام ممالک اسلام میں اپنے اس فنِ قدیم کے متعلق یہی جہالت تھی کہ جب یورپ کے فرانسیسی اور انگریز ڈاکٹر نمودار ہوئے تو عوام و خواص سب کو ایک نعمتِ الٰہی نظر آئے۔ اور کسی کو اس کی حس نہ تھی کہ یہ اصلی فن ہمارا ہی تھا یا ہمارے یہاں بھی کبھی اطبا ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی طب کو اگر فنا ہونے سے بچایا تو صرف ہندوستان نے۔ جہاں آج تک اطبائے یونانی یورپ کے جدید اصناف طب کا مقابلہ کامیابی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ اور باوجودیکہ خیراتی ہسپتال گاؤں گاؤں موجود ہیں مگر پھر بھی لوگوں کو جو اعتبار یونانی اطبا کے علاج پر ہے ڈاکٹروں پر نہیں۔

دہلی میں اگلے دنوں اس فن کے بہت سے باکمال گذرے جن میں حکیم ایرانی۔ حکیم شفائی خان۔ حکیم علوی خان۔ حکیم محمد شریف خان بہت اعلیٰ شہرت و کمال کے اطبا گذرے ہیں۔ لکھنؤ میں برہان الملک کے زمانے سے دہلی کے حاذق اطبا سرزمین اودھ میں آنا شروع ہو گئے۔ خصوصاً شجاع الدولہ کے عہد میں تو دہلی کے دو ایک طبیبوں کے سوا جتنے تھے سب یہیں چلے آئے۔ فیض آباد کی تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں جتنی سرکاریں تھیں ان میں سے ہر ایک سے کوئی یونانی طبیب ضرور وابستہ تھا۔ جن کا بہت کچھ ادب اور پاس و لحاظ کیا جاتا۔ اور ماہوار تنخواہ کے علاوہ روزانہ انعام و اکرام سے سرفراز ہوتے رہتے۔

آصف الدولہ کے زمانے سے جب لکھنؤ کمالون کی قدردانی کا مرکز قرار پایا تو دہلی کے بہت سے خاندانی اطبا نے یہین توطن اختیار کرلیا۔ اور چند روز کے بعد زبان اور شاعری کی طرح فن طب بھی خاص یہین کا فن بن گیا۔ چنانچہ لکھنؤ نے حکیم مسیح الدولہ حکیم شفاء الدولہ۔ حکیم مرزا محمد علی۔ حکیم سید محمد مرتعش۔ حکیم مرزا کوچک۔ حکیم بنا۔ حکیم مرزا محمد جعفر کے ایسے عالی پایہ وگران قدر طبیب پیدا کیے جو سچ یہ ہے کہ اپنے فنون کے مجتہد تھے۔ اور سلف کے سارے سرمایۂ علمی پر اُن کی نظرین تھین۔ ہوتے ہوتے فن طب کو یہان تک ترقی ہوئی کہ لکھنؤ کا شاذ و نادر ہی کوئی محلہ ہوگا جس مین کوئی نامور خاندان اطبا نہ موجود ہو۔ خاص شہر کے صدہا محلون کے علاوہ گرد و نواح کے گانون اور قصبون مین بھی ہزارون مطب جاری تھے۔ اور ہندوستان کے جن دربارون اور شہرون مین مشہور و نامور طبیب تھے سب لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے تھے۔ چنانچہ قصبۂ موہان کے ایک طبیب کو دربار گیکواڑ بڑودہ مین وہ عزت حاصل ہوئی جو بہت کم اطبا کو حاصل ہو سکی ہوگی۔ غرض ایسے نامور طبیب خاک لکھنؤ نے پیدا کیے جن کی مسیحا نفسی کے کارنامے آج تک بچے بچے کی زبان پر ہین۔

دربار اودھ کے آخر عہد مین سید محمد مرتعش کے ایک شاگرد رشید حکیم محمد یعقوب نے اپنا مطب جاری کرکے ایسی مرجعیت عامہ حاصل کی کہ اُن کی ذات سے ایک بہت بڑے نامور طبی خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔ جو آج بلا مبالغہ دنیا بھر مین جواب نہین رکھتا۔ اسی خاندان کے مرحوم ناموروں مین حکیم محمد ابراہیم۔ حکیم حافظ محمد عبد العلی۔ حکیم محمد اسمٰعیل۔ حکیم محمد مسیح۔ حکیم محمد عبد العزیز۔ حکیم حافظ محمد عبد الولی تھے۔ اور حکیم عبد الحفیظ صاحب۔ حکیم عبد الرشید صاحب۔ اور حکیم عبد المعید صاحب اسوقت اپنی مسیحائی کے کمالات دکھا رہے ہین۔ کاش یہ اپنے خاندانی فن کو چھوڑ کے دوسری ہوسون مین نہ پڑتے۔

دہلی مین حکیم محمد شریف خان کا خاندان اسوقت تک موجود ہے۔ جس مین حکیم محمود خان اور حکیم عبد المجید خان کے ایسے باکمال گذر چکے اور حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب بزرگون کے نام کو اپنے ذاتی کمالات سے آج تک نمایان کر رہے ہین۔ دہلی مین حکیم محمد اجمل خان صاحب نے ایک مدرسۂ طبیہ بھی جاری

کر دیا ہے اور طبی ویدک کانفرنس قائم کر کے اپنے فن کو بہت عروج دے رہے ہین۔ اُن کے مقابل لکھنؤ مین حکیم عبد العزیز صاحب نے مدرسۂ تکمیل الطب قائم کیا جس سے ہر سال بیسیون اطبا تیار ہو کے اقطار ارض مین پھیلتے اور لکھنؤ کی طبی مرجعیت کا ثبوت دیتے ہین۔

بہر تقدیر مسلمانون کا برائے نام یونانی فن طب آج اگر دنیا بھر مین کہین زندہ ہے تو ہندوستان مین۔ اور ہندوستان مین اسکے مرکز دو ہی شہر ہین۔ دہلی اور لکھنؤ۔ مگر دہلی مین صرف ایک حکیم محمود خان کا خاندان ہے۔ اور لکھنؤ مین ایسے بیسیون خاندان پڑے ہین۔ دہلی مین بعض اور اطبا بھی مطب کرتے نظر آتے ہین مگر وہ اسی زمانے کے جدید طبیب ہین جنھون نے اپنے مطب جما لیے ہین۔ لکھنؤ مین گو کہ بہت سے نئے طبیب ہین۔ لیکن ایسے بہت سے خاندان بھی ہین جن مین صدیون سے فن طب کو ترقی رہی۔

لکھنؤ اور دہلی کے اطبا مین ایک اور فرق بھی ہے۔ طب کا موجودہ نصاب تعلیم ہمین نہین معلوم اطبائے دہلی کا مرتب کیا ہوا ہے یا اطبائے لکھنؤ کا۔ لیکن اس پر پورا پورا عمل جیسا اطبائے لکھنؤ نے کیا اطبائے دہلی نہین کرتے۔ پڑھائی وہان بھی یہی کتابین جاتی ہین مگر دہلی مین طبیبون کا مطب ایک بڑی حد تک اُن کی مدونہ طب سے الگ ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ اُنھون نے ویدک کی دواؤن کے اختیار کر لینے مین اسی قدر نہین کیا کہ اُن نئے اجزا کو اپنے مطب مین داخل کر لیا بلکہ یہ بے احتیاطی بھی کی کہ اُن کے داخل کرنے مین اپنے قدیم مدونہ و مسلمہ اصول خصوصاً مزاج کے مباحث سے چشم پوشی کر لی۔ اور اُن اجزا کو استعمال کرا دیتے ہین جن کے مزاج اور افعال و خواص سے وہ پوری طرح واقف نہین ہین۔ وہان فی الحال سب سے بڑی شکایت یہ سُنی جاتی ہے کہ مدرسۂ طبیۂ دہلی کے نصاب مین تشریح کے علاوہ ڈاکٹری کے دیگر اصول بھی اس کثرت اور بے احتیاطی سے اختیار کر لیے گئے ہین کہ اصلی فن طب بجائے ترقی کرنے کے بالکل مٹا جاتا ہے۔ یہی بے احتیاطی اُنھون نے پہلے اصول ویدک کے اختیار کرنے مین کی تھی اور یہی اب اصول ڈاکٹری کے لینے مین ہو رہی ہے۔ ایسی حالت مین دہلی مین ہمارے قدیم

فن طب کا جو انجام ہوتا نظر آتا ہے نہائت خطرناک ہے۔
برخلاف اس کے لکھنؤ کے تمام طبی خاندانون خصوصاً حکیم یعقوب صاحب مرحوم کے خاندان اور تکمیل الطب مین اصلی اصول طبی کے قائم رکھنے اور انکو انھین کے دائرے مین رکھکے ترقی دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اُن کے مطب اس وقت تک اپنے فن اور اپنی کتابون سے ذرا بھی جدا نہین ہین اور ایسی سلامت روی کے راستے پر جا رہے ہین۔ جس سے امید ہو سکتی ہے کہ شاید اسلامی طب دست برد زمانہ سے بچ جائے۔ اگرچہ اصلی خدمت فن سے یہ لوگ بھی ہنوز بہت دور ہین۔ طب کی روح علم دواسازی ہے جو ہمارے قدیم علم کیمیا کا ایک شعبہ ہے۔ اُسی فن پر یورپ کے موجودہ معجزنما فن کیمسٹری کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔ اس فن مین مسلمان مصنفین سلف کی کتابین ابھی کلیۃً نہین مٹین بلکہ بہت سی باقی رہ گئی ہین۔ اساتذۂ طب کا کام ہے کہ بار بار اُن کا مطالعہ کرکے اُن کو سمجھین۔ انکو غور و خوض کرکے حل کرین۔ اور اُنھین نصاب تعلیم مین داخل کرین۔ پھر اُنکے اصول و ضوابط مین جدید تجربات سے فائدہ اُٹھاکے مجتہدانہ تصرف کرین۔ اور اپنے دواسازی کے فن کو باضابطہ بنالین۔ جس کے بغیر طب کے تمام کمالات اکثر اوقات بےنتیجہ اور غیر سودمند ثابت ہو جاتے ہین۔
مگر اس کمی کے ساتھ بھی لکھنؤ نے طب کو جیسی ترقی دی اور مضبوط بنایا دہلی سے بہت زیادہ ہے۔ اور دنیا کے اور کسی حصے مین نہین ہے۔

(۱۵)

لیکن باوجود اس کے کہ علوم عربیہ کے بڑے بڑے علماے گران پایہ لکھنؤ کی خاک سے پیدا ہوے اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ عربی کی تعلیم مقتدایان امت اور پیشوایان ملت تک محدود تھی۔ ہندوستان مین درباری زبان فارسی تھی۔ ملازمت حاصل کرنے اور مہذب و معزز صحبتون مین چمکنے کے لیے یہان فارسی کی تعلیم بخوبی کافی خیال کی جاتی تھی۔ اور یہی نہین سارے ہندوستان مین ادبی و خلاقی ترقی کا ذریعہ صرف فارسی قرار پاگئی تھی۔ مسلمان تو مسلمان اعلیٰ طبقے کے ہندوؤن کا عام رجحان فارسی ادب و انشا کی طرف تھا۔ یہان تک کہ اعلیٰ درجے کی

انشائین ہند و مصنفون ہی کے قلم سے مرتب و مدون ہوئی تھین ۔ ٹیک چند بہار نے بہار عجم کی سی لاجواب کتاب تصنیف کردی جو مصطلحات زبان فارسی کا ایک بے عدیل و نظیر ذخیرہ ہے ۔ اور جس مین ہر محاورے کی سند مین اہل زبان کے بے شمار اشعار پیش کر دیے گئے ہین ۔ لکھنؤ کے ابتدائی عروج مین ملا فائق کا اور پھر مرزا قتیل کا نام مشہور ہوا جو ایک نو مسلم فارسی دان تھے ۔ وہ خود تو مذاقاً کہا کرتے کہ "بوے کباب مرا مسلمان کرد" مگر سچ یہ ہے کہ فارسی کی تعلیم ۔ اُسکے شوق ۔ اور کمال فارسی دانی کی آرزو نے اُنھین مسلمان ہونے پر مجبور کر دیا ۔ انھون نے محض اسی شوق مین ایران کا سفر کیا ۔ برسون شیراز و اصفہان اور طہران و آذربائجان کی خاک چھانی ۔ اور ادب فارسی کے اس اعلیٰ کمال کو پہونچ گئے کہ خود اہل زبان بھی ایسے باکمال زباندان پر حسد کرین تو تعجب کی بات نہین ہے ۔

مرزا غالب نے جابجا مرزا قتیل پر حملے کیے ہین ۔ بے شک مرزا غالب کا مذاق فارسی نہایت اعلیٰ درجے کا تھا ۔ وہ اس اصول پر بار بار زور دیتے تھے کہ سوا اہل زبان کے کسی کا کلام سند نہین ہو سکتا ۔ مگر اُن کے زمانے مین چونکہ اودھ سے بنگالے تک لوگ قتیل کے پیرو تھے اور بات بات پر قتیل کا نام لیا جاتا تھا اس لیے مرزا غالب کو اکثر طیش آ گیا ۔ اور جب پیروان قتیل نے اُن کی خبر لینا شروع کی تو کہنے لگے ۔

فیضے از صحبتِ قتیلم نیست	رشک بر شہرتِ قتیلم نیست
نگر آنانکہ فارسی دانند	ہم برین عہد و رسے پیمانند
کہ ز اہلِ زبان نبود قتیل	ہرگز از اصفہان نبود قتیل
لاجرم اعتماد را نہ سزد	گفتہ اش استناد را نہ سزد
کین زبان خاص اہلِ ایران ست	مشکلِ ما و سہل ایران است
سخنت آشکار و پنہان نیست	دہلی و لکھنؤ ز ایران نیست

مگر اس سے یہ نہین نکلتا کہ قتیل نے فارسی دانی مین جو کوششین کی تھین اور اُس مین واقفیت و کمال حاصل کرنے مین جو زندگی صرف کی تھی وہ بالکل بیکار گئی ۔ اس بات کے ماننے مین کسی کو عذر نہین ہو سکتا کہ قتیل کا کوئی دعوے جب تک

وہ اہل زبان کی سند نہ پیش کرین قابل تسلیم نہین ہے۔ اور نہ خود قتیل کے ذہن مین کبھی یہ خیال گذرا ہوگا۔ لیکن اس کی خصوصیت قتیل ہی کے ساتھ نہین۔ ہندوستان کا کوئی شخص بجاے خود سند نہین ہو سکتا۔ خود مرزا نوشہ غالب بھی کوئی فارسی کا محاورہ بغیر اہل عجم کے ثبوت پیش کیے نہین استعمال کر سکتے۔ ہندوستانی فارسی دانون کا اگر کچھ وقار قائم ہو سکتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ کلام فارسی مین اُن کی نظر وسیع ہے اور ہر ہر لفظ کے صحیح محل استعمال سے واقف ہین۔ اور اس حیثیت سے سچ پوچھیے تو غالب کے مقابلے مین قتیل کا پایہ بہت بلند تھا غالب زندگی بھر ہندوستان کی خاک چھانتے رہے۔ اور اسکے ساتھ طلب معاش مین سرگردان رہے۔ قتیل کو اطمینان کا زمانہ ملا تھا۔ اور مدتون خاک پاک ایران مین رہ کے گانؤن گانؤن کی ٹھوکرین کھاتے پھرے تھے۔

بہر تقدیر لکھنؤ کی فارسی دانی کا آغاز قتیل سے ہوا۔ اور اُن سے کچھ پہلے مُلا فائق نے جن کا خاندان آگرے سے آکے مضافات لکھنؤ مین بس گیا تھا ادب و انشاے فارسی اور فارسی نظم ونثر مین اعلیٰ درجے کی بے نظیر کتابین تصنیف کین۔ فارسی گو اور فارسی دان ہندوستان مین ان سے پہلے بھی گذرے تھے۔ مگر فارسی دانی کے ساتھ زبان فرس کے اصول وضوابط اور اُس کی صرف ونحو کے مدوّن کرنے کا شوق پہلے پہل لکھنؤ ہی مین شروع ہوا۔ اور وہ اُنھین کے قلم سے ظاہر ہوا۔ اُن کی کتابین اگر سچ پوچھیے تو بیمثال ولاجواب ہین۔

اس کے بعد فارسی یہان کی عام تعلیم مین داخل رہی۔ اور نصاب فارسی ایسا بلیغ ودقیق رکھا گیا جو سچ یہ ہے کہ خود ایران کے نصاب سے زیادہ سخت تھا۔ ایران مین جیسا کہ ہر ملک کے لوگون کا معمول ہے سیدھی سادی فصیح زبان جس مین صفائی کے ساتھ خیال آفرینی کی جائے پسند کی جاتی ہے۔ اور اُسی قسم کا نصاب بھی ہے۔ ہندوستان مین عرفی وفیضی اور ظہوری ونعمت خان عالی کے ایسے نازک خیال شعرا کا کلام داخل درس کیا گیا۔ ملا طغرا اور مصنف پنج رقعہ کے ایسے دقت پسندون کا کلام پڑھا اور پڑھایا جانے لگا۔ جس سے دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی زبادانی اس آخر عہد مین خود ایران سے بڑھ گئی تھی۔ اور یہین کے لوگون نے فارسی کی تمام درسی

کتابوں پر اعلیٰ درجے کی شرحیں لکھ ڈالیں تھیں۔ اور اُسی کا یہ حیرت خیز نتیجہ ہے کہ جبکہ دنیا کی تمام زبانوں کے شعرا اہل زبان ہی کے حلقے میں محدود رہتے ہیں۔ اور غیر اہل زبان میں اگر دو چار شاعر پیدا بھی ہو جاتے ہیں تو اہل زبان میں اُن کا اعتبار نہیں ہوتا۔ فارسی کے شعرا ایران سے زیادہ نہیں تو ایران کے برابر ہی ہندوستان میں پیدا ہوے۔ خصوصاً گذشتہ صدی میں جبکہ ترقی و تعلیم کی دنیا میں لکھنؤ کا ڈنکا بج رہا تھا یہاں کا بچہ بچہ فارسی گو تھا۔ جاہل رنڈیوں اور بازاری مزدوروں کی زبان پر فارسی کی غزلیں تھیں۔ اور بھانڈ تک فارسی کی نقلیں کرتے تھے۔ قصبات اودھ کے تمام شرفا کا مہذب مشغلہ اور ذریعۂ معاش فارسی پڑھانا تھا۔ اور ایسے اعلیٰ درجے کے دیہاتی فارسی مدرس لکھنؤ کی گلیوں میں مارے مارے پھرتے تھے کہ اُن کی زبان دانی پر خود اہل عجم بھی عش عش کر جاتے۔ اُن کا لب و لہجہ اہل زبان کا سا نہ ہو مگر فارسی کے محاوروں اور بندشوں اور الفاظ کی تحقیق و تدقیق میں ان کو وہ درجہ حاصل تھا کہ معمولی اہل زبان کو بھی خطرے میں نہ لاتے تھے۔

لکھنؤ میں فارسی کا مذاق جس قدر بڑھا ہوا تھا اُس کا اندازہ لکھنؤ کی اُردو زبان سے ہو سکتا ہے۔ جہلا اور عورتوں تک کی زبان پر فارسی کی ترکیبیں بندشیں اور اضافتیں موجود ہیں۔ اور لکھنؤ کی زبان پر حملہ کرنے والوں کو اگر کوئی اعتراض اتنے دنوں میں مل سکا ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس میں فارسی اعتدال سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن اُس دَور کے معیار ترقی کے لحاظ سے یہی چیز لکھنؤ کی زبان کی خوبی اور اُس کی معاشرت کے زیادہ بلند ہو جانے کی دلیل تھی۔ خود دہلی میں زبان اُردو کی ترقی کے جتنے دَور قائم کیے جائیں اُن میں بھی اگلے پچھلے دَور کا امتیاز صرف یہی ہو سکتا ہے کہ پہلے کے بہ نسبت بعد والے میں فارسی کا اثر زیادہ ہے۔

مسلمانوں کی طرح ہندو بھی فارسی میں نمود حاصل کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ امر دولت مغلیہ کے ابتدائی عہد سے ظاہر ہونے لگا تھا۔ اُس وقت بھی بعض نامور و مستند فارسی دان اور فارسی گو موجود تھے مگر اودھ میں یہ مذاق انتہائی کمال کو پہونچ گیا تھا۔ چنانچہ جیسے باکمال فارسی دان ہندو سواد لکھنؤ میں موجود تھے کہیں نہ تھے۔ کایستھوں اور کشمیری پنڈتوں نے تعلیم فارسی کو اپنے لیے لازمی قرار دے لیا

تھا۔ اور یہان تک ترقی کی کہ کشمیری پنڈتون کی تو مادری زبان ہی اُردو ہوگئی۔ اور اُن کی اور مسلمانون کی فارسی دانی مین بہت کم فرق تھا۔ کایستھ چونکہ یہین کے متوطن تھے اس لیے اُنکی زبان بھاشا رہی۔ مگر تعلیم فارسی کی کایستھون کے رگ وپے مین اس قدر سرایت کر گئی تھی کہ نہایت ہی بے اعتدالی اور بے ربطی کے ساتھ محاورات فارسی کو استعمال کرنے لگے۔ جو بات کہین کے ہندوون مین نہ تھی اُن دونون لوگ کایستھون کی زبان کا مضحکہ اُڑایا کرتے تھے۔ مگر سچ یہ ہے کہ بجاے مضحکہ اُڑانے کے اُن کی قدر کرنی چاہیے تھی۔ اس لیے کہ اُن کی زبان اُن کی علمی ترقی کی دلیل تھی۔ جس طرح آج کل انگریزی لفظون کے جا وبیجا استعمال کو انگریزی دان اپنی علمی ترقی کا ثبوت خیال کرتے اور نہایت بدتمیزی سے انگریزی الفاظ اپنی زبان مین بھرتے چلے جاتے ہین۔

لکھنؤ مین اُن دنون فارسی کے صدہا نثار اور شاعر موجود تھے۔ اور اُردو کی طرح برابر فارسی مشاعرون کا بھی سلسلہ جاری تھا۔ فارسی شرفا ہی نہین عوام الناس تک کا شعار و دثار بن گئی تھی۔ اور اب باوجودیکہ فارسی درباری زبان نہین باقی رہی اور حکومت کی مسند پر اُردو زبان قابض و متصرف ہوگئی ہے مگر مہذب سوسائٹی پر آج تک فارسی کا سکہ چما ہوا ہے۔ اور عام خیال یہی ہے کہ فارسی مدارس و مکاتب سے نکل گئی اور تحصیل معاش کے لیے اسکی ضرورت نہین باقی رہی مگر انسان بغیر فارسی پڑھے مہذب سوسائٹی مین بیٹھنے کے قابل نہین ہو سکتا۔ اور نہ صحیح معنون مین انسان کامل بن سکتا ہے۔

انگلستان مین فرانس کی زبان کبھی درباری زبان تھی۔ اب اگرچہ مدت ہوئی کہ وہ دربار سے نکال دی گئی مگر معاشرت اور اخلاقی ترقی آج بھی وہان بغیر فرانسیسی زبان کے سیکھے نہین حاصل ہو سکتی۔ کھانے پینے۔ اُٹھنے بیٹھنے۔ پہننے اوڑھنے۔ اور ہنسنے بولنے۔ غرض زندگی کے تمام اسلوبون پر فرانسیسی کی حکومت اب تک ویسی ہی موجود ہے۔ اور لڑکیان بغیر فرنچ زبان حاصل کیے شایستہ بیبیان نہین بن سکتین۔ یہی حال لکھنؤ کا ہے کہ فارسی دربار سے گئی۔ خط وکتابت سے گئی۔ مگر معاشرت کے تمام شعبون پر اب تک حکومت کر رہی ہے۔ اور بغیر فارسی

کی تعلیم پائے نہ ہمارا مذاق درست ہو سکتا ہے اور نہ ہمیں بات کہنے کا سلیقہ آسکتا ہے۔
مٹیابرج (کلکتہ) میں آخری محروم القسمت تاجدار اودھ کے ساتھ جو چند لوگ وہاں کے سکونت پذیر ہو گئے تھے اُن میں کوئی پڑھا لکھا نہ تھا جو فارسی نہ جانتا ہو۔ دفتر کی زبان فارسی تھی۔ اور ہندو مسلمانوں میں صدہا فارسی گو شاعر تھے عورتیں تک فارسی میں شعر کہتی تھیں۔ اور بچہ بچہ فارسی زبان میں اپنا مطلب ادا کر لیتا تھا۔

موجودہ لکھنؤ میں اگرچہ فارسی کی تعلیم بہت کم ہو گئی ہے اور ہندوؤں نے تو اُسے اس قدر چھوڑ دیا کہ وہ کایستھوں کی زبان ہی خواب و خیال ہو گئی جس کا زبان دانی کی صحبتوں میں مضحکہ اُڑایا جاتا تھا۔ اور بھانڈ تک اُس فارسی آمیز زبان کی نقلیں کرتے تھے مگر پھر بھی پرانے بزرگوں اور خصوصاً مسلمانوں میں بہت کچھ فارسی کا مذاق موجود ہے۔ اس لیے کہ اُنکی اُردو دانی ہی ایک حد تک اُنکے لیے فارسی دانی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں میں اب تک خواجہ عزیز الدین صاحب کا ایسا محقق فارسی اگلی بزم سخن کے یاد دلانے کو پڑا ہوا ہے جو اپنے کمال کے لحاظ سے سارے ہندوستان میں یکتا ہیں۔ اور پرانے سن رسیدہ ہندوؤں میں بھی متعدد فارسی کے اسکالر ملیں گے جن کا ایک نمونہ سندیلہ کے راجہ دُرگا پرشاد صاحب ہیں۔ جن کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ زمانہ بدل گیا زمین و آسمان بدل گئے۔ آب و ہوا بدل گئی۔ مگر وہ آج تک وہی ہیں۔ فارسی دانی کی داد دینے اور لینے کو موجود ہیں۔ اور اگلی تاریخ کے ایک کرم خوردہ ورق کی طرح چومنے چاٹنے اور آنکھوں سے لگانے کے قابل ہیں۔

(۱۶)

علوم ہی سے وابستہ کتابت اور تحریر کے فن ہیں۔ مسلمانوں کا پرانا خط عربی تھا جس کو نسخ کہتے ہیں۔ خلافت بغداد کے ازمنۂ وسطے تک ساری دنیائے اسلام میں مشرق سے مغرب تک یہی خط تھا جو ارض حیرہ کے پرانے خط سے خط کوفی۔ اور خط کوفی سے خط نسخ بن گیا تھا۔ خاندان طاہریہ کے زمانے سے وہ تمام علم و فن جو بغداد میں عروج پا رہے تھے ایران و خراسان کی طرف آنے لگے۔ اور دیلمیوں اور سلجوقیوں کے زمانے

میں بغداد کے اکثر کمالات ایران میں بخوبی جمع ہو گئے۔ خصوصاً دیلمیوں کے علمی ذوق اور تفنن طبع سے ایران کا مغربی صوبہ آذربائیجان جو قدرۃً عراق عجم و عراق عرب کے آغوش میں واقع تھا۔ ہر قسم کی خوبیوں اور ترقیوں کا گہوارہ قرار پا گیا۔

اسی علاقے میں پہلے پہل خط نے بھی نئی وضع اختیار کرنا شروع کی۔ کتابت خطاطی کی حدوں سے نکل کے نقاشی کی قلمرو میں داخل ہو گئی۔ اور اُس میں مصورانہ نزاکتیں پیدا کی جانے لگیں۔ عجمی نزاکت پسندوں کو خط عرب کی پرانی سادگی میں بھدا پن نظر آیا۔ اور پرانی شان اور وضع خودبخود چھوٹنے لگی۔ نسخ میں قلم ہر حرف اور لفظ میں اول سے آخر تک یکساں رہا کرتا تھا۔ حرفوں میں غیر موزوں خمی اور غیر متناسب ناہمواری ہوتی تھی۔ دائرے گول نہ تھے بلکہ نیچے اور چپٹے ہوتے اور ادھر اُدھر اُن میں کونے پیدا ہو جاتے۔ اب نقاشی کی نزاکت کو خطاطی میں ملا کے تحریر میں نوک پلک پیدا کی جانے لگی۔ حرفوں کی نوکیں۔ گردنیں۔ اور دُمیں باریک بنائی جانے لگیں۔ دائرے خوبصورت اور گول لکھے جانے لگے۔ اس جدید مذاق کو پوری طرح پیش نظر رکھ کے سب سے پہلے میر علی تبریزی نے جو خاص و قلم کا رہنے والا تھا۔ اس نئے خط کو با اصول و باقاعدہ بنا کے مشرقی بلاد میں رواج دیا۔ اور اُس کا نام نستعلیق قرار دیا۔ جو اصل میں نسخ تعلیق یعنی ضمیمۂ نسخ تھا۔

نہیں معلوم کہ میر علی تبریزی کس زمانے میں تھے۔ منشی شمس الدین صاحب جو آج لکھنؤ کے مشہور و مستند خوشنویس ہیں۔ اُن کا زمانہ تیمور سے پہلے بتاتے ہیں۔ لیکن نستعلیق کی کتابیں اتنی پرانی ملتی ہیں کہ تیمور درکنار ہم سمجھتے ہیں کہ اس خط کی ایجاد محمود غزنوی سے بھی پہلے ہو چکی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ محمود کے حملوں کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں فارسی خوش نویسوں کی بھی آمد شروع ہو گئی ہو گی۔ جن کے اثر سے یہاں اس خط کا رواج شروع ہوا۔ اور ہندوستان کے ہر صوبے اور ہر خطے میں نستعلیق کے خوش نویس کثرت سے پیدا ہو گئے۔ لہذا یا تو میر علی تبریزی کا زمانہ بہت قدیم ہے اور یا وہ اصلی موجد خط نہیں ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ دہلی و لکھنؤ بلکہ سارے ہندوستان کی موجودہ خوش نویسی اپنا استاد اول میر علی تبریزی کو بتاتی ہے۔ ان کے ایک مدت دراز کے بعد ایران

میں نستعلیق کی اُستادی میں میر عماد الحسنی کا نام مشہور ہوا۔ جو خوشنویسوں میں بڑے ممتاز و نامور کاتب اور اُستاد الکل مانے جاتے ہیں۔ اُن کے بھانجے آغا عبد الرشید دیلمی نادرشاہ کے حملوں کے زمانے میں وارد ہند ہوے اور لاہور میں آکے ٹھہر گئے۔ لاہور میں اُن کے صدہا شاگرد پیدا ہوے۔ جنھوں نے اقطاع ہند میں پھیل کے اُنھیں ہندوستان کی خوشنویسی کا آدم نہیں تو نوح ضرور ثابت کر دیا۔

اُنھیں کے دو شاگرد جو ولایتی تھے وارد لکھنؤ ہوے۔ ان دونوں بزرگوں میں سے ایک حافظ نوراللہ اور دوسرے قاضی نعمت اللہ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ عبداللہ بیگ نام آغا عبد الرشید کے ایک تیسرے باکمال شاگرد بھی لکھنؤ میں آئے تھے۔ ان حضرات کے آنے کا زمانہ غالباً نواب آصف الدولہ بہادر کا عہد تھا۔ جب یہاں کوئی باکمال آکے واپس نہ جانے پاتا تھا۔ قاضی نعمت اللہ آتے ہی اس خدمت پر مامور ہوگئے کہ شاہزادوں کو اصلاح دیا کریں۔ اور حافظ نوراللہ کو بھی دربار اودھ سے تعلق ہو گیا۔ اور ان دونوں نے یہاں ٹھہر کے لوگوں کو خوش نویسی کی تعلیم دینا شروع کی۔

ان بزرگوں کے علاوہ یہاں اور پُرانے خوش نویس بھی تھے۔ جن میں سے ایک نامور بزرگ منشی محمد علی بتائے جاتے ہیں۔ مگر آغا عبد الرشید کے شاگردوں نے اپنا ایسا سکہ جما لیا کہ خوشنویسی کے تمام شائق بلکہ سارا شہر اُن کی طرف رجوع ہو لیا۔ جسے خطاطی کا شوق ہوا اُنھیں کا شاگرد ہو گیا۔ اور تمام خوشنویسان سلف کے نام مٹ کے گمنامی کے ناپیدا کنار سمندر میں غرق ہوگئے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اسکے مستحق بھی تھے۔

حافظ نوراللہ کی لکھنؤ میں جو قدر ہوئی اُس کا اندازہ اسی سے نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں سرکار میں ملازم ہوگئے تھے۔ بلکہ لکھنؤ کی قدردانی کا صحیح اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ لوگ اُنکے ہاتھ کے لکھے ہوے قطعوں کو موتیوں کے داموں مول لیتے۔ یہاں تک کہ اُنکی معمولی مشق بازار میں صرف ایک روپیہ حرف کے حساب سے ہاتھوں ہاتھ بک جاتی تھی۔

اُن دنوں امرا اور شوقین لوگ اپنے مکانوں کو سجانے تصویروں کے قطعات

سے آراستہ کیا کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے علی العموم قطعوں کی بے انتہا مانگ تھی۔
اور جہاں کسی اچھے خوش نویس کے ہاتھ کا قطعہ مل جاتا اُسپر لوگ پروانوں کی طرح
گرتے اور اُسے آنکھوں سے لگاتے۔ اس سے سوسائٹی کو تو یہ فائدہ پہونچتا کہ اکثر
اخلاقی اصول اور ناصحانہ فقرے یا اشعار ہمیشہ پیش نظر رہتے۔ اور ہر وقت گھر
مین اخلاقی سبق ملتا رہتا۔ اور خوش نویسی کو یہ فائدہ پہونچتا کہ خوش نویسوں اور
صاحب کمال خطاطوں نے اپنے کمال کو قطعہ نویسی ہی تک محدود کر دیا تھا۔ جو آبدار
اور عمدہ وصلیوں کو لکھ کے تیار کرتے۔ اور اسی مین وہ گھر بیٹھے دولتمند ہو جاتے۔
مگر افسوس اب ہندوستان سے قطعات اور کتبوں کا رواج اُٹھتا جاتا ہے اور اُنکی
جگہ تصویروں نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ سے اگلے نفیس و مہذب شرعی مذاق
آرایش کے مٹ جانے کے ساتھ خوش نویسی بھی ہندوستان سے اُٹھ گئی۔ اب
کاتب ہین خوش نویس نہین ہین۔ اور جو دو ایک خطاط مشہور بھی ہین وہ مجبور ہین
کہ کاپی نویسی اور کتابت سے اپنا پیٹ پالین جو چیز کہ اصل مین خوشنویسی کی دشمن
ہے۔ بخلاف اس کے اُن دنون ایک گروہ قائم ہو گیا تھا جس کا کام فقط یہ تھا کہ
خوشنویسی کو اپنے اصول پر قائم رکھے اور اُس کو وقتاً فوقتاً مناسب ترقیان دیتا
رہے۔ چنانچہ اگلے خوش نویس کتابت کو اپنی شان سے ادنی سمجھتے تھے۔ اور خیال
کرتے کہ جو شخص پوری پوری کتابین لکھے گا وہ غیر ممکن ہے کہ اول سے آخر تک
اصول و قواعد خوش نویسی کو پوری طرح نباہ سکے۔ اور سچ یہ ہے کہ جتنی محنت اور
مشقت وہ لوگ ایک ایک وصلی کی درستی مین کرتے تھے اُس کی عشر عشیر محنت بھی
کاتب کسی پوری کتاب کے لکھنے مین نہین کر سکتے۔

اُن کی محنت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حافظ نوراللہ سے ایک بار نواب
سعادت علی خان نے فرمایش کی کہ "مجھے گلستان کا ایک نسخہ لکھ دیجیے"۔ نواب
سعادت علی خان گلستان سعدی کے بیحد شایق تھے۔ اور کہتے ہین کہ گلستان ہر وقت
انکے سرہانے موجود رہا کرتی تھی۔ اور کوئی ایسی فرمایش کرتا تو حافظ نوراللہ
اپنی توہین سمجھ کے اُس کا مُنہ ہی نوچ لیتے۔ مگر فرمان روائے وقت کا کہنا تھا
منظور کر لیا۔ اور عرض کیا "تو مجھے رتی گڈی کا فدر (اُن دنون رسم کو گڈی

سکتے تھے) ایک سو قلمتراش چاقو۔ اور خدا جانے کتنے ہزار قلموں کے نیزے منگوا دیجیے"۔ سعادت علی خان نے حیرت سے پوچھا "فقط اکیلی ایک گلستان کے لیے اتنا سامان درکار ہوگا؟" کہا "جی ہاں مین اتنا ہی سامان خرچ کیا کرتا ہوں" نواب کے لیے اس سامان کا فراہم کرنا کچھ دشوار تو تھا نہین۔ منگوا دیا۔ اب حافظ صاحب نے گلستان لکھنا شروع کی مگر پوری نہین ہونے پائی تھی سات ہی باب لکھنے پائے تھے اور آٹھوان باب باقی تھا کہ انتقال ہوگیا۔ اُنکے بعد جب اُنکے بیٹے حافظ ابراہیم دربار مین پیش ہوے اور اُنھین سیاہ خلعت تعزیت عطا ہوا تو سعادت علی خان نے کہا "بھئی مین نے حافظ صاحب سے گلستان لکھوائی تھی خدا جانے اُس کا کیا حال ہوا؟" حافظ ابراہیم نے عرض کیا "اُنکے لکھے ہوے سات باب تیار ہین۔ آٹھوان باب باقی ہے اُسے یہ حقیر لکھ دیگا اور اس قدر اُن کی شان سے ملا دے گا کہ حضور امتیاز نہ کر سکین گے۔ لیکن ہان اگر کسی مبصر خوش نویس نے دیکھا تو وہ بیشک پہچان لے گا"۔ نواب نے اجازت دی اور اُس گلستان کو حافظ ابراہیم نے پورا کیا۔

حافظ نوراللہ کے شاگردون مین زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود اُنکے بیٹے حافظ ابراہیم تھے۔ دوسرے منشی سرب سکھ نام ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کایستھ بتاتا ہے اور کوئی کشمیری پنڈت۔ اور تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوش نویس۔ حافظ ابراہیم نے بھی بہت نام پیدا کیا۔ سیکڑون آدمیون کو خوش نویس بنا دیا۔ اور فن مین مجتہدانہ مرتبہ پیدا کر کے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی۔ حافظ نوراللہ کے دائرے بالکل گول ہوتے تھے۔ حافظ ابراہیم نے اُن مین ایک خفیف سی بیضاویت اختیار کی۔ منشی سرب سکھ کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اپنے اُستاد کی شان اس قدر اُڑا لی تھی کہ صدہا وصلیان حافظ نوراللہ کے نام سے پھیلا دین۔ اور بڑے بڑے خوش نویس بالکل تمیز نہین کر سکتے تھے اور یہ اُن دنون خوشنویسی کا بہت بڑا کمال تھا۔

حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردون مین پہلے تو اُن کے فرزند حافظ سعیدالدین تھے۔ ان کے علاوہ منشی نظیر حمید۔ منشی عبدالمجید جو سرکار شاہی مین احکام شاہی

اور پرچۂ وپیام (یعنی مراسلت فی مابین دولت انگلشیہ و دولت اودھ) لکھنے پر مامور تھے۔ مگر حافظ ابراہیم کے دو شاگردوں نے بہت ہی فروغ پایا جو اپنے زمانے مین سارے لکھنؤ کے استاد قرار پاگئے تھے۔ ایک تو منشی منسارام کشمیری پنڈت جو اپنے فن کے بہت بڑے کامل تھے۔ اور دوسرے منشی محمد ہادی علی جو نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی مین بھی لکھنؤ مین اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔

اُدھر قاضی نعمت اللہ کے شاگرد ایک تو اُن کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے اور دوسرے مولوی قل احمد۔

غرض نستعلیق کے یہی لوگ اُستاد تھے۔ جن سے لکھنؤ مین خوش نویسی کمال کو پہونچی۔ پھر مطبع جاری ہونے کے بعد کتابت وکاپی نویسی کو فروغ ہوا۔ اور دراصل یہ اسی خاندان کی برکت ہے کہ لکھنؤ مین ہزاروں مسلمان ہزاروں کایستھ جن سے نوبستہ اور اشرف آباد کے تکیے بھرے ہوے ہین اور سیکڑون کشمیری پنڈت خوشنویس ہوگئے۔ مگر افسوس کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق مین اور خوشنویسی کی کساد بازاری دیکھ کے اس فن کو مطلقاً چھوڑ دیا۔ اور اب جتنے اچھے لکھنے والے ہین سب مسلمان ہین یا کایستھ۔

آخر زمانے مین سندیلہ کے ایک منشی عبدالحی بھی بڑے باکمال خوشنویس تھے۔ جن کے شاگرد منشی امیر اللہ تسلیم اُن کے بڑے بھائی منشی محمد عبداللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے۔ فی الحال نستعلیق مین منشی شمس الدین صاحب اور نسخ مین منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے۔ اور یہ دونون منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہین۔

ہندوستان مین خط نسخ جن باکمالون کی جانب منسوب کیا جاتا ہے اُن مین سب سے پہلے شخص یاقوت مستعصمی کے لقب سے مشہور ہین جو یاقوت اول کہلاتے ہین۔ ہمین اس نام کا کوئی باکمال کاتب مستعصم باللہ کے عہد مین نہین نظر آتا۔ کیا عجب کہ اس سے مراد عماد کاتب جوینی الملقب بہ "فخر الکتاب" المتوفی ۵۹۴ھ ہو۔ جس کی کتاب "خریدہ" مشہور ہے۔ اور جو پہلے ارض شام مین سلطان اتابک نور الدین زنگی کا اور اُس کے بعد مصر مین سلطان صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس

کا کاتب تھا - اس لیے کہ نسخ کا سب سے بڑا آخری خوشنویس وہی مانا جاتا ہے۔
اسکے بعد سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے عہد مین محمد عارف نام خط نسخ کے ایک
بڑے باکمال پیدا ہوے - جن کو یاقوت رقم ثانی کا خطاب دیا گیا - عموماً کہا جاتا ہے
کہ اُنھون نے خط نسخ کی نئی شان ایجاد کی اور بہ مقابل سابق کے اُسے زیادہ
خوبصورت بنا دیا - یہان تک کہ نسخ کے اساتذہ لکھنؤ دعویٰ کرتے ہین کہ اُنکے
کمال کا ساری دنیاے اسلام نے اعتراف کر لیا - مین اس کے ماننے کے لیے تیار
نہین ہون - یاقوت رقم ثانی کو ہندوستان مین چاہے جیسی فوقیت حاصل
ہوگئی ہو مگر اُن ممالک مین جہان کا قومی خط خطِ نسخ اور قومی مادری زبان زبان
عرب ہے لوگ یاقوت رقم کا نام بھی نہین جانتے - اور نہ اُن کی شان کے پیرو
ہین -

محمد عارف یاقوت رقم کے زمانے مین عبد الباقی نام ایک شخص تھے جن کا پیشہ
حدادی یعنی لوہاری تھا - اُنھین یاقوت رقم کی مرجعیت عامہ دیکھ کے شوق ہوا
کہ خود بھی اس فن مین کمال پیدا کرین - اتفاقاً عبد اللہ طباخ نام نسخ کے ایک
اور خوش نویس اُن دنون مشہور تھے - حداد جا کے اُن کے شاگرد ہوے - اور
ایسی محنت کی کہ اُستاد کامل مشہور ہوگئے - جب ان دونون کا زمانہ گذر گیا تو
یاقوت رقم کی جگہ اُن کے بھتیجے قاضی عصمت اللہ نے لی - اور حداد کی یادگار
اُن کے دو فرزند علی اکبر اور علی اصغر تسلیم کیے گئے -

اس کے بعد ہندوستان مین بڑے بڑے خوش نویس پیدا ہوے - اور
برابر نسخ کی کتابت ہندوستان مین ترقی کرتی رہی - آخر مین شاہ غلام علی صاحب
کو شہرت ہوئی جو نسخ کے باکمال خوش نویس تھے - اس کے بعد لکھنؤ مین ایک طرف
مولوی ہادی علی صاحب کی شہرت ہوئی جن کا خاندان دہلی سے آیا تھا - اور
کابل کے ایک خوشنویس میر اکبر علی کے وہ شاگرد تھے - مولوی ہادی علی صاحب
کو طغرا نگاری مین بڑا کمال حاصل تھا -

منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوش نویس میر بندہ علی مرتعش تھے
اُنکے اُستاد نواب احمد علی نام ایک پُرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال اُستاد تھے

میر بندہ علی کے ہاتھ مین رعشہ تھا۔ مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے۔ کیا مجال کہ قابو سے باہر ہو۔ اُن کی نظر خط کے پہچاننے مین ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔

منشی حامد علی صاحب فرماتے ہین ایک موقع پر منشی ہادی علی۔ منشی محمد یحییٰ (یہ بھی نسخ کے بڑے اُستاد تھے جنھون نے طبع ہونے کے لیے لکھنؤ مین پہلا قرآن لکھا) منشی عبدالحی سندیلوی۔ اور میر بندہ علی مرتعش ایک صحبت مین جمع تھے۔ یہ نسخ کے تمام باکمالون کی صحبت تھی۔ کسی نے ایک قطعۂ نسخ فروخت کے لیے لا کے پیش کیا۔ گو اُس مین کاتب کا نام نہین لکھا تھا مگر اُن باکمالون نے بالاتفاق پہچان لیا کہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے۔ اور سب کو شوق ہوا کہ اُسے اپنے قبضے مین کرین۔ مگر منشی ہادی علی صاحب نے کہا "یہ ایک دن میرے پاس رہے تو مجھے غور کرنے کے بعد اطمینان ہوگا کہ درا صل یہ یاقوت کے ہاتھ کا ہے یا نہین"۔ مالک نے دے دیا اور وہ اُسے گھر لائے۔ دوسرے دن لے جا کے پیش کیا۔ اور کہا "واقعی یہ یاقوت ہی کے ہاتھ کا ہے۔ ی کے ساتھ کا یاقوت کا ایک قطعہ میرے پاس بھی پڑا ہوا تھا۔ مین نے اِسے لیجا کے اُس سے ملایا تو بعینہ وہی پایا۔ اور مجھے یقین آ گیا کہ واقعی یاقوت کا ہے۔ اور دونون قطعے سب کے سامنے رکھ دیے۔ سب نے بلا تامل تسلیم کر لیا کہ دونون یاقوت ہی کے ہاتھ کے لکھے ہوے ہین۔ مگر میر بندہ علی نے منشی ہادی علی والے قطعے کو غور سے دیکھا۔ پھر مُسکرائے۔ اور اُس کے نیچے لکھ دیا "این کار از تو آید و مردان چنین کنند"۔ یہ تحریر دیکھ کے منشی عبدالحی صاحب بگڑے اور کہا "کیا آپ کو اس مین کچھ شک ہے؟" میر بندہ علی نے کہا "یہ قطعہ خود یاقوت کے ہاتھ کا نہین ہو سکتا"۔ منشی عبدالحی اور دیگر حریفان صحبت نے دعوی کیا کہ "یہ خاص یاقوت کے ہاتھ کا ہے"۔ میر بندہ علی نے اُس مین ایک واؤ کا سرا دکھایا اور کہا "یہ یاقوت کا نہین ہو سکتا"۔ اب سب لوگ گو مگو مین پڑے ہوے تھے کہ منشی ہادی علی نے اُس وصلی کا ایک کونا پھاڑ کے کاغذ کی تہ کے اندر سے نکال کے اپنا نام دکھا دیا اور سب کو یقین آ گیا کہ یہ کارستانی منشی ہادی علی صاحب کی تھی۔ سب نے

اُن کی بیحد تعریف کی - اور اُنھوں نے کہا "مگر مین تو میر بندہ علی صاحب کی نظر کا قائل ہو گیا"۔

خوش نویسون کے عام مذاق کے مطابق میر بندہ علی صاحب سے بھی قطعہ نویسی کے سوا کتابت غیر ممکن تھی - زندگی بھر کبھی کوئی چھوٹی کتاب بھی نہ لکھی گئی - حاجی حرمین شریفین نے جب مطبع جاری کیا تو بہزار منت و سماجت میر بندہ علی کو اس پر راضی کیا کہ اُنھین ایک پنجسورہ لکھ دین - میر بندہ علی نے بڑی محنت سے اور خدا جانے کتنے دنون مین لکھا - اور لے گئے - مگر حاجی صاحب کے سامنے جب اُس پر آخری نظر ڈالی تو کچھ ایسا ناپسند ہوا کہ بجاے حاجی صاحب کے حوالے کرنے کے پھاڑ ڈالا - اور کہا "بھئی مجھ سے نہین ہو سکتا"۔

ان بزرگون کے تذکرے سے میرا یہ مقصد نہین ہے کہ خوش نویسی مین لکھنؤ کو کوئی ایسا امتیاز حاصل ہو گیا تھا جو ہندوستان مین عدیم النظیر ہو - بخلاف اسکے میرا خیال ہے کہ نسخ کے جیسے جیسے با کمال دولت مغلیہ سے پہلے ہندوستان مین گذر چکے ہین اُن کے عشر عشیر درجے کو بھی یہ لوگ نہین پا سکتے - بلکہ نسخ کا کمال اِن دنون مٹ چکا تھا - نستعلیق کے متعلق اس قدر البتہ کہا جا سکتا ہے کہ حافظ نوراللہ اور حافظ ابراہیم کے ہاتھ کے قطعات جس ذوق و شوق سے سارے ہندوستان مین مقبول ہوے اور کسی خوش نویس کے شاید نہ ہوسکے ہونگے - لیکن اس پر بھی خطاطی کے فن مین لکھنؤ کا درجہ قریب قریب وہی تھا جو دیگر متمدن شہرون کا ہو سکتا ہے -

مگر لکھنؤ کی خوشنویسی نے مطبع کی ترقی مین جو کام کیا شاید کہین کی خوشنویسی نہ کر سکی ہو گی - مجھے اس کی تحقیق نہین ہے کہ ہندوستان مین سب سے پہلے مطبع کہان سے جاری ہوا - کلکتے مین اُردو لٹریچر کی ترقی اور نیز عام مشرقی علوم کی تقویت مین بہت کچھ اہتمام کیا گیا - مگر وہان ٹائپ کے سوا پتھر کے چھاپے کی پُرانی کتابین مین نے نہین دیکھین -

لکھنؤ مین بہ عہد غازی الدین حیدر (۱۲۲۳ھ محمدی تا ۱۲۵۶ھ محمدی مطابق ۱۸۱۴ء تا ۱۸۲۷ء) اٹسل نام ایک یوروپین نے آ کے لوگون کو مطبع کا خیال دلایا - اور

جب اہل علم مشتاق ہوے تو اُس نے پہلا مطبع لکھنؤ مین کھولا۔ اس نے پریس اور تمام سامان یہین تیار کرا کے چھاپنا شروع کیا۔ اور زاد المعاد۔ ہفت قلزم اور تاج اللغات (جو بہت سی جلدون مین تھی) چھاپ کے پبلک کے سامنے پیش کین۔ اُس سے سیکھ کے اور لوگون نے بھی مطبع جاری کرنا شروع کیے۔ جن مین سب سے پہلا مطبع غالبًا حاجی حرمین شریفین کا تھا۔ اُنھین دنون مصطفےٰ خان شیشہ آلات کے ایک دولتمند تاجر کچھ چھاپنے کے لیے حاجی حرمین کے پاس لے گئے اور حاجی صاحب کی زبان سے کوئی ایسا سخت کلمہ نکل گیا کہ مصطفےٰ خان نے گھر آ کے خود اپنا مصطفائی مطبع جاری کر دیا۔ جسے غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔ تھوڑے دنون بعد علی بخش خان نے علوی مطبع جاری کیا۔ اور لکھنؤ مین کثرت سے چھاپے خانے کھلنے لگے۔

ابتدائے طبع کا کام یہان تاجرانہ اصول پر نہین بلکہ شوقینی کی شان سے جاری ہوا۔ عمدہ سے عمدہ آروی کاغذ لگایا جاتا جو پتھر کے چھاپے کے لیے نہایت ہی موزون تھا۔ بڑے بڑے خوشنویسون کو مجبور کر کے اور بڑی بڑی تنخواہین دے کے اُن سے کتابت کا کام لیا جاتا۔ اور بغیر اس کے کہ کارگزاری کی کچھ بھی شرط ہو یا اس کا ذرا بھی خیال کیا جاتا ہو کہ وہ دن بھر مین کتنا لکھتے ہین: لکھتے بھی ہین یا نہین۔ اُن کی خاطر داشت کی جاتی۔ اسی طرح پریس مینون سے بھی نہ پوچھا جاتا کہ دن بھر مین کتنے کاغذ چھاپے۔ روشنائی کے لیے کڑوے تیل کے ہزار دن چراغ روشن کر کے اول درجے کا کاجل تیار کیا جاتا۔ کھٹائی کے عوض لیمون کا عرق صرف ہوتے اور کپڑے کی جگہ اصلی اسفنج کام مین لایا جاتا۔ غرض ہر چیز اول درجے کی کام مین لائی جاتی۔ اس اہتمام کا نتیجہ یہ تھا کہ شاہی کے زمانے مین فارسی وعربی کی درسی و دینی کتابین جیسی لکھنؤ مین چھپ کے تیار ہوئین اہل بصیرت کے نزدیک کہین نہ چھپ سکی ہون گی۔ اُسوقت کی چھپی ہوئی کتابین جس کسی کے پاس موجود ہین ایک دولت ہین اور لوگ ڈھونڈھتے ہین اور نہین پاتے۔

میرے والد کے حقیقی چچا مولوی احمد صاحب کو سفر اور تجارت کا بڑا شوق تھا اور اُس زمانے مین جبکہ لوگ گھر سے باہر قدم نکالتے ڈرتے تھے اُنھون نے حاجی

حرمین شریفین کے ایجنٹ کی حیثیت سے رتھوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کے اور ہزاروں کتابیں ساتھ لے کے لکھنؤ سے راولپنڈی تک سفر کیا تھا۔ اُن کا بیان تھا کہ کتابیں اُن دنوں عنقا تھیں۔ یہاں کی مطبوعہ کتابوں کو دیکھ کے لوگوں کی آنکھیں کھل جاتی تھیں اور پروانہ وار گرتے تھے۔ لوگوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ ہم جس شہر یا گاؤں میں پہونچتے ہم سے پہلے ہماری خبر پہونچ چکتی۔ اور ہمارا داخلہ عجب شان و شوکت سے ہوتا۔ ادھر ہم کسی بستی میں پہونچے اُدھر خلقت نے گھیر لیا۔ بھیڑ لگ جاتی تھی۔ اور ہم جس کتاب کو جس قیمت پر دیتے لوگ بے عذر لے کے آنکھوں سے لگاتے۔ ہم کریما۔ مامقیماں وغیرہ کو فی جلد ۲ر یا ۸ر کے حساب سے اور گلستان بوستان کو فی جلد تین روپیہ یا چار روپیہ کے نرخ سے بیچتے۔ اور اُس پر یہ حال تھا کہ ہم مانگ کو پورا نہ کر سکتے۔ ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہونچتے پہونچتے کتابوں کا ذخیرہ ختم ہو جاتا اور نئے مال کے انتظار میں مہینوں ٹھہر جانا پڑتا۔ اُن دنوں مال کا پہونچنا دشوار تھا۔ مگر ہم نے ایسا انتظام کر لیا تھا کہ برابر مال لکھنؤ سے آتا رہتا۔

شاہی کے آخر دور میں مصطفائی مطبع اپنی چھپائی کے لحاظ سے دنیا میں جواب نہ رکھتا تھا۔ انتزاع سلطنت کے بعد منشی نول کشور نے اپنا مطبع جاری کیا۔ گو وہ چھپائی کی خوبی میں مصطفائی مطبع کا مقابلہ نہیں کر سکا مگر تجارت کے اصول پر چل کے اُس نے فارسی و عربی کی اتنی بڑی بڑی ضخیم کتابیں چھاپ دیں کہ آج کسی مطبع کو اُن کے طبع کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ سچ یہ ہے کہ لکھنؤ میں اگلی شوقینی نے پریس کا ایسا مکمل سامان جمع کر رکھا تھا کہ اُس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے منشی نول کشور ہی کے ایسے بلند حوصلہ صاحب مطبع کی ضرورت تھی۔ آخر نول کشور پریس نے یہاں تک عروج پایا کہ سارے مشرقی لٹریچر کو اُس نے زندہ کر دیا۔ اور باعتبار وسعت طبع کے جو فوقیت لکھنؤ کو حاصل ہو گئی اور کسی شہر کو نہیں نصیب ہو سکتی۔ اور اسی کی برکت تھی کہ وسط ایشیا میں کاشغر و بخارا تک اور افغانستان و ایران کی ساری علمی مانگ لکھنؤ ہی پوری کر رہا تھا۔ چنانچہ آج تک نول کشور پریس علمی تجارت کی کنجی ہے۔ جس سے کام لیے بغیر کوئی شخص علمی دنیا میں قدم نہیں رکھ سکتا۔

مگر افسوس اب لکھنؤ میں باوجود کثرت مطابع کے چھپائی کی حالت ایسی خراب ہورہی ہے اور روز بروز ابتر ہوتی جاتی ہے کہ دوسرے شہر اُس پر فوقیت لے گئے ہیں۔ اور ہماری نظر میں پریسوں کی اخلاقی حالت خراب ہونے کی وجہ سے اب لکھنؤ میں اکثر شہروں کے مقابلے میں خراب چھپتا ہے۔ مگر ہمارے اطمینان کے لیے اتنا کافی ہے کہ کانپور میں منشی رحمت اللہ صاحب کی وجہ سے مطابع کی حالت اچھی ہے۔ اور کانپور دراصل لکھنؤ ہی کی ترقیوں کا ایک ضمیمہ ہے۔

مطبع ہی کے ساتھ لکھنؤ میں مصلح سنگی کا فن ایجاد ہوا۔ پتھر پر جو کاپی جمائی جاے تو اُسے کسی حد تک چھیل کے اور قلم لگا کے درست کرنا غالباً یورپ ہی سے شروع ہوا ہوگا اور وہاں اب بھی کیا عجب کہ اصلاح کا یہ عمل جاری ہو۔ مگر نسخ نستعلیق کے حرفوں کو اس وضع سے درست کرنا کہ خوش نویس کی پوری شان باقی رہے اور کسی کو محسوس نہ ہو سکے کہ اس میں کسی اور کا بھی قلم لگا ہے خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے۔ جہاں ابتداءً یہ فن تو اسی حد پر محدود تھا کہ حروف اور نقش و نگار جا بجا جس قدر اُڑ گئے یا کچل کے پھیل گئے ہوں اُن کو درست کر دیا جائے۔ مگر چند روز بعد یہاں کی جدت پسندی اس حد سے آگے بڑھی۔ اور ایسے باکمال مصلح سنگ پیدا ہونے لگے جو پتھر پر پوری پوری کتابیں اُلٹی لکھ دیتے ہیں اور خط اپنی حدود پر اس قدر مکمل رہتا ہے کہ مجال کیا جو کوئی پہچان سکے کہ یہ پتھر پر اُلٹا لکھا گیا ہے ابتداءً اسکے صاحب کمال موجد ایک پُرانے بزرگ تھے جو مصطفائی مطبع کی شہرت و ناموری کے باعث ہوے۔ اُن کے زمانے ہی میں اُن کے شاگردوں کی کثرت نے یہاں کے مطابع کو فائدہ پہونچایا۔ بہت سے لوگوں نے ترقی کی۔ اور شہر سے مصلح سنگ بہم پہونچانے لگا۔ جب مصلح سنگی بہت عام ہوگئی تو منشی جعفر حسین نام ایک مشہور مصلح سنگ کو اُنکی اعلیٰ مشاقی نے آمادہ کیا کہ مطبع کو کاپی نویسی سے بے پروا کر دیں۔ اُنھوں نے پتھر پر اُلٹا لکھنا شروع کیا۔ یہ کام ابتداءً چھوٹے چھوٹے بازاری مطابع سے شروع ہوا۔ اور آخر میں اعلیٰ وادنیٰ سب مطبعوں میں ایک حد تک اختیار کر لیا گیا۔ اب منشی سید علی حسین صاحب نے اس حد تک ترقی کی کہ اُن کے اُلٹے لکھے ہوے خط کو بہت سے مشہور خوش نویس بھی نہیں پا سکتے۔ چنانچہ اُنکی

اُلٹی کتابت کا ایک معمولی نمونہ ہمارا دلگداز بھی ہے - جس کی کاپیان نہین لکھی جاتین بلکہ منشی علی حسین صاحب مضامین کو پتھر پر اُلٹا لکھ دیا کرتے ہین - ناظرین دلگداز کو پڑھ کے اور اسکے خط پر غور کرکے اندازہ فرما سکتے ہین کہ مصلح سنگی کا فن لکھنؤ مین کس درجۂ کمال کو پہونچ گیا ہے - گو کہ ہندوستان کے اکثر شہرون مین مصلح سنگ لکھنؤ ہی کے ہین لیکن اس وقت تک کسی اور شہر کے مطابع کو یہ بات نہین نصیب ہوئی کہ کاپیان جمانے کی عوض عبارت پتھرون پر اُلٹی لکھوا کے چھاپین - یہ فن آج تک لکھنؤ ہی تک محدود ہے - مگر افسوس پریسون کی حالت خراب ہو جانے کے باعث لکھنؤ مصلح سنگی کے اس کمال سے اس قدر فائدہ نہین اُٹھا سکتا جس قدر کہ ہونا چاہیے

(۱۷)

ابھی ہمین لکھنؤ کی بہت سی خصوصیتین بیان کرنی ہین جن کو زیادہ تر تعلق اخلاقی چیزون اور معاشرت کے امور سے ہے - مگر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مختصر طور پر کچھ کیفیت فنون جنگ کی بھی بیان کر دین -

سچ یہ ہے کہ یہ آخری دربار مشرق اُس وقت قائم ہوا جب مسلمانون اور علی العموم ہندوستانیون کی سپہ گری کمزور پڑ چلی تھی - بلکہ اس سے بھی زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ پُرانی سپہگری کے فنون اتنے نہین مٹے تھے جس قدر کہ پُرانے فنون اور آلات جنگ نئے قواعد جنگ اور جدید آلات حرب کے مقابلے مین بیکار ہو گئے تھے - جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پُرانے فنون جنگ بجاے اسکے کہ مسلمانون یا اہل ہند سے نکل کے کسی نئی ترقی یافتہ بہادر قوم مین عروج پاتے دنیا ہی سے مٹ گئے - اور ایسے مٹے کہ موجودہ نسل اپنے آبا و اجداد کے شجاعانہ کارنامون اور اُنکے سپہگرانہ کامون سے بالکل ناآشنا ہے - اور آج جو اُن فنون کے تذکرے کے لیے ہم نے قلم اُٹھایا ہے تو کوئی ایسا شخص بھی نہین ملتا جس سے کچھ حالات معلوم ہون - ہم شاہزادہ مرزا مسعود قدر بہادر بی اے - اور لکھنؤ کے ایک بہت قدیم بزرگ سلیمان خان صاحب (جو حافظ رحمت خان صاحب قدیم نامور فرمانرواے بریلی کی نسل سے ہین) نہایت شکرگذار ہین کہ ان قدیم فنون جنگ کے متعلق جو کچھ لکھ رہے ہین اُنھین کی مدد سے لکھ رہے ہین -

سپہگری کے جن فنون کا نشو و نما دہلی مین اور دہلی کے بعد لکھنؤ مین ہوا وہ دراصل تین مختلف قومون سے نکلے تھے اور تینون کے امتزاج سے اُن مین مناسب ترقیان ہوئی تھین۔ اور حیرت کی یہ بات ہے کہ باوجود میل جول کے اُن مین آخر تک اصلی امتیاز باقی تھا۔ بعض فن آریہ قوم کے سپہگرون سے نکلے تھے۔ بعض کو ترک اور بہادران تاتار اپنے ساتھ لائے تھے۔ اور بعض خاص عربون کے فن تھے جو ایران مین ہوتے ہوے یہان آئے تھے۔ لکھنؤ مین جن فنون کا رواج تھا اور جن کے باکمال اُستاد یہان موجود تھے وہ حسب ذیل معلوم ہوتے ہین:

(۱) لکڑی۔ (۲) پٹہ ہلانا۔ (۳) بانک۔ (۴) بنوٹ۔ (۵) کشتی۔ (۶) برچھا۔ (۷) بانا۔ (۸) تیراندازی۔ (۹) کٹار۔ (۱۰) جل بانک۔

(۱) لکڑی

یہ اصلی فن جسے پھنکیتی کہتے ہین آریہ لوگون کا تھا۔ جو ہندوستانی اور ایرانی دونون ملکون کے آریون مین مروج تھا۔ عربی فتوحات کے بعد ایران کی پھنکیتی پر عربی جنگجوئی کا اثر پڑ گیا۔ اور وہان کی پھنکیتی بمقابل ہندوستان کے زیادہ ترقی کر گئی۔ ہندوستان مین آخر تک یہ دونون فن اپنی ممتاز وضعون مین باقی رہے اور لکھنؤ مین دونون اسکول قائم تھے۔ ایران کی عربی آمیز پھنکیتی یہان علی مد کے نام سے مشہور تھی۔ اور خالص ہندی پھنکیتی رستم خانی کے لقب سے یاد کی جاتی۔ علی مد مین پھنکیت کا بایان قدم ایک مقام پر جارہتا اور صرف داہنے پاؤن کو آگے پیچھے ہٹا کے پینترے بدلے جاتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی مین پھنکیت پینترے بدلتے وقت داہنے بائین اور آگے پیچھے جس قدر چاہتا یا جگہ پاتا ہٹتا بڑھتا اور ناگہان حریف پر آپڑتا۔ ایک یہ امتیاز بھی تھا کہ علی مد کا فن خاص رئیسون اور شریفون کے ساتھ مخصوص تھا۔ اُس کے اُستاد کبھی کسی رذیل یا ادنی طبقے کے آدمی کو اپنا شاگرد نہ بناتے اور نہ اپنے فن سے واقف ہونے دیتے۔ برخلاف اس کے رستم خانی کا فن اجلاف اور ادنی طبقے کے لوگون مین عام تھا۔ فن پٹہ ہلانا

علی مد کے ایک زبردست اُستاد فیض آباد مین شجاع الدولہ بہادر تھے۔ انکی نسبت بعد اُن کی بیوہ بہو بیگم صاحبہ کی سرکار سے وابستہ تھے۔ اُن کا ذکر بڑے اُٹھے۔

میں ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے سب سے پہلے اُستاد وہی تھے جو فیض آباد
میں رہے۔ اور پھر وارد لکھنؤ ہوئے۔ دوسرے اُستاد اسی فن کے محمد علی خان تھے
جو خاص ہمارے محلّے کٹرہ بزن بیگ خان میں رہتے تھے۔ اور علی مدد کے موجد مانے
جاتے۔ تیسرے اُستاد میر نجم الدین تھے جو شاہزادگان دہلی کے ساتھ پہلے بنارس میں
گئے اور پھر وہاں سے لکھنؤ میں آئے۔ اُن کا معمول تھا کہ صرف شریفوں کو شاگرد
کرتے۔ اور شاگرد کرتے وقت شاہزادوں سے دولت اور شریفوں سے صرف مٹھائی
لیتے۔ اور اُسے بجائے اس کے کہ اپنے کام میں لائیں خود لیجا کے سادات بنی فاطمہ
کی نذر کر دیتے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں تھے۔ ایک بہت بڑے اُستاد
میر عطا حسین تھے۔ جو حکیم مہدی کے مخصوصین میں تھے۔ ایک بہت بڑے اُستاد
پٹے باز خان تھے جو اپنے کمال کے باعث غازی الدین حیدر کے زمانے میں علی مدد کے
موجد و بانی مشہور ہو گئے۔ اُن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ نو مسلم تھے۔ مگر وضع اُنکی بھی
یہی تھی کہ سوا شریفوں کے اپنا فن کبھی کسی ادنیٰ طبقے کے آدمی کو نہیں بتایا۔ اُنھوں
نے لکھنؤ میں اپنی یادگار ایک مسجد چھوڑی ہے جو دفعتاً مہری کے پُل سے آگے عالم نگر
کے قریب آج تک موجود ہے۔

رستم خانی عوام میں رہی۔ اور اسی وجہ سے اس کو کوئی خصوصیت ہندو یا
مسلمان کے ساتھ نہیں رہی۔ بلکہ اُسکے صدہا اُستاد اودھ کے تمام گاؤں اور
قصبوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ تاہم لکھنؤ میں یحییٰ خان بن محمد صدیق خان نے جو کمال
اور ناموری رستم خانی میں حاصل کی کسی کو نہ نصیب ہو سکی۔ نواب فتحیاب خان
عالی مرتبہ رئیسوں میں ہونے کے باوجود بڑے خوش نویس بھی تھے۔ اور انھوں نے
رستم خانی میں بھی کمال حاصل کیا تھا۔ اسی طرح لکھنؤ کے ایک مشہور بانکے پہلوان
میر لنگر باز بھی رستم خانی کے اُستاد تھے۔ اور اب تک تھوڑا بہت رواج باقی ہے تو
مسلمانوں میں علی مدد کا فن شرفا کے ساتھ مخصوص تھا اور شرفا کو سپہگری سے
قدیم بزرگوں کے سے تعلق نہیں رہا۔ لہذا وہ فن بھی مٹ گیا۔ رستم خانی اودنے لوگوں میں تھی
برملی کی نسل سے آج بھی لڑتے بھڑتے رہتے ہیں لہذا اُن میں رستم خانی کا رواج
رہے ہیں اُنھیں تو رہے۔

علی مدکے دو ایک اُستاد مین نے ٹیا برج مین دیکھے تھے۔ اور سب کے آخر مین میر تفضل علی تھے جو محلہ محمود نگر مین رہتے تھے۔

(۲) پٹہ ہلانا

اس فن کی اصلی غرض یہ تھی کہ انسان دشمنون کے نرغے مین پڑ جائے تو لکڑی کے ہاتھ چارون طرف پھینکتا ہوا سب کو ہٹا کے۔ سب سے بچ کے۔ اور سب کو مارتا ہوا نکل جائے۔ پٹے کو ٹیک کے اُڑنا اس فن کا خاص کمال تھا اور سب سے بڑی تعریف اس بات کی تھی کہ انسان پر ایک ساتھ دس تیر بھی آ کے پڑین تو اُن کو کاٹ دے۔ یہ فن دہلی مین تھا۔ لکھنؤ مین پورب سے آیا۔ اور جُلاہون مین زیادہ مروج تھا۔ اگرچہ آخر مین بہت سے شرفا نے بھی خصوصاً قصبات کے شیخ زادون نے اختیار کر لیا۔ غلام رسول خان کا بیٹا گوری پٹے باز لکھنؤ مین اس فن کا سب سے بڑا باکمال مانا جاتا تھا۔ جسکے صدہا واقعات عوام مین مشہور رہتے۔ مگر افسوس اب یہ افسانے بھی موجودہ نسل کو بھولتے جاتے ہین۔

میر رستم علی کے سینے مین دونون طرف بازمہ ہوتی اور اُسے ہلاتے ہوئے سیکڑون حریفون کو چیر کے نکل جاتے۔ انھین کے ایک شیخ زادے شیخ محمد حسین دونون ہاتھون سے پٹہ ہلاتے۔ چنانچہ غازی الدین حیدر کے زمانے مین ایک دن صاحب رزیڈنٹ بہادر اور بعض یوروپین مہمانون نے اس فن کے کسی صاحب کمال کا کمال دیکھنا چاہا۔ شیخ محمد حسین آموجود ہوے۔ چونکہ اُس وقت پٹہ اُنکے پاس نہ تھا شاہی اسلحہ خانے سے ایک پُرتکلف مرصع و مکلل پٹہ دیا گیا۔ جسے لے کے اُنھون نے ایسے ایسے کمالات دکھائے کہ ہر طرف سے تحسین کے نعرے بلند ہوے۔ اور وہ اسی تحسین و مرحبا کے جوش مین پٹہ ہلاتے ہوے مجمع سے نکل کے چلے گئے۔ اور اپنے گھر پہونچے۔ اہل فن مین مشہور تھا کہ جو شخص پٹہ ہلانا جانتا ہے وہ دس تلوار والون کو بھی پاس نہ پہونچنے دے گا۔

اسی فن کے ایک صاحب کمال لکھنؤ مین میر ولایت علی ڈنڈا توڑ تھے۔ اُنکی نسبت شہرت تھی کہ حریف کے ہاتھ مین کتنا ہی زبردست ڈنڈا ہو اُسے توڑ ڈالتے۔

(۳) بانک

فنون جنگ مین یہ بہت ہی اہم اور نہایت بکارآمد فن تھا۔ اور اصولاً دوسرے فنون پر فوقیت رکھتا تھا۔ اور شریف زادے خاص کوشش اور خاص شوق سے اس فن کو سیکھتے۔ اصلی غرض اس فن کی چھریون سے حریف کا مقابلہ کرنا ہے۔ یہ فن قدیم الایام سے ہندوؤن مین بھی تھا اور عربون مین بھی۔ مگر چھریان دونون کی جدا گانہ ہوتی تھین۔ ہندوؤن کی چھری سیدھی ہوتی جس پر دونون طرف باڑھ ہوتی۔ اور عربون کی چھری خمدار خنجر نما ہوتی جس پر ایک ہی طرف باڑھ ہوتی۔ مگر عربون کی آخری چھری جنبیہ ہے جس کی نوک سے کچھ دور تک چارون طرف چار باڑھین ہوتی ہین۔ اور اس سے ایسا چوپہلا زخم پڑتا ہے کہ کہتے ہین کہ اس مین ٹانکا لگانا مشکل ہوتا ہے۔ غرض اس حربے سے لڑنے کے فن کا نام بانک ہے اس کی تعلیم یون ہوتی ہے کہ اُستاد شاگرد دونون آمنے سامنے دوزانو بیٹھتے ہین۔ مگر ہندوؤن والی سیدھی چھری کی تعلیم مین قاعدہ تھا کہ دونون مقابل دوزانو بیٹھنے کے ساتھ ایک گھٹنا کھڑا رکھتے۔ اور عربون والی چھری کی تعلیم مین بالکل دوزانو بیٹھتے تھے۔ اور چوٹون کے ساتھ بڑے زبردست پیچ ہوتے جن کے آگے کشتی کے پیچون کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ یہ فرق بھی بتایا جاتا ہے کہ عربون کے فن مین اصلی سات چوٹین تھین اور ہندوؤن کے فن مین نو۔ عربون کی بانک مین پیچ پورا بندھ جاتا تو حریف کو زندہ چھوڑنا باندھنے والے کے اختیار سے باہر ہو جاتا۔ اور ہندوستان والون کے فن مین آخر تک اختیار مین رہتا کہ جب چاہین پیچ کھول کے حریف کو بچا دین۔

اس فن مین صرف چوٹین ہی نہین ہین بلکہ بڑے بڑے زبردست پیچ ہین۔ جن مین دونون حریف گھنٹون سے گتھے رہتے۔ اور پے درپے پیچ کرکے ایک دوسرے کے باندھ کے زخمی کر دینے کی کوشش کرتے۔ اس فن کے پیچ اس قدر سچے اور علمی اور اصول کے ساتھ تھے کہ کہا جاتا کشتی اور لکڑی کے تمام پیچ بانک ہی سے نکلے ہین۔ بانک کے اُستادون مین مشہور تھا کہ بانک لیٹ کے پوری ہوتی ہے۔ بیٹھ کے آدھی رہتی اور کھڑے ہو کے صرف چوتھائی رہ جاتی ہے۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ

بنکیت کا کام صرف یہ ہے کہ حریف کو چھری سے زخمی کر دے۔ نہین۔ اُس کا اصلی کام یہ ہے کہ حریف کو زندہ باندھ لے۔ اور بے بس کر کے گرفتار کر لائے۔

ایک یہ خاص بات بھی تھی کہ بانک والا اپنے فن کو حتی الامکان مخفی رکھتا۔ اُس کی وضع قطع اور طور طریق کسی بات سے نہ پہچانا جاتا کہ وہ سپہگری ہے بنکیت عام ثقہ شریفون کی وضع رکھتے۔ کفشین پہنتے۔ کوئی ہتھیار نہ باندھتے۔ حتیٰ کہ اُن مین لوہے کے قلمتراش یا سوئی تک کے پاس رکھنے کی قسم تھی۔ صرف ایک رومال رکھتے۔ اور اُس کے ایک کونے مین ایک لوہے کا چپا بندھا رہتا۔ بس یہی حربہ ضرورت کے وقت اُنھین کام دے جاتا۔ یا اس سے بھی زیادہ تہذیب برتتے تو ہاتھ مین تسبیح رکھتے۔ اور اُس مین لوہے کا بھدا سا قبلہ نما لگا ہوتا۔ بس یہی حربہ اُن کے لیے کافی تھا۔

ہندوون مین قدیم الایام سے یہ فن خاص برہمنون مین تھا۔ راجپوت نہین جانتے تھے۔ نہ برہمن اُنھین سکھاتے اور نہ وہ اپنی وضع کے خلاف تصور کر کے اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے۔ جس کی غالباً وجہ یہ تھی کہ بنکیت ہونے کے لیے ثقاہت شرط تھی۔ اور راجپوت کھلے سپاہی تھے۔ برہمن بنکیت قبلہ نما یا لوہے کے چپنے کے عوض ایک کنجی رکھتے جو جنیو مین بندھی رہتی۔ اور اُس سے کام لے کے نہایت ہی تہذیب و متانت کے ساتھ دشمن کا کام تمام کر دیتے۔ شاہزادہ مرزا ہمایون قدر بہادر فرماتے ہین کہ لکھنؤ مین یہ فن شاہ عالم کے زمانے مین اُسوقت آیا جب مرزا خرم بخت بہادر بنارس آئے اور اس فن کے دو ایک باکمال اپنے ساتھ لائے۔ لیکن ہمین معتبر ذریعے اور تاریخ فیض آباد کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اس فن کے باکمال منصور علی خان بنکیت و شجاع الدولہ ہی کے زمانے مین فیض آباد مین آ گئے تھے۔

نواب آصف الدولہ کے عہد مین بانک کے اُستاد لکھنؤ مین شیخ نجم الدین تھے اُسی قریب زمانے مین بانک کے ایک دوسرے اُستاد لکھنؤ مین موجود تھے۔ جو میر بہادر علی کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کو دعوے تھا کہ پلنگ کے نیچے جنگلی کبوتر

چھوڑ دیجیے ۔ اور تماشا دیکھیے ۔ کسی طرف سے نکل کے اُڑ جائے تو جانیے کہ مین بنکیت نہین ۔ اُنھین پر منحصر نہین بانک کی بھی تعریف ہے ۔ اور ہر اُستاد اس کا دعوٰے کر سکتا تھا ۔ لکھنؤ مین ایک تیسرے اُستاد ولی محمد خان تھے ۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے مین شیخ نجم الدین کے شاگرد کے شاگرد میر عباس کا نام مشہور تھا ۔ اور اُنکے چار شاگرد نامور ہوے ۔ جن مین سے ایک تو ڈاکو تھا ۔ باقی تین مہذب شرفا تھے ۔ اس فن کے آخری اُستاد میر جعفر علی تھے ۔ جو لکھنؤ کی تباہی کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیا برج مین پہونچے ۔ اُنھین مین نے دیکھا تھا ۔ اور بچپن مین مین خود اُن کا شاگرد ہوا تھا ۔ مگر دو ایک ہینے سیکھ کے چھوڑ دیا ۔ اور جو کچھ سیکھا تھا خواب وخیال سا رہ گیا ۔ اب نہین جانتا کہ کوئی جاننے والا بھی باقی ہے یا نہین ۔

(۴) بنوٹ

اس فن کی اصلی غرض یہ ہے کہ حریف کے ہاتھ سے تلوار ۔ لٹھ ۔ یا کوئی حربہ ہو گرا دے ۔ اور ایک رومال سے جس مین پیسہ بندھا ہوا کرتا ہے یا اپنے ہاتھ ہی سے حریف کو ایسا صدمہ پہونچائے کہ اُس کا کام تمام ہو جائے ۔ اس فن کی نسبت لکھنؤ مین ابتدا سے مشہور تھا کہ اس کے بڑے بڑے زبردست اُستاد حیدرآباد دکن مین ہین ۔ اور وہان جانے اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ واقعی وہان اب تک یہ فن ایک حد تک زندہ ہے ۔ واقف کار لوگون کا بیان ہے کہ کھڑے ہوکے مقابلہ کرنے والا صاحب فن اگر نہتا ہے تو کشتی ہے ۔ اُس کے ہاتھ مین چھُری ہے تو بانک ہے ۔ اور اگر کوئی دو گز کا لمبا سونٹا یا رومال اُسکے ہاتھ مین ہے تو بنوٹ ہے ۔ بنوٹ والے بھی اپنے فن کو مخفی رکھتے ہین ۔ اور باہمی عہد ہے کہ صرف شریف کو سکھائین گے ۔ اور اُس سے عہد لیتے ہین کہ کبھی کسی زیردست یا بے آزار آدمی پر حربہ نہ کرین گے ۔ بنوٹ والون کے پینترے جنھین وہ پاؤن کہتے ہین بہت ہی اعلیٰ درجے کے پھُرتیلے ہین اور بے انتہا صفائی چاہتے ہین جو زیادہ عمر والون کو نہین حاصل ہو سکتے ۔ اسکے علاوہ بنوٹ والون کو جسم انسانی کے تمام رگ پٹھون کا پورا علم ہوتا ہے ۔ اور خوب واقف ہوتے ہین کہ کس مقام پر صرف اُنگلی سے دبا دینا یا ایک معمولی چوٹ انسان کو بیتاب وبیدم کر دیگی ۔ اگرچہ اس فن کے

لیے حیدرآباد مشہور تھا مگر لکھنؤ مین بھی اس کے بہت سے باکمال موجود تھے - کہا جاتا ہے کہ یہان سب سے پہلے محمد ابراہیم خان رامپور سے لائے تھے - طالب شیر خان یہان ایک بڑے زبردست بانکے تھے اور تلوار کے دھنی - اُنھون نے جو ابراہیم خان کا دعویٰ سُنا تو تلوار لے کے مقابلے کو تیار ہو گئے - محمد ابراہیم خان نے بھی مقابلہ منظور کر لیا - طالب شیر خان نے جیسے ہی تلوار ماری محمد ابراہیم خان نے اپنا رومال جس کے کونے مین پیسہ بندھا ہوا تھا کچھ ایسی خوبی سے مارا کہ طالب شیر خان کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کے چھن سے دُور جا گری - مُنہ دیکھ کے رہ گئے - اور سب نے محمد ابراہیم خان کی اُستادی کا اعتراف کر لیا -

اس کے بعد لکھنؤ مین آخر تک یہ فن رہا - یہان تک کہ مٹیا برج مین بھی محمد مہدی نام ایک شخص جو نواب معشوق محل کے وہان کے داروغہ تھے بنوٹ کے باکمال اُستاد مانے جاتے تھے -

(۵) کُشتی

یہ فن خاص آریون کا تھا - ہندوستان مین بھی اور ایران مین بھی - عرب اور تُرک اس سے بالکل ناآشنا تھے - ہندوستان کے قدیم باشندون مین بھی جو آریہ لوگون سے پہلے تھے اس فن کا پتہ نہین چلتا - لکھنؤ مین پیچون اور حریف کے زیر کرنے کے طریقون کا بہت نشو و نما ہوا - مگر کُشتی کا اصلی دار و مدار جسمانی قوت پر ہے - اور قوت مین لکھنؤ والے لاکھ کوشش کرین مشرقی ممالک خاصتہً پنجاب کے لوگون کا ہرگز مقابلہ نہین کر سکتے - لکھنؤ کی آب و ہوا کو قدرت نے یہ صلاحیت ہی نہین دی ہے کہ اسکی خاک سے غلام وغیرہ کے ایسے ہیلتن پہلوان پیدا ہون - اس لیے لکھنؤ کا کُشتی کا فن صرف پیچیتی کا کمال دکھاتا تھا جس مین زیادہ سے زیادہ اپنے سے دُونے پر غلبہ حاصل ہو جاتا - مگر اس سے زیادہ طاقت والے کو زیر کرنا غیر ممکن تھا - لکھنؤ کے اکھاڑون اور اگلے پہلوانون کے قصے بہت مشہور ہین - مگر سب پیچیتی کے لحاظ سے نہ زور آوری کے اعتبار سے - ایک بار مین نے یہان کے ایک مشہور پہلوان سیّد کی لڑائی ایک دُونے قد کے پنجابی پہلوان سے دیکھی - یہ چھوٹا اور اپ سے مین شک نہین کہ سیّد کی لڑائی ابتدا سے نہایت خوبصورت تھی - اُسکی چلت

اور اُس کا پھرتیلا پن قابل تعریف تھا - مگر انجام یہ ہوا کہ گھنٹہ بھر مین سیّد پسینے مین ڈوبا ہوا تھا - طاقت جواب دے چکی تھی اور دم پھول گیا تھا - اور پنجابی پہلوان پر جو اُسے کھلا رہا تھا کچھ اثر نہ ہوا تھا - آخر سیّد خود ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا اور بے لڑے ہار ہی مان لی -

(۶) برچھا

جنگجوئی کا یہ پُرانا فن ہے جو آریون - ترکون - اور عربون سب مین تھا - عربون کا برچھا لمبا ہوتا - اور اُس کا پھل تکّنا - ترکون کا برچھا چھوٹا ہوتا اور پھل گول نوکدار یعنی مخروطی - اور ہندوستان کے آریون کا برچھا لمبا ہوتا مگر اُس کا پھل پتلا باڑھ دار پان کی قطع کا - اور تعجب یہ ہے کہ تینون طرح کے نیزے لکھنؤ مین موجود تھے - بڑے برچھے پانچ گز کے لمبے ہوتے اور چھوٹے برچھے تین گز کے بڑے برچھے کی یہ تعریف تھی کہ خوب لچکے یہان تک کہ دُہرا ہو جائے - اور چھوٹون کی یہ تعریف تھی کہ اُس مین نام کو بھی لچک نہ ہو - اور اسی مناسبت سے دونون کے چلانے کے فن جدا جدا تھے - لکھنؤ کے مشہور اور اصلی برچھیت میر کلّو تھے - جن کا نام بُرہان الملک کے زمانے ہی مین چمک گیا تھا - اُن کے بعد میر اکبر علی برچھیت مشہور ہوے - پھر بریلی اور رامپور سے اکثر برچھیت آنا شروع ہو گئے - غازی الدین حیدر کے زمانے مین بادشاہ کو ہاتھیون کے شکار کا شوق ہوا تو برچھے کا فن جاننے والون کی بڑی قدر ہوئی - اور لڑائیون مین یہی حربہ زیادہ کام دینے لگا - افسوس یہ قدیم حربہ جس سے بڑی بڑی پُرانی قومون نے ناموری پیدا کی تھی لکھنؤ مین اصلی یا نقلی طور پر آج بھی کثرت سے باقی ہے - مگر صرف براتون کے جلوس کا کام دیتا ہے -

(۷) بانا

یہ فن بھی ادنیٰ درجے کے لوگون مین تھا اور کسی حد تک اب بھی باقی ہے - لٹھ کی لڑائی کے ہاتھ اور زدین اسی سے نکلی ہین - غرض اور غایت بانے کی ہے کہ بانا یا لٹھ چلاتا ہوا انسان دشمنون کے نرغے مین سے نکل جائے - بانا لمبی لکڑی کا نام تھا جس کے ایک طرف لٹو ہوتا - اور بعض دونون طرف

والور
پٹھون کا پورا علم
سے دبا دینا یا ایک معم

لٹو رکھتے - اور اس طرح ہلاتے کہ کوئی قریب نہ آ سکتا - بعض لوگ لٹوؤن مین کپڑا باندھ کے اور تیل مین ڈبو کے اُنھین روشن کرتے - اور اس طرح ہلاتے کہ اپنے اوپر آگ کا مطلق اثر نہ ہو اور دشمن آگ کی وجہ سے دُور ہی دُور رہے -

(۸) تیراندازی

یہ دنیا کی تمام جنگجو قومون کا پُرانا حربہ اور عہد قدیم کی بندوق ہے جس مین بڑے بڑے کمالات دکھائے جاتے - اور شریف و رذیل سب اس کی تعلیم لازمی سمجھتے - یہی حربہ ہے جس سے راجہ رامچندر جی اور اُن کے بھائی لچھمن جی نے راون اور اُس کے ایسے کوہ پیکر حریفون کو مار کے گرا دیا - اگرچہ بندوق کی ایجاد نے اُس کا زور کم کر دیا تھا مگر پھر بھی سپہگری کا اعلیٰ جوہر تیراندازی سمجھی جاتی - کمانین اتنی کڑی رکھی جاتین کہ اُن کا چلّہ کھینچنا ہر ایک کے لیے آسان نہ تھا بلکہ جس کی کمان جتنی زیادہ کڑی ہوتی اُسی قدر زیادہ اُس کا تیر دُور جاتا - اور کاری ہوتا - عربون نے اپنی فتوحات کے زمانے مین تیراندازی کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہین جو حیرت انگیز ہین - اُم ابان نام دس پانچ ہی روز کی بیاہی ہوئی ایک عربیہ دولھن نے فتح دمشق کے موقع پر اپنے شہید دولھا کے انتقام مین ایسے زبردست تیر برسائے کہ پہلے نے دشمنون کے علمبردار کو مار کے گرا دیا - اور دوسرا دشمنون کے بہادر سردار ٹامس کی آنکھ مین اس طرح پیوست ہو گیا کہ کسی کے نکالے نہ نکل سکا - اور آخر کانسی کاٹ کے آنکھ ہی مین چھوڑ دی گئی -

اودھ کے پاسی اور بھر اس فن کو پہلے سے بخوبی جانتے تھے - پھر نئے نئے اُستاد دہلی سے آئے - اور آصف الدولہ کے عہد مین اُستاد فیض بخش نے بادشاہ کے اشارے سے مرزا حیدر کے والد کو جو ہاتھی پر سوار آ رہے تھے ایسی پھرتی سے تیر مارا کہ نہ کسی نے اُن کو نشانہ بازی کرتے دیکھا اور نہ انھین خبر ہوئی - حالانکہ تیر پٹکے کو توڑ کے نکل گیا تھا - وہ آخر تک بےخبر رہے - گھر پہونچ کے پٹکہ کھولا تو وہ خون آلود تھا - اور ساتھ ہی زخم سے خون کا فوارہ چھوٹا اور دم بھر مین مر گئے -

اس کی تعلیم کا طریقہ بھی مشکل تھا۔ مگر اب یہ فن دنیا کی تمام متمدن قوموں مین فنا ہو گیا۔ اس لیے کہ موجودہ آتشبار اسلحے نے اسے بالکل بیکار کر دیا ہے۔ مگر ہندوستان کی وحشی قومون مین آج تک باقی ہے جو شکار اور درندون کے مارنے مین عموماً اور کبھی کبھی باہمی جنگ و پیکار مین بھی تیرون سے کام لیا کرتی ہین۔

(۹) کٹار

یہ پرانا خاص آریہ قوم کا حربہ تھا۔ اور آخر مین اُس سے زیادہ تر چور اور قزاق کام لیتے۔ اُس سے حریف پر ٹوک کے حملہ نہ کیا جاتا بلکہ اُسے غافل رکھ کے حملہ کیا جاتا۔ اسی وجہ سے غالباً دہلی مین بھی اور خاصۃً لکھنؤ مین شرفا نے اُس سے کام لینا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ کٹار سب باندھتے مگر اس سے لڑنا اور حرب کرنا کوئی نہ جانتا تھا۔ اُس سے حربہ کرنے کی تعریف یہ تھی کہ جب چاہین تو حربہ کرین مگر دشمن کے جسم مین کہین خراش بھی نہ آئے۔ اور جب چاہین تو قبضے تک پار ہو جائے۔ اِس سے چور اکثر راتون کو غافل اور سوتے حریف پر حملہ کرتے اور چھپ کے اُس کا کام تمام کر آتے۔

(۱۰) جل بانک

یہ وہی بانک کا مذکورہ فن تھا جو پیراکی اور شناوری سے وابستہ کر دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ گہرے پانی مین دشمن پر قابو حاصل کرین۔ اور اُسے باندھ لائین یا پانی ہی مین اُس کا کام تمام کر دین۔ تاریخ مین اور کسی جگہ اس کا تذکرہ نہین۔ مگر لکھنؤ مین پیرنے کے ایک اُستاد میر کب جان نے اسے ایجاد کیا۔ اور سیکڑون شاگردون کو سکھایا۔ بادی النظر مین اس کی ایجاد لکھنؤ ہی مین ہوئی اور آج بھی پیراکی کے بعض ہین کے اُستاد جانتے ہین۔ اور کہین اس فن کا نام و نشان بھی نہین۔

پیرائیون مین لکھنؤ نے جو ترقی کی اُس کا تذکرہ ہم آیندہ کرین گے۔

(۱۸)

اُردو مین مثل مشہور ہے کہ "بڑھاپے مین انسان کی قوت شہوانی زبان مین آجایا کرتی ہے۔" ویسے ہی بہادرون اور جانبازون کی قوت شجاعت کی نسبت

اکثر تجربہ ہوا ہے کہ جب کمزوری آتی ہے یا ہاتھ پیرون کی طاقت جواب دیتی ہے تو ساری بہادری اور شجاعت دست و بازو سے نکل کے زبان اور آنکھون مین جمع ہو جاتی ہے۔ اب وہ اپنی گذشتہ شجاعت و ناموری کے افسانے بیان کرتے اور شجاعت کے کارنامے اپنی ذات سے نہین دکھاتے بلکہ اُن کا تماشا لڑنے والے جانورون کے ذریعے سے دیکھتے اور دوسرون کو دکھا دکھا کے داد طلب ہوتے ہین۔

یہی حال لکھنؤ کا ہوا۔ جب لوگون کو ملک گیری و صف آرائی سے فرصت ملی اور میدان جنگ مین کھڑے ہونے کا حوصلہ نہ رہا تو جنگجوئی کے جذبات نے جانورون کو لڑا لڑا کے جانبازی و خون ریزی کا تماشا دیکھنے کا مشغلہ پیدا کیا۔ یہ شوق یون تو تھوڑا بہت سب جگہ ہے مگر اس مین جس قدر انہماک اہل لکھنؤ کو ہوا اور ان بے نتیجہ بلکہ سنگدلی کی دلچسپیون کو ان لوگون نے جس درجۂ کمال کو پہونچا دیا اور مقامات کے لوگون کے خواب و خیال مین بھی نہ گذرا تھا۔ اور اگر غور سے دیکھیے تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس شوق اور ان مشاغل کے جیسے کرشمے اور دلکش تماشے سواد لکھنؤ مین دیکھے گئے دہلی یا ہندوستان کا کوئی دربار درکنار غالباً ساری دنیا کے کسی شہر مین نہ دیکھے گئے ہون گے۔

لکھنؤ مین غیر کی شجاعت سے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا یہ شوق تین طریقون سے پورا کیا گیا۔ (الف) درندون اور چوپاؤن کو لڑا کے (ب) طیور کو لڑا کے۔ (ج) تکلین اور کنکوے لڑا کے یعنی پتنگ بازی کے ذریعے سے۔ ان تینون قسمون کو ہم بقدر اپنی جستجو اور معلومات کے جدا جدا تفصیل سے بیان کرنا چاہتے ہین۔

قسم اول یعنی درندون اور چوپاؤن کی لڑائی کا تماشا یہان مندرجۂ ذیل جانورون کو لڑا کے دکھا گیا (۱) شیر۔ (۲) چیتے۔ (۳) تیندوے (۴) ہاتھی۔ (۵) اونٹ۔ (۶) گینڈے۔ (۷) بارہ سنگھے۔ (۸) بینڈھے۔ درندون کے لڑانے کا مذاق قدیم ہندوستان مین کہین یا کبھی نہین سنا گیا تھا۔ یہ اصلی مذاق پرانے رومیون کا تھا جہان انسان اور درندے کبھی باہم اور کبھی ایک دوسرے سے لڑائے جاتے تھے۔ مسیحیت کے عروج پاتے ہی وہان بھی یہ مذاق چھوٹ گیا تھا۔ مگر اب ملک اسپین مین اور بعض دیگر ممالک یورپ مین وحشی سانڈ باہم اور کبھی کبھی انسانون

سے لڑائے جاتے ہین - لکھنؤ مین غازی الدین حیدر بادشاہ کو غالبًا اُنکے یوروپین دوستون نے درندون کی لڑائی دیکھنے کا شوق دلایا - بادشاہ فوراً آمادہ ہوگئے - اور چند ہی روز مین شاہی دلچسپی ان خوفناک اور وحشیانہ لڑائیون مین ایسی بڑھی کہ کوئی امکانی کوشش نہین اُٹھا رکھی گئی - موتی محل مین عین لب دریا دو نئی کوٹھیان مبارک منزل اور شاہ منزل تعمیر کی گئین - اُنکے مقابل دریا پار کوسون تک ایک فرحت بخش سبزہ زار چلا گیا تھا - جس مین آہنی کٹہرے سے گھیر کے ایک وسیع رمنہ بنایا گیا تھا - اُس مین قسم قسم کے ہزارہا جانور لا کے چھوڑے گئے تھے - اور درندے کٹہرون مین بند کر کے رکھے گئے تھے - اسی رمنے کے سلسلے مین دریا کنارے ہی وحشی جانورون کے لڑانے کے لیے بڑے بڑے میدان بانس کے ٹٹھرون یا آہنی حصار سے محفوظ کیے جاتے جو شاہ منزل کے عین محاذی دریا کے اُس پار ہوتے - دریا کا پاٹ وہان بہت کم ہے - بادشاہ اور اُنکے مہمان و مصاحبین شاہ منزل کے بالائی صحن پر گنگا جمنی شامیانون کے سائے مین بیٹھ کے اطمینان اور آرام سے سیر دیکھتے اور پار کے محدود میدان مین درندون کی قیامت خیز لڑائی کا محشر بپا ہوتا - درندون اور مست ہاتھیون کا لڑانا تو آسان ہے مگر اسکی سنبھال نہایت ہی مشکل ہے ایک مست ہاتھی یا شیر کٹہرے سے چھوٹ جاتا ہے تو شہرون مین ہلچل پڑ جاتی ہے اور بہت سی جانین ضائع ہو جاتی ہین - مگر یہان لوگ اس خوفناک کام مین اسقدر ہوشیار ہو گئے تھے کہ اُس وقت جو یورپین سیاح دربار مین موجود تھے - خود اپنی تحریرون مین اقرار کرتے ہین کہ وحشی جانورون کے پالنے - سدھانے - اور اُن کی داشت اور سنبھال کرنے والے آدمی لکھنؤ سے بہتر دنیا بھر مین کہین نہین ہین یہی لوگ ہاتھیون اور درندون کو لا کے چھوڑتے - اُن کو اپنے بس مین رکھتے - اُن کے ہارتے وقت غالب و مغلوب دونون درندون کو اپنے قابو مین کرتے - اس کام کے لیے سیکڑون سانٹے مار اور بلم بردار مقرر تھے جو اُنھین مارتے اور اپنے آپ کو اُن کے حملون سے بچاتے - لوہے کی دہکتی ہوئی سلاخون اور آتشبازیون سے اُنکو جدھر چاہتے موڑتے اور جہان چاہتے ہنکا لیجاتے - شیرون اور تیندوون کو کٹہرون مین بند کرتے - غرض اُن لوگون کی پھرتی - چالاکی - اور جلیت پھرت اور ہوشیاری

خود جانورون کی لڑائی سے زیادہ دلچسپ اور حیرت انگیز تھی۔ جن باتون کو دیکھ کے دم بھر مین نظر آ جاتا تا کہ ان بڑے بڑے دیوہیکل جانورون اور مہیب وحشی درندون پر انسان دنیا مین کن اسباب سے غالب آیا ہے۔ اب ان جانورون مین سے ہر ایک کی لڑائی کا جداگانہ حال سُنیے جو غالباً لطف سے خالی نہ ہوگا۔

(۱) شیر

بادشاہ نے بہت سے شیر جمع کر رکھے تھے۔ جو نیپال کی ترائی سے پکڑ پکڑ کے لائے جاتے۔ ان مین سے بعض بہت بڑے تھے۔ بعض مختلف لڑائیون مین غالب آ کے بادشاہ کو بہت عزیز ہو گئے تھے۔ لڑائی کے لیے اُن کے کٹہرے میدان کے حصار کے پاس لا کے کھول دیے جاتے۔ دونون حریف چھوٹتے ہی غرا کے ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے۔ اور دانتون اور پنجون سے ایک دوسرے کو زخمی کرتے۔ باہم گتھ جاتے۔ کبھی یہ اُس کو گرا کے اوپر چڑھ بیٹھتا کبھی وہ اس کو زیر کرتا۔ دیر تک ایک نہایت ہولناک لڑائی ہوتی رہتی۔ جس مین کبھی تو ایک حریف جان سے مارا جاتا اور کبھی سخت زخمی ہو کے ہمت ہارتا۔ کثرت سے خون نکل جانے کے باعث کمزور ہو کے بھاگتا۔ اور حریف غصے سے اُس کا تعاقب کرتا۔ اُس وقت اُن دونون کے سنبھالنے اور قابو مین لانے کے لیے لڑانے والون کا کمال اور اُنکی دوڑ دھوپ اور کارستانیان دیکھنے کے قابل ہوتین۔

شیر اکثر تیندوون سے لڑائے جاتے۔ مگر یہان ایسے ایسے زبردست تیندوے تھے جن سے شیر بہت ہی کم جیت سکتا۔ اُن کی لڑائی کی شان بھی وہی ہوتی جو شیرون کے باہم لڑنے کی ہے۔ کبھی کبھی شیر اور ہاتھی بھی لڑا دیے جاتے۔ مگر لڑائی جوڑ کی نہ ہوتی۔ اور اُسکے نتیجے بھی خلاف اُمید مختلف قسم کے ہوتے۔ گینڈون پر خوب جیالا ہوا تو شیر بہت کم اُس سے پیش پا سکتا تھا۔ کبھی تو وہین میدان لڑائی شیر اور گینڈے کی ہوتی۔ گینڈا سوا پیٹھ کے حصہ زمینو تا ہے ہوا ہے۔ اُس پر نہ شیر کے دانت اثر کرتے ہین نہ پنجے۔ اسی زعم مین وہ کسی زبردست سے زبردست حریف کی پروا نہین کرتا ہی دلچسپ سر جھکا کے حریف کے پیٹ کے نیچے گھستا ہے تو اپنے باسنے کے اوپر دشاہ کے

سینگ پیٹ میں اس طرح پیوست کر دیتا ہے کہ آنتیں باہر نکل پڑتی ہیں۔ اور حریف کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کبھی ایسا ہوا کہ شیر نے گینڈے کو چاروں شانے چت گرا کے اپنے ناخنوں اور دانتوں سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالا ہو۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا کہ گینڈا اپنا سینگ بھونک کے شیر کو مار ڈالتا۔

مگر سب سے زیادہ حیرتناک یہ چیز ہے کہ نصیر الدین حیدر بادشاہ کے زمانے میں ایک مرتبہ ایک گھوڑے کے مقابلے میں شیروں کو بڑی زک اُٹھانا پڑی۔ یہ عجیب و غریب گھوڑا تھا جو مردم آزاری میں درندوں سے بھی بڑھ گیا تھا۔ مجال نہ تھی کہ کوئی آدمی اُس کے پاس جائے۔ دانہ دُور سے اُس کی طرف بڑھا دیا جاتا۔ اور جب چھوٹ جاتا بہت سے آدمیوں کو ہلاک کر ڈالتا۔ جو سامنے آتا اُسے مار کے ہڈیاں پسلیاں چبا ڈالتا۔ اور لاش ایسی بگاڑ دیتا کہ پہچانی نہ جاتی۔ مجبوراً تجویز ہوئی کہ اُس پر شیر چھوڑ دیے جائیں۔ چنانچہ بھورا نام شیر جو بادشاہ کو عزیز تھا اور اکثر بازیاں لے چکا تھا اُس پر چھوڑا گیا۔ گھوڑا بجائے اسکے کہ شیر سے خوف کھائے لڑنے کو تیار ہو گیا۔ اور جیسے ہی شیر جست کر کے اُس پر آیا اُس نے اس طرح اگلا جسم جھکایا کہ شیر پٹ پر گرا اور اُسکے پٹھوں میں ناخنوں کے خنجر پیوست کر دیے۔ ساتھ ہی گھوڑے نے اس زور سے دولتی ماری کہ شیر قلابازیاں کھاتا ہوا دُور جا گرا۔ مگر پھر سنبھلا اور چند منٹ ادھر اُدھر تاؤ دے لگ کے پھر جست کر کے گھوڑے پر جا رہا۔ گھوڑے نے پھر وہی حرکت کی کہ اگلا جسم جھکا دیا۔ شیر پٹھوں پر جا پڑا اور ارادہ کیا کہ اُسے پنجوں دانتوں سے مار ڈالے مگر گھوڑے نے اب کی اس زور سے دولتی جھاڑی کہ شیر کے لوگ ہاتھ دیکھ گئے۔ اور چاروں شانے چت دُور جا گرا۔ لیکن اس چوٹ سے شیر ہارتے وقت غالب تھی کہ گھوڑے کی طرف پیٹھ پھیر کے بھاگنے لگا۔ اور تماشائی لیے سیکڑوں سامنے دوسرا اُس سے بڑا شیر چھوڑا گیا۔ اُس نے رُخ ہی نہ کیا۔ اُن کے حلوں سے کیا گیا۔ اور تین آرنے بھینسے چھوڑے گئے۔ وہ بھی گھوڑے جدھر جاتے مونھوڑے نے بڑھ کے بے چپڑے ایک بھینسے پر اس زور سے مین سند کر سے تو وہ بھنبھنا تیورا گیا۔ اور اُس کے دونوں ساتھی اس طرح

سر ہلانے لگے گویا داد دے رہے ہین کہ "ہان! یہ ہوئی!" آخر گھوڑے کی جان بخشی کی گئی۔ اور نصیرالدین حیدر نے کہا "مین اس کے واسطے ایک آہنی کٹہرا بنوادون گا۔ اور اس کی پرورش کا بھی سامان کردون گا۔ ابا جانی کے سر کی قسم یہ بڑا بہادر ہے"۔

(۲) چیتا

سب ہی درندے لڑائی کے لیے دو ایک دن پیشتر سے بھوکے رکھے جاتے ہین مگر چیتے کے بارے مین اس کا خاص اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ چیتا جس قدر زیادہ ظالم و خونخوار ہے اُسی قدر بعض وقت بزدل بھی ثابت ہوتا ہے۔ علی العموم بگڑے امیرزادون کی طرح وہ خوشامد طلب خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ میدان مین جب اُس کا جی چاہے لڑتا ہے اور جب نہ جی چاہے لاکھ جتن کرو نہین لڑتا۔ لڑائی مین وہ کتراتا اور کنیاتا ہوا حریف پر جاتا ہے۔ پہلے جست کرکے ایک دوسرے کو زخمی کرنا چاہتا ہے۔ ایسی دو ایک جستون کے بعد دونون پچھلے پانوٗن پر کھڑے ہوکے پنجون سے لڑنے لگتے ہین۔ یہ بڑی خونریز لڑائی ہوتی ہے۔ جس مین دونون غراتے جاتے ہین اور حریف پر پنجے مارتے جاتے ہین آخر زبردست کمزور کو گراکے چکیتین مار مار کے حریف کا کام تمام کردیتا ہے۔ مگر خود بھی سر سے پانوٗن تک زخمی ہوجاتا ہے۔

(۳) تیندوا

تیندوا چھوٹے پیمانے کا شیر ہوتا ہے۔ مگر کہا جاتا ہے کہ لکھنؤ مین شیرون سے اکثر لڑنے والے تیندوے تھے جو قیامت کی لڑائی لڑتے۔ اور اکثر شیرون پر غالب آجاتے۔ تیندوے کی لڑائی بالکل شیرون کی سی ہوتی ہے۔ لڑتے لڑتے دونون حریف سخت زخمی ہوجاتے ہین۔ اور مغلوب حریف کبھی تو وہین میدان مین گرکے مرجاتا ہے اور کبھی دشمن سے ہار کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے

(۴) ہاتھی

لکھنؤ مین ہاتھیون کی لڑائی بہت پسند کی جاتی تھی اور نہایت ہی دلچسپ سمجھی جاتی۔ اور یہ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے

زمانے مین ڈیڑھ سو لڑائی کے ہاتھی تھے جن کو سواری سے تعلق نہ تھا - ہاتھیون کی لڑائی کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مست ہوگئے ہون - اس لیے کہ ہاتھی جب تک مست نہ ہون نہین لڑتے - اور لڑین بھی تو اُن مین فتحیابی اور حریف پر غالب آنے کا سچا جوش اور غصہ نہین ہوتا -

لڑائی کے وقت اُن کی گردن سے دُم تک ایک رسّا بندھا ہوتا ہے - حریف کا سامنا ہوتے ہی دونون حریف سونڈین اور دُمین اُٹھا کے زور سے چنگھاڑتے ہوے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے ہین - اور بڑی زبردست ٹکر ہوتی ہے - اسکے بعد برابر ٹکرون پر ٹکرین ہوتی رہتی ہین جن کی آواز بڑی دُور تک جاتی ہے - پھر دونون ایک دوسرے سے منہ ملاکے اور دانتون کو اَڑا کے ایک دوسرے کو ریلنا اور ڈھکیلنا شروع کرتے ہین جس مین اُن کے جسم کے پیچ وتاب کھانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیسا زور لگا رہے ہین - فیلبان آنکس مار مار کے زور لگانے پر اُکھین اور زیادہ اُبھارتے رہتے ہین - آخر دونون مین سے ایک ہاتھی کمزور پڑتا اور ریلے کی تاب نہ لاکے زمین پر گرتا ہے - غالب ہاتھی اُس وقت اکثر دانت سے اُس کا پیٹ پھاڑ ڈالتا اور کام تمام کر دیتا ہے - لیکن اکثر ہاتھیون کا معمول ہے کہ کمزور پڑتے ہی دانت چھڑا کے بھاگتے ہین اور غالب آنے والا تعاقب کرتا ہے - پا گیا تو ٹکرین مار کے گراتا اور اکثر دانتون سے پیٹ پھاڑ کے مار ڈالتا ہے اور اگر وہ نکل گیا تو جان بچ جاتی ہے -

لکھنؤ مین ہاتھیون سے اکثر گینڈے بھی لڑائے جاتے تھے - لیکن مشکل یہ تھی کہ یہ دونون جانور باہم لڑتے ہی نہ تھے - اور اگر کبھی لڑ گئے تو بلا شک سخت لڑائی ہوتی - اگر کبھی ہاتھی نے گینڈے کو ڈھکیل کے اُلٹ دیا تو اُس کے دانت پیٹ مین پیوست ہوکے اُس کا کام تمام کر دیتے - اور اگر گینڈے نے موقع پاکے اپنا بالائی سینگ ہاتھی کے پیٹ مین اُتار دیا تو کھال دُور تک پھٹ جاتی - مگر ہاتھی سونڈ کی مدد سے گینڈے کے سینگ کو اپنے جسم مین زیادہ دُور تک نہ گھسنے دیتا - اور کاری زخم سے بچ جاتا -

(۵) اونٹ

یون تو دنیا مین ہر ذی روح لڑ سکتا ہے لیکن اونٹ سے زیادہ غیر موزون لڑائی کے لیے کوئی جانور نہین ہو سکتا - مگر لکھنؤ مین اونٹ بھی مست اور پُر جوش بنا کے لڑائے جاتے - اونٹ کی پکڑ مشہور ہے - اور اُس کا بے طریقے گرنا اُس کے حق مین نہایت ہی خطرناک ہے - اونٹون کا جوش کف نکالنے اور جھاگ اُڑانے سے ظاہر ہوتا ہے - وہ کف اُڑاتے ہوے دوڑتے ہین - اور گالیان دینے اور ایک دوسرے کے منہ پر تھوکنے یعنی بلبلانے اور جھاگ اُڑانے سے لڑائی شروع ہوتی ہے - جسے موقع مل گیا حریف کا لٹکتا ہوا ہونٹھ دانتون سے پکڑ لیتا ہے اور کھینچنا شروع کرتا ہے - جس اونٹ کا ہونٹھ حریف کے دانتون مین آ گیا وہ اکثر گر پڑتا اور ہارتا ہے - اور اسی پر لڑائی ختم ہو جاتی ہے -

(۲) گینڈا

گینڈے سے زیادہ مضبوط جانور کوئی نہین پیدا کیا گیا ہے - وہ قد و قامت مین شیر اور ہاتھی سے چھوٹا ہی گرا لیسا . و ئین تن پیدا کیا گیا ہے کہ نہ اُس پر ہاتھی کے دانت کارگر ہوتے ہین نہ شیر کے پنجے اور ناخن - صرف پیٹ کی کھال نرم ہوتی ہے - اگر کوئی جانور اُس پر حربہ کر سکا تو مار لیتا ہے ورنہ ہر جانور اپنا زور صرف کرتے کرتے تھک جاتا ہے اور آخر مین گینڈا اپنا بانسے پر کا زبردست سینگ اُس کے پیٹ مین بھونک کے مار ڈالتا ہے -

لکھنؤ مین گینڈے ہاتھیون سے - شیرون سے - تیندوون سے اور خود گینڈون سے لڑائے جاتے تھے - غازی الدین حیدر بادشاہ کے زمانے مین لڑانے کے علاوہ بعض گینڈے اس خوبی سے سدھائے گئے تھے کہ گاڑی مین جوتے جاتے - اور ہاتھی کی طرح اُنکی پیٹھ پر ہودہ کس کے سواری لی جاتی - گینڈا بالطبع لڑنے والا جانور نہین ہے - بلکہ جہان تک ممکن ہوتا ہے لڑائی کو طرح دیتا ہے - لیکن ہان اگر اُسے چھیڑا جائے تو مقابلے کے لیے تیار ہو کے نہایت ہی موذی بن جاتا ہے نصیر الدین حیدر کے زمانے مین لڑائی کے پندرہ بیس گینڈے موجود تھے جو چاند گنج مین رہا کرتے جب سوار اُنھین رگید کے ایک دوسرے کے مقابل کر دیتے تو وہ سر جھکا کے ایک دوسرے کی طرف دوڑتے اور ٹکرین ہونے لگتین - دونون کی یہ کوشش ہوتی کہ حریف کے پیٹ کو اپنے سینگ سے پھاڑ ڈالین - اور اسی کوشش مین

وہ دیر تک ایک دوسرے کو ریلتے پیلتے اور ڈھکیلتے رہتے - بڑے زور زور سے غراتے - سینگ کو سینگ سے ٹکراتے - اور آخر مین لڑتے لڑتے سر جوڑ کے گتھ جاتے - اور حریف کو ڈھکیلتے رہتے - یہان تک کہ جو حریف کمزور پڑتا ہے وہ آہستہ آہستہ ہٹنے اور جگہ چھوڑنے لگتا ہے - اور اس پر بھی جان نہین چھوٹتی تو بھاگتا ہے - مگر غالب رگید رگید کے مارتا ہے - آخر کمزور ذرا سینگ الگ کر کے مقابلے سے منہ موڑتا اور بڑے زور سے بھاگتا ہے - اگر محصور میدان ہوا تو غالب حریف بھاگتے مین اُسپر حملہ کر کر کے اُسے گراتا اور پیٹ مین سینگ بھونک کے کام تمام کر دیتا ہے - اور اگر وسیع کھلا میدان ہو - اور شکست خوردہ گینڈا بھاگ سکا تو بھاگ کے اپنی جان بچا لیتا ہے - اُسوقت سوار رگید رگید کے اور گرم سلاخون سے مار مار کے غالب کو مغلوب کے تعاقب سے روکتے اور ہٹا لے جاتے ہین - گینڈون کی لڑائی کا سارا دار و مدار اس پر ہے کہ وہ سر جھکائے اور اپنے پیٹ کو بچائے رہین - اگر دھوکے مین بھی کسی کا سر اُٹھ گیا تو مقابل حریف اپنا کام کر گذرتا ہے - چنانچہ ایک گینڈا غالب آ گیا اور اُس کا حریف بھاگنے لگا - اُسے بھاگتے دیکھ کے غالب نے سر اونچا کر دیا - اور ساتھ ہی اُسی شکست خوردہ گینڈے نے بجلی کی طرح دوڑ کے اُسکے پیٹ مین سر ڈال دیا اور پیٹ پھاڑ ڈالا -

(۷) بارہ سنگھا

یہ چھوٹا نازک اور خوبصورت جانور ہے - اور شاید لکھنؤ کے سوا اور کسی جگہ تفنن طبع کے طور پر نہ لڑایا گیا ہوگا - مگر اس کی لڑائی بڑی خوبصورت ہوتی ہے - ہرن شعرا کے معشوق کا ہمشکل ہے - اس لیے اُس کی لڑائی مین بھی معشوقانہ ادائین ظاہر ہوتی ہین - مقابلے کے وقت پہلے بڑی خوبصورتی کے ساتھ دونون حریف پینترے بدلتے رہتے ہین - اور آخر ٹکرین ہونے لگتی ہین - جن مین سینگون سے وہ تلوار کا بھی کام لیتے ہین اور سپر کا بھی - آخر دیر تک کی ٹکرون کے بعد دونون کے سینگ آپس مین اس طرح اُلجھ جاتے ہین کہ معلوم ہوتا ہے قفلی پڑ گئی - اب ایک دوسرے

عہ مولانا حبیب الرحمن خان صاحب شروانی نے بتایا اور ہمین بھی بعد کو تاریخون مین نظر آیا کہ وہند سے اور ہاتھی دہلی مین بھی لڑائے جاتے تھے -

کو ریلتے اور ڈھکیلتے رہتے ہین - اسی ریلا پیلی مین ایک کمزور پڑجاتا ہے - اور اُسپر مغلوبی کی ایسی ہیبت طاری ہوجاتی ہے کہ نازک پانون تھرتھرانے لگتے ہین - اور سارے تن بدن مین رعشہ پڑجاتا ہے - مگر حریف ترس کھانے کے عوض زور مین آکے اور ڈھکیلتا ہے - اور ڈھکیلتا ہوا میدان کے خاتمے یعنی ٹھاٹھر تک پہونچا دیتا ہے - اب مغلوب کو بالکل ناامیدی ہوتی ہے - آنکھون سے موٹے موٹے آنسو اور سینگون سے خون کے قطرے ٹپکنے لگتے ہین اور وہ سینگ چھڑا کے لڑائی سے مُنھ پھیر لیتا ہے - اُس وقت حریف سینگون سے اُسکے جسم کو زخمی کرنا شروع کرتا ہے اور مغلوب بارہ سنگھا زور سے بھاگتا ہے - جس پھرتی سے وہ بھاگتا ہے اُسی تیزی سے غالب حریف اُس کا تعاقب کرتا ہے - یہ دوڑ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے دونون ہوا سے باتین کرنے لگتے ہین اور اُن پر نگاہ نہین ٹھہرتی ہے - مگر بے رحم دشمن مغلوب کا پیچھا نہین چھوڑتا - جہان پاتا ہے زخمی کرتا ہے - آخر زخمون سے چور کرتے کرتے مار ڈالتا ہے - اور مرنے کے بعد اُس کی لاش کو اپنے سینگون سے جھنجھوڑ کے ہٹتا اور اپنی فتح پر نازان ہوتا ہے -

(۸) مینڈھا

یہ نہایت ہی غریب اور بے آزار جانور ہے مگر اُس کی ٹکر بڑی زبردست ہوتی ہے - معلوم ہوتا ہے کہ جیسے دو پہاڑ لڑ گئے - چنانچہ انھین ٹکرون کا تماشا دیکھنے کے لیے لوگ اُنھین لڑاتے ہین - اور آج ہی نہین قدیم الایام سے ان کی لڑائی دیکھی جاتی رہی - ان کے لڑانے کا آغاز ہندوستان مین بلوچی لوگون سے ہوا - اور اُنھین سے دوسرے مقامون مین شوق پیدا ہوا - مگر لڑائی کے لیے اُن کے پالنے اور تیار کرنے کا کام اکثر قسائیون اور ادنیٰ طبقے کے لوگون سے متعلق رہا - امرا و شرفا اُنھین سامنے بلوا کے لڑائی کا تماشا دیکھ لیا کرتے تھے - سنا جاتا ہے کہ نواب آصف الدولہ اور سعادت علی خان کو مینڈھون کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا - غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے سامنے بھی اکثر مینڈھے لڑائے گئے - واجد علی شاہ کو کلکتے کے قیام مین بھی کسی حد تک شوق تھا - نفیس السلطان بہادر اُن کی دلچسپی کے لیے اکثر قسائیون کے زیر اہتمام بہت سی جوڑین

تیار رکھتے تھے۔ اور میں نے کئی بار دیکھا کہ کسی زبردست مینڈھے کی ایسی ٹکر پڑی کہ دوسرے حریف کا سر پھٹ گیا۔ مینڈھا جب ہارتا ہے اور مقابل حریف کی ٹکر کی تاب نہیں لا سکتا تو اُس کی ٹکر خالی دے کے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار بادشاہ کا رمنہ دیکھنے کے لیے مقررہ سالانہ تاریخ کو کلکتے کے صدہا انگریز جمع تھے۔ بادشاہ سلامت اپنی وضع کے خلاف بوچے پر سوار نکل آئے۔ اور اُن مہمانوں کے خوش کرنے کے لیے حکم دیا کہ مینڈھے لاکے لڑائے جائیں۔ چنانچہ اُن کی ٹکروں کا ہنگامہ بلند ہوا۔ اور اُس سے زیادہ شور یورپین لوگوں نے "ہرّے" اور خوشی کے نعرے بلند کر کے مچایا۔ اور عجیب جوش و خروش کا عالم نظر آتا تھا۔ لکھنؤ میں انتزاع سلطنت کے بعد بھی نواب محسن الدولہ بہادر کو مینڈھوں کی لڑائی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اب شرفا اور امرا سے یہ مشغلہ چھوٹ گیا ہے۔ ادنیٰ لوگوں میں معمولی حد تک باقی ہے۔

(۱۹)

درندوں کی لڑائی لکھنؤ میں صرف سلطنت اور امرائے دربار تک محدود تھی۔ اس لیے کہ اُن کی داشت۔ تیاری۔ لڑائی کے وقت اُن کو سنبھالنا۔ اور تماشائیوں کو اُن کی مضرت سے بچانا ایسی چیزیں ہیں جو غربا درکنار بڑے بڑے امیروں کے امکان سے بھی باہر ہیں۔ اور اسی لیے درندوں کی لڑائی سوا د لکھنؤ میں اُسی وقت تک دیکھی گئی جب تک اگلا دربار قائم تھا۔ ادھر وہ دربار برخاست ہوا اور اُدھر وہ وحشت ناک جنگل بھی اُجڑ گئے۔

لیکن طیور کی لڑائی ایسی نہ تھی۔ اس کا شوق ہر امیر و غریب کر سکتا تھا۔ اور ہر شوقین محنت کر کے لڑائی کے قابل مرغ یا بٹیر تیار کر سکتا تھا۔ جو طیور لکھنؤ میں شوق اور دلچسپی کے ساتھ لڑائے گئے حسب ذیل ہیں :- (۱) مرغ۔ (۲) بٹیر۔ (۳) تیتر۔ (۴) لوے۔ (۵) گلدم۔ (۶) لال۔ (۷) کبوتر۔ (۸) توتے۔ ان میں سے ہر ایک کھیل کے جدا جدا بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ لکھنؤ کی کبوتر بازی اور بٹیر بازی عام طور پر مشہور ہے۔ جس پر آج کل کے تعلیم یافتہ اور موجودہ تہذیب کے دلدادہ اکثر تمسخر کیا کرتے ہیں۔ وہ اس سے مطلق واقف نہیں کہ اُن شوقوں اور کھیلوں میں سے

ہر ایک کو اِن لوگون نے کس درجۂ کمال پر پہونچا کے ایک مستقل فن بنا دیا تھا لیکن جب وہ یورپ مین جا کے وہان بھی اسی قسم کے لغو شوق دیکھین گے تو کم سے کم اُنھین اپنے اُن الفاظ پر ندامت ضرور ہو گی جو اپنے وطن کے اِن شوقینون کی نسبت اکثر بے ساختہ کہہ بیٹھتے ہین۔

(۱) مرغ بازی

لڑتے اگرچہ ہر قسم اور ہر قوم کے مرغ ہین مگر لڑائی کے لیے مخصوص اصیل مرغ ہے۔اور سچ یہ ہے کہ دنیا مین اصیل مرغ سے زیادہ بہادر کوئی جانور نہین ہے۔ مرغ کی سی بہادری درحقیقت شیر مین بھی نہین ہے۔ وہ مر جاتا ہے مگر لڑائی سے مُنہ نہین موڑتا۔ اصیل مرغ کی نسبت یہان کے محققین کا خیال ہے کہ اُنکی نسل عرب سے لائی گئی ہے۔اور یہ قرین قیاس بھی معلوم ہوتا ہے۔اس لیے کہ فی زماننا اصیل کی جس قدر زیادہ اور اعلیٰ نسلین حیدرآباد دکن مین موجود ہین کہین نہین ہین۔اور ہندوستان مین وہی ایک شہر ہے جہان اہل عرب سب جگہون سے زیادہ آباد اور مقیم ہین۔ لہٰذا ہند مین مرغون کی نسلین ایران ہوتی ہوئی آئین۔ لکھنؤ کے نامی مرغ بازون مین سے ایک صاحب کا بیان تھا کہ بازی مین اُن کا مرغ اتفاقاً ہار گیا تھا۔دل شکستہ ہو کے وہ ارض عراق مین چلے گئے۔نجف اشرف مین کئی مہینے تک مصروفِ عبادت رہے اور شب و روز دعا کرتے کہ خداوندا اپنے ائمۂ معصومین کا صدقہ مجھے ایسا مرغ دلوا جو لڑائی مین کسی سے نہ ہارے۔ ایک رات کو خواب مین بشارت ہوئی کہ "جنگل مین جاؤ۔" صبح آنکھ کھلتے ہی اُنھون نے کوہ و بیابان کا راستہ لیا۔اور ایک مرغی ساتھ لیتے گئے۔ یکایک ایک درۂ کوہ سے کُکڑون کون کی آواز آئی۔ اُنھون نے فوراً قریب جا کے مرغی چھوڑی جس کی آواز سنتے ہی مرغ نکل آیا۔اور یہ فوراً کسی حکمت سے اُسے پکڑ لائے۔اُس کی نسل ایسی تھی کہ پھر کبھی بازی مین اُنھین شرمندہ نہ ہونا پڑا۔

مرغون کی لڑائی کا شوق یہان نواب شجاع الدولہ کے عہد سے آخر تک برابر رہا۔ نواب آصف الدولہ کو بے انتہا شوق تھا۔ نواب سعادت علی خان باوجود

بیدار مغزی کے مرغ بازی کے دلدادہ تھے۔ اُن کے شوق نے سوسائٹی پر ایسا اثر ڈالا کہ لکھنؤ کے اُمرائے دربار درکنار اُس زمانے مین جو اہل یورپ یہان موجود تھے اُنھین بھی یہی شوق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جنرل مارٹن جن کی کوٹھی لکھنؤ کی ایک قابل دید عمارت اور یورپین بچون کی درس گاہ ہے اول درجے کے مرغ باز تھے۔ اور نواب سعادت علی خان اُن سے بازی بدکے مرغ لڑایا کرتے۔

لکھنؤ مین مرغون کی لڑائی کا یہ طریقہ تھا کہ مرغ کے کانٹے باندھ دیے جاتے۔ تاکہ اُن سے ضرر نہ پہونچا سکے۔ چونچ چاقو سے چھیل کے تیز اور نوکیلی کی جاتی۔ اور جوڑ کے دونون مرغ پالی مین چھوڑ دیے جاتے۔ مرغ باز اُن کے پیچھے پیچھے رہتے۔ مرغ کو دوسرے مرغ کے مقابلے مین چھوڑنا بھی ایک فن تھا جس مین یہ کوشش رہتی کہ ہمارا ہی مرغ پہلے چوٹ کرنے کا موقع پائے۔ اب دونون مرغ چونچون اور لاتون سے لڑنا شروع کرتے۔ مرغباز اپنے اپنے مرغ کو اُبھارتے اور اشتعال دیتے۔ اور چلا چلا کے کہتے "ہان بیٹا شاباش ہے!" "ہان بیٹا کاٹ!" "پھر ہین تیرے مرغ اُنکی للکارون اور بڑھاوون پر اس طرح بڑھ بڑھ کے لاتین اور چونچین مارتے کہ معلوم ہوتا جیسے سمجھتے اور اُنکے کہنے پر عمل کرتے ہین۔ جب لڑتے لڑتے زخمی اور چُور ہو جاتے تو باتفاق فریقین تھوڑی دیر کے لیے اُٹھا لیے جاتے۔ یہ اُٹھا لینا مرغ بازی کی اصطلاح مین "پانی" کہلاتا ہے۔ اُس وقت مرغ باز اُنکے زخمی سرون کو پونچھتے۔ اُن پر پانی کی پھوہارین دیتے۔ زخمون کو اپنے مُنہ سے چوستے۔ اور ایسی ایسی تدبیرین کرتے کہ چند منٹ کے اندر مرغون مین پھر نیا جوش پیدا ہو جاتا اور تازہ دم ہوکے دوبارہ پالی مین چھوڑے جاتے۔ اسی طرح برابر پانی ہوتے رہتے۔ اور لڑائی کا خاتمہ چار پانچ روز بعد اور کبھی آٹھ نو روز بعد ہوتا جب ایک مرغ اندھا ہو جاتا یا ایسی چوٹ کھا جاتا کہ اُٹھنے کے قابل نہ رہے۔ یا اور کسی وجہ سے لڑنے کے قابل نہ رہتا تو سمجھا جاتا کہ وہ ہار گیا۔ یا ہار یہ ہوتا کہ مرغ کی چونچ ٹوٹ جاتی۔ اس صورت مین بھی جہانتک بنتا مرغ باز چونچ باندھ کے لڑاتے۔

حیدرآباد کا کھیل یہان کے خلاف بہت سخت ہے۔ وہان کانٹے نہین باندھے

جاتے بلکہ بعوض باندھنے کے چاقو سے چھیل کے برچھی کی انی بنا دیے جاتے ہین اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑائی کا فیصلہ گھنٹہ ہی ڈیڑھ گھنٹے مین ہو جاتا ہے۔ لکھنؤ مین خارون کے باندھنے کا طریقہ غالبًا اس لیے اختیار کیا گیا تھا کہ لڑائی طول کھینچے۔ اور زیادہ زمانے تک لطف اُٹھایا جا سکے۔

لڑائی کے لیے مرغون کی تیاری مین مرغ بازکے کمالات غذا اور رواشت کے علاوہ اعضا کی مالش۔ پھوئی یعنی پانی کی پھوہار دینے چونچ اور خار بنانے۔ یا خار کے باندھنے اور کوفت کے مٹانے مین نظر آتے ہین۔ اس اندیشے سے کہ زمین پر دانہ چُگنے مین چونچ کو نقصان نہ پہونچ جائے۔ اکثر اُنھین دانہ ہاتھ پر کھلایا جاتا ہے۔

یہ شوق واجدعلی شاہ کے زمانے تک زورون پر تھا۔ مٹیا برج مین نواب علی نقی خان کی کوٹھی مین مرغون کی پالی ہوتی تھی۔ اور کلکتے سے بعض انگریز اپنے مرغ لڑانے کو لایا کرتے تھے۔ بادشاہون کے علاوہ اور بہت سے رئیسون کو بھی مرغ بازی کا شوق تھا۔ مرزا حیدر۔ ہوبیگم صاحبہ کے بھائی نواب سالارجنگ حیدر بیگ خان۔ یحیٰ سو ارس جو نصیرالدین حیدر کے زمانے مین تھے اور خود بادشاہ سے مرغ لڑاتے تھے۔ آغا برہان الدین حیدر۔ بھی مرغ بازی کے شائق تھے۔ آخر الذکر رئیس کے وہان آخر زمانے تک دو اڑھائی سو مرغ رہتے۔ نہایت ہی صفائی اور نفاست سے رکھے جاتے۔ دس بارہ آدمی اُنکی داشت پر مامور تھے۔ میان داراب علی خان کو بڑا شوق تھا۔ نواب گھسیٹا نے بھی اس شوق کو آخر تک نباہا۔ ملیح آباد کے معزز پٹھانون کو بھی بہت شوق تھا۔ اور اُنکے پاس اصیل مرغون کی بہت اچھی نسلین محفوظ تھین۔ یہان مشہور مرغ باز جو اپنے فن مین اُستاد یگانہ مانے جاتے۔ بہت سے تھے۔ میر امداد علی۔ شیخ گھسیٹا۔ منور علی جن کو یہ کمال حاصل تھا کہ مرغ کی آواز سُن کے بتا دیتے کہ یہ بازی لے جائے گا۔ صفدر علی۔ اور ایک اول درجے کے وثیقے دار سید میر حسن بھی مشہور تھے۔ اس آخری زمانے مین مندرجہ ذیل لوگون کا نام مشہور ہوا۔ فضل علی جمعدار۔ قادر۔ جیون خان۔ حسین علی۔ نوروز علی۔ نواب محمد تقی خان جو یہان

کے ایک عالی مرتبہ رئیس تھے - میاں جان - ول - چھنگا - حسین علی بیگ - آجکل
ان میں سے اب کوئی زندہ موجود نہیں ہے -

یہی لوگ ہیں جنھوں نے مرغ بازی کو یہاں انتہائی کمال کے درجے پر پہونچا کے دکھا دیا - مگر میرا خیال ہے کہ فی الحال مرغ بازی کا شوق حیدرآباد دکن میں بڑھا ہوا ہے - وہاں کے بہت سے امیروں جاگیرداروں اور منصب داروں کو شوق ہے اور اُن کے پاس مرغوں کی نسلیں بھی بے مثل ہیں - جن کی وہ بہت حفاظت کرتے ہیں -

(۲) بٹیر بازی

بٹیر بازی کا شوق لکھنؤ میں پنجاب سے آیا - پنجاب کے بعض کنچن لوگ جن کی عورتیں عصمت فروشی کا پیشہ کرتی ہیں نواب سعادت علی خاں کے عہد میں وارد لکھنؤ ہوئے - اور گھاگس بٹیر اپنے ساتھ لائے - جنکو وہ لڑاتے تھے - آجکل کی بعض نامور رنڈیاں اُنھیں لوگوں کی نسل سے ہیں - بٹیروں کی دو قسمیں ہوتی ہیں - ایک گھاگس اور دوسری چِننگ - پنجاب میں صرف گھاگس بٹیر ہوتا ہے - وہ چننگ سے بڑا زبردست اور طاقتور ہوتا ہے - لکھنؤ میں گھاگس اور چننگ دونوں ہوتے ہیں - چننگ گھاگس سے قد میں چھوٹا اور نازک ہوتا ہے مگر لڑنے میں زیادہ مضبوط اور بہت جیالا ہوا کرتا ہے - اور اُس کی لڑائی زیادہ شاندار اور خوبصورت ہوتی ہے - بہرحال اس بات کا پتہ لکھنؤ ہی میں لگا کہ لڑانے کے لیے چننگ بٹیر زیادہ موزوں ہے -

بٹیر کی لڑائی کے لیے نہ کسی بڑے میدان کی ضرورت تھی نہ گھر سے باہر نکل کے صحن تک بھی آنے کی - بلکہ کمرے کے اندر ہی صاف ستھرے فرش پر تہذیب کے ساتھ بیٹھ کے اسکی لڑائی کی سیر دیکھی جا سکتی ہے - اس لیے لکھنؤ کی سوسائٹی نے اسی کو بہت پسند کیا - نہایت نفیس - خوبصورت - اور سبک کابکیں بٹیروں کے لیے ایجاد کی گئیں جو ہاتھی دانت کی ننھی ننھی گمزیوں سے آراستہ کی جاتیں اور اُن میں بٹیر رکھے جاتے -

اس کا کھیل یوں ہے کہ پہلے مُوٹھ یعنی پانی میں بھگو بھگو کے گھنٹوں ہاتھوں

ہیں دبائے رہنے سے اُس کی وحشت دُور ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بولنے اور چونچیں مارنے لگتا ہے۔ اس کے بعد بھوک دے کے اور دست آور اجزا جن میں مصری بہت مخصوص ہے دے دے کے اُس کا جسم درست کیا جاتا ہے۔ پھر رات گئے یا آدھی رات کو اُن کے کان میں چلا کے "کو" کہا جاتا ہے۔ جسے کوکنا کہتے ہیں غرض ان تدبیروں سے چربی چھنٹ جاتی ہے۔ بھدّاپن دُور ہو جاتا ہے۔ اور جسم نہایت ہی پھرتیلا اور قوی ہو جاتا ہے۔ یہی بٹیر کی تیاری ہے۔ اور ان باتوں میں جس قدر زیادہ پورا ہے اُسی قدر سمجھیے کہ لڑائی کے لیے زیادہ موزون ہے۔

لڑائی کے وقت فرش پر چاروں طرف ہلکا ہلکا دانہ چھڑکا دیا جاتا ہے اور بٹیر کابک سے نکالے جاتے ہیں۔ پہلے دونوں بٹیروں کی چونچیں چاقو سے بنا کے خوب تیز کر دی جاتی ہیں۔ اسکے بعد ایک دوسرے کے مقابل چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ بٹیر کی لڑائی مرغ سے ملتی ہوئی ہے۔ چونچ سے کاٹتا اور پنجوں سے لات مارتا ہے۔ چونچ سے حریف کے مُنہ کو زخمی اور لُہو لُہان کر دیتا ہے۔ اور پنجوں سے بعض وقت حریف کا پوٹا تک پھاڑ دیتا ہے۔ لڑائی پندرہ بیس منٹ یا کبھی اس سے زیادہ دیر تک رہتی ہے۔ اور آخر مغلوب حریف بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ اور بھاگنے کے بعد پھر وہ کسی بٹیر کے سامنے لڑائی میں نہیں ٹھہرتا۔

بٹیر کی ترقی کے تین درجے ہیں اور اُس کی ناموری کے تین دَور سمجھے جاتے ہیں۔ اول نیا جو پکڑ کے اور پہلے پہل مانوس کر کے لڑایا جاتا ہے۔ اگر وہ بہت سی لڑائیوں میں جیتا اور نہ بھاگا تو لڑائی کی فصل ختم ہوتے ہی معمولی پنجروں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہوتا ہے جب وہ پُرانے پر جھاڑ کے نئے نکال لاتا ہے۔ اسے کریز بٹھانا کہتے ہیں۔ یہ زمانہ ختم ہوتے ہی دوسرے سال اُس کی ترقی کا دوسرا درجہ اور دَور ہوتا ہے۔ اور اُسے نوکار کہتے ہیں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ کریز بیٹھ کے جب تیسرے سال وہ لڑائی کے لیے تیار کیا جاتا ہے تو کُریز کہلاتا ہے۔ اور یہ اُسکی ترقی کا تیسرا دور، اعلیٰ درجہ ہے۔

عموماً تسلیم کر لیا گیا ہے کہ لڑائی میں نوکار نئے سے اور کُریز نوکار سے زبردست ہوتا ہے۔ نیا بٹیر کُریز سے دو چونچیں بھی مشکل سے لڑ سکتا ہے۔ اعلیٰ درجے کے بٹیر بازنہ

اور شوقین رئیس صرف گرُیزون کو لڑاتے ہین - اور نئے بٹیرون کا لڑانا بالکل معمولی کھیل ہے - لڑائی مین طرح طرح کے فریب و فن بھی کیے جاتے ہین - بعض لوگ اپنے بٹیر کے مُنہ پر کبھی کوئی ایسی کڑوی اور زہرلی چیز یا عطر لگا دیتے ہین کہ دوسرا بٹیر دو ایک چونچین مارتے ہی پیچھے ہٹنے اور لڑائی سے مُنہ موڑنے لگتا ہے - اور اگر اسپر بھی لڑتا رہا تو لڑائی کے بعد مر جاتا ہے - بعض لوگ کیف کا کھیل کھیلتے ہین - یعنی لڑائی سے ایک ساعت پہلے اپنے بٹیر کو کوئی ایسی تیز نشے والی چیز کھلا دیتے ہین کہ وہ لڑائی مین بیحس ہو کے بھاگنا بھول جاتا ہے - اور جب تک حریف کو پالی سے نہ بھگا دے مجنونون کی طرح لڑتا رہتا ہے -

لکھنؤ مین بٹیر بازی کے شوق نے ایسے ایسے باکمال بٹیر باز پیدا کر دیے جن کا کہین نظیر نہین مل سکتا - بعض لوگون نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کسی کے اچھے نامی بٹیر کو ایک نظر دیکھا اور کسی معمولی بٹیر کی ویسی ہی صورت بنا دی - اور کسی موقع پر باتون باتون مین بدل لیا - خیر یہ تو ایک بیہودہ چوری تھی مگر بعض اُستادون نے یہ کمال حاصل کیا کہ بھگنے بٹیرون کو تیار کر کے اچھے اچھے گرُیزون سے لڑا دیتے اور بازی لے جاتے - کیف کے کھیل والے اُستادون مین ایک صاحب کیف کی نہایت اعلیٰ درجے کی گولیان تیار کرتے جو سو روپئے کی دس گولیان بکتین - اور لوگ شوق سے لے جاتے -

ان لوگون کی سب سے بڑی اُستادی بٹیرون کے علاج مین نظر آتی ہے - اور ایسے ایسے بیمار اور از کار رفتہ بٹیرون کو درست کر لیتے ہین وہ اس خوبی سے اُن کے مرض کی تشخیص کرتے اور مناسب اجزا استعمال کراتے ہین کہ اطبا اور ڈاکٹر حیرت مین رہ جائین - اس کی بہت کوشش کی گئی کہ بٹیرون کو پال کے انڈے سے بچے دلوائے جائین مگر اس مین کامیابی نہ ہوئی -

بٹیرون کے نام بھی بڑے بڑے شاندار رکھے گئے - جیسے رستم - سہراب - شہرۂ آفاق - پالیون مین بڑی سے بڑی بازیان بدی جاتی ہین - اور ایک ہزار روپیہ تک کی بازی مین نے خود دیکھی ہے - اس کا شوق بھی بعض بادشاہون کو رہا نصیر الدین حیدر اپنے سامنے میز پر بٹیرون کی لڑائی دیکھ کے خوش ہوتے تھے -

پرانے بٹیربازون مین میر بچو ۔ میر عمدو ۔ خواجہ حسن ۔ میر فدا علی ۔ چھنگا ۔ میر عابد اور سید میرن کے نام یادگار رہین ۔ آج سے چالیس سال پہلے مٹیا برج مین بٹیرون کے داروغہ غلام عباس ۔ چھوٹے خان ۔ اور غلام محمد خان خالص پوری کو جو بڑے معمر اور سن رسیدہ لوگ تھے اس فن مین نہایت باکمال پایا تھا ۔ غالب علی بیگ ۔ مرزا اسد علی بیگ ۔ نواب مرزا ۔ میا جان ۔ شیخ مومن علی ۔ اور غازی الدین خان نے بھی آخر عہد مین بہت ناموری حاصل کی تھی ۔

بٹیرون کا شکار بھی لکھنؤ والون کے لیے بڑی دلچسپی کی چیز ہے ۔ پہلے اس مین صرف شوقینی تھی جس کی بدولت بہت سے ایسے آدمی جنھون نے کبھی شہر سے باہر کی سواد نہین دیکھی تھی کھیتون اور جنگلون کی ہوا کھا آتے تھے ۔ مگر اب اسی پہ بہتون کی روٹیان چلتی ہین ۔

کہتے ہین کہ بٹیر پہاڑون سے رات کو نکلتے اور اوپر کی فضا مین اڑتے ہوے جاتے ہین ۔ شکار کے شوقین بڑی آواز سے بولنے والے بٹیرون کو تیار کرتے ہین ۔ جو برابر رات بھر بولتے رہتے ہین ۔ ایسے بٹیرون کو پھندیت کہتے ہین ۔ کسی ارہر کے کھیت کے اطراف مین اکثر جال پھیلا دیا جاتا ہے ۔ پھندیتون کی آواز سن کے بٹیر اوپر سے اترنا اور گرنا شروع ہوتے ہین ۔ اور رات بھر مین بہت سے جمع ہو جاتے ہین ۔ صبح ہوتے ہی وہ سب طرف سے ہنکا کے جال کی طرف بھگا لے جاتے ہین ۔ جس مین پھنستے ہی پکڑ پکڑ کے پٹکیون مین بند کر لیے جاتے ہین ۔

(۳) تیترون کی لڑائی ۔

یہ بھی دلچسپ ہے ۔ تیتر اور طیور کی بہ نسبت اچک اچک کے لڑتا ہے ۔ مگر اس کا شوق سوا دیہاتی لوگون اور اوسط درجے والون کے امرا و شرفا کو کبھی نہین رہا ۔ تیتر لوٹ سے اور دوڑا دوڑا کے تیار کیے جاتے ہین ۔ ان مین جوش اور غصہ پیدا کرنے کے لیے ان کو دیپک کھلائی جاتی ہے ۔ مگر یہ کوئی بڑا کھیل نہین ہے ۔ اور نہ مہذب سوسائٹی مین اختیار کیا گیا ۔ ہان لکھنؤ کے ادنی طبقے والون مین کثرت سے رہا ۔ اور ہے ۔

(۴) لودون کی لڑائی

لوا چھوٹے قسم کا تیتر ہے جو بٹیر سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ وہ بجائے دانے کے سدایعنی مادہ پر لڑا کرتا ہے۔ اُسے لڑانا ہوتا ہے تو مادہ کا پنجرا لاکے سامنے رکھدیا جاتا ہے۔ اس کا شوق ریاست ریوان وغیرہ مین لوگون کو زیادہ تھا لکھنؤ مین بھی پسند کیا گیا اور ایک حد تک اختیار کیا گیا۔ لوے کی لڑائی سچ یہ ہو کہ بٹیر سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے۔ وہ گندے کھول کے لڑتا اور گتھ جاتا ہی اور پھول کی طرح کھل کھل کے اُٹھتا اور گرتا ہے۔ لکھنؤ کے بعض امرا کو اس کا شوق ہوگیا تھا۔ ٹیابرج مین واجدعلی شاہ مرحوم کی سرکار مین ایک بڑے اُستاد لوے لڑانے والے تھے۔ جنھون نے بہت اچھی اچھی جوڑین تیار کی تھین۔ اور جب اُنھین سامنے لاکے لڑاتے تو بڑا لطف آتا۔ لوؤن کی تیاری بھی زیادہ تر لوٹ اور بھوک سے ہوتی ہے۔ اور اس کی لڑائی کا رواج بٹیر کے پیشتر سے تھا۔ مگر آخر مین بٹیربازی کا اس قدر رواج ہوا کہ لوے کا شوق پھیکا پڑ گیا۔ اس کا شکار بھی عجیب طریقے سے ہوتا ہے۔ یہ بھی بٹیر کی طرح اوپر کی فضا مین اُڑتا ہوا جاتا ہی۔ لوگ بہیر کے پھندیتون کی سی چھپر پر ایک گھڑا باندھ دیتے ہین۔ اس کے مونھ پر جھلی منڈھ کے ایک سینک مین ڈورا باندھ کے اُس سینک کو جھلی مین چبھو کے اندر لٹکا دیتے ہین۔ اور اُس ڈورے کو ہاتھ سے سُوتنا شروع کرتے ہین۔ جھلی سے ایک بے ہنگم بھون بھون کی آواز نکلنا شروع ہوتی ہے جو لوؤن کو اس قدر پسند ہے کہ اُڑتے اُڑتے نیچے اُتر پڑتے ہین۔ اور صبح کو جال مین پھنس کے بٹیرون ہی کی طرح پکڑ لیے جاتے ہین۔

(۵) گُلدم لڑانا

گُلدم کو عوام بُلبل کہتے ہین مگر یہ غلطی ہے۔ بُلبل بدخشان و عجم کی ایک نغمہ سنج چڑیا ہے۔ اور اس چڑیا کی دُم کے نیچے ایک سرخ گُل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا نام گلدم رکھا گیا ہے۔ اسکی لڑائی بھی دیہاتیون اور بازاری لوگون مین زیادہ ہے۔ شائستہ سوسائٹی نے اُسے کبھی دلچسپی کی نظر سے نہین دیکھا۔ مگر اُسکی لڑائی لطف سے خالی نہین ہوتی۔ دانے پر لڑتے ہین۔ اور لڑائی مین دونون حریف کرتے ہوے اُوپر اُڑتے اور گتھ کے گرتے ہین۔

(۶) لال لڑانا

لال صرف پنجروں میں رکھ کے پالنے کے لیے ہیں لڑائی کے لیے موزوں نہیں۔ مگر نفس پرست انسان نے اُنھیں بھی لڑا کے دو گھڑی دل بہلا لیا۔ لالوں کا پہلے تو اس حد تک مانوس بنانا مشکل ہوتا ہے کہ پنجڑے کے باہر نکال کے چھوڑ دے جائیں اور اُڑ نہ جائیں۔ دوسرے اُنھیں اس قدر مست بھی ہونا چاہیے کہ دوسرے لال سے لڑنے کو تیار ہو جائیں۔ چنانچہ اُن کا لڑ جانا ہی دشوار ہوتا ہے۔ مگر جب لڑ گئے تو خوب گتھم گتھا کے اور اُڑ اُڑ کے لڑتے ہیں اور بڑی دیر تک لڑتے رہتے ہیں۔ لالوں کی لڑائی دوسرے چھوٹے طیور کی لڑائی کی بہ نسبت دیر تک رہتی ہے۔ لالوں کی لڑائی کا شوق اہل لکھنؤ میں بہت کم رہا۔ صرف دو ہی ایک اُستاد پیدا ہوے جنھوں نے لڑایا ورنہ عام رجحان اسکے خلاف تھا۔ اور اُس کے شوقین بھی عوام اور بازاری ہی تھے۔

(۷) کبوتر بازی

کبوتر اُن مانوس جانوروں میں ہیں جن کا شوق لوگوں کو قدیم زمانے سے لے کے آج تک ہر ملک اور ہر سرزمین میں کسی نہ کسی حد تک ضرور رہا۔ کبوتروں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں اُڑنے والے گرہ باز اور گولے ہوتے ہیں۔ اور جو محض خوبصورتی اور خوش رنگی کے لحاظ سے پالے جاتے ہیں۔ اُن میں شیرازی گلے۔ نساوری۔ گلوٹے۔ لقے۔ لوٹن۔ اور چوپا چندن وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ یا ہو کبوتر رات دن گو بجنے اور "یا ہو" کا دم بھرنے کی وجہ سے عبادت گذاروں کو زیادہ پسند تھے۔ اور اکثر فقرا و مشائخ کو اُن کا شوق تھا۔

سنتے ہیں کہ گرہ باز پہلے پہل کابل سے لائے گئے۔ پہلے عموماً وہی اُڑائے جاتے تھے گولے بعد کو آئے جن کی نسل عرب و عجم اور ترکستان سے آئی۔ گرہ باز کی یہ شان ہے کہ صبح کو اُڑے تو گھنٹوں مکان کے عین محاذی آسمان پر چکر لگاتے رہے۔ اس طرح کہ صحن کے اندر لگن میں پانی بھر کے رکھ دیجیے تو اُس میں ہمیشہ نظر آتے رہیں گے۔ بعض دن دن بھر اُڑتے رہتے ہیں۔ اور شام کو اُترتے ہیں۔ اپنے مکان کے پہچاننے اور وطن پرستی کے دلدادہ ہونے میں

گرہ باز اتنا کمال ۔ کہتے ہیں کہ خود میرے یہاں کا ایک کبوتر کسی کے وہاں پھنس گیا تھا جس نے پر کاٹ دیے ۔ تین سال کے بعد جب اُسے موقع ملا اور پر نکل آئے تو واپس آیا۔ اور اپنے خانے میں گھس کے اُس کبوتر سے لڑنے لگا جو اب اُس میں مقیم تھا۔

لیکن گرہ باز کی دس بارہ سے زیادہ کی ٹکڑی نہیں اُڑتی ۔ لوگوں کو سو سو دو دو سو کبوتروں کی ٹکڑیاں اُڑانے کا شوق ہوا تو گولے اختیار کیے گئے۔ کبوتر بازی کا فن دہلی ہی میں اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ کہتے ہیں آخری وارث دولت مغلیہ بہادر شاہ کی سواری نکلتی تو دو سو کبوتروں کی ٹکڑی اوپر ہوا میں سواری کے ساتھ اُڑتی ہوئی جاتی اور جہاں پناہ پر سایہ کیے رہتی ۔

کبوتر کو اپنے گھر سے بہت زیادہ اُنس ہوتا ہے ۔ کابک کو ٹھیل پر رکھ کے لیجاتے اور جہاں کہا جائے روک کے اُڑانے اور پھر کابک پر بُلا لینے کا کمال بھی دہلی ہی میں پہلے نظر آ چکا تھا ۔

لکھنؤ میں کبوتر بازی اس خاندان فرماں روائی کے ابتدائی دور ہی سے شروع ہو گئی تھی ۔ چنانچہ نواب شجاع الدولہ کو کبوتروں کا بڑا شوق تھا ۔ سید یار علی نام ایک شخص نے جو بریلی کا رہنے والا تھا اپنے آپ کو ایک کامل کبوتر باز کی حیثیت سے دربار میں پیش کیا اور اُنکی بڑی قدر کی گئی ۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خاں کو بھی شوق تھا ۔ اور غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے زمانے میں تو کبوتر بازی یہاں بہت اعلیٰ درجے پر پہونچ گئی تھی ۔ میر عباس نام یہاں کے ایک کامل فن کبوتر باز نے یہ کمال دکھایا کہ جو کوئی پانچ روپئے نذر کرکے اُن کی دعوت کرنا چاہے وہ کہیں رہتا ہو کابک لے کے پہونچ جاتے اور اُسی کے گھر سے کبوتر اُڑا دیتے ۔ اُڑاتے اور سیٹی پر بُلا لیتے ۔ مجال کیا کہ کوئی کبوتر کسی اور جگہ گر جائے۔ شوق اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ بعض امیروں کے ہاں صرف نو سو کبوتریاں ایک ساتھ اُڑتیں ۔ اور بعض رئیس اتنے ہی یا اس سے زیادہ تعداد میں نر کبوتر اُڑاتے ۔

خوست (علاقہ سرحدی افغانستان) سے چپت نام ایک خاص رنگ کے کبوتر آئے تھے ۔ جو نہایت قیمتی تھے ۔ اکثر رئیس ہزاروں روپیہ صرف کرکے اُنھیں کو اُڑاتے ۔

ایک جدت پسند بزرگ نے لکھنؤ مین یہ کمال کیا کہ کبوتر کے دو بچون کو لے کے ایک کا داہنا اور ایک کا بایان بازو کاٹ دیا۔ اور کٹے ہوے بازوون کی جگہ اُن دونون مین ٹانکے لگا کے ایک دوہریا کبوتر بنا لیا۔ اور ایسی داشت سے پالا کہ وہ بڑے ہوے اور اُڑنے لگے۔ ایسے بہت سے دوہریا کبوتر تیار کیے۔ اکثر معمول تھا کہ جب نصیر الدین حیدر چھتر منزل سے بجرے پر سوار ہو کے پار جاتے اور کوٹھی دلآرام مین بیٹھ کے دریا کی سیر دیکھتے وہ اس پار سے اپنے اُن عجیب الخلقت دوہریا کبوترون کو اُڑا دیتے جو پار جا کے بادشاہ کے قریب بیٹھ جاتے۔ بادشاہ اُنھین دیکھ کے بہت محظوظ ہوتے۔ اور انعام دیتے۔

میر امان علی نام ایک بزرگ نے یہ کمال پیدا کیا تھا کہ کبوتر کو رنگ کے جیسا چاہتے بنا دیتے۔ اکثر جگہ پر اُکھاڑ کے دوسرے رنگ کا پر اُسی کے سوراخ مین رکھ کے اس طرح جما دیتے کہ وہ اصلی پرون کی طرح جم جاتا۔ اور بہت سے مقامات پر رنگ سے کام لیتے۔ مگر ایسا مضبوط اور پختہ رنگ کہ مجال کیا جو ذرا پھیکا بھی پڑ جائے۔ برس بھر تک رنگ قائم رہتا۔ مگر جب گر کے زمین پر گر جاتے تو پھر اصلی رنگ نکل آتا۔ اُن کے ان کبوترون مین سے ہر ایک پندرہ بیس روپیے کو بکتا۔ اور امرا بڑے شوق سے لیتے۔ وہ پھانتیہ بھی بنا لیا کرتے جو لاکھون مین ایک نکلتا ہے۔ اور رنگ کے حدود اور گلون کے اعتبار سے بے مثل ہوتا ہے۔

ایک بڑے کبوتر باز نواب پالئے تھے جو گرہ باز کبوترون کو گولون کی طرح اُڑاتے۔ کمال یہ تھا کہ جس جگہ اور جس مکان پر چاہتے چھیپی کے اشارے سے بازی کرا دیتے یعنی کبوتر ہوا مین قلابازیان کھانے لگتے۔

واجد علی شاہ نے مٹیا برج مین بہت سے نئے کبوتر جمع کیے تھے۔ کہتے ہین کہ ریشم پرے کبوترون کا جوڑا پچیس ہزار کو لیا تھا۔ اور ایک قسم کے سبز کبوترون کی نسل بڑھائی تھی۔ جب انتقال ہوا ہے تو چوبیس ہزار سے زیادہ کبوتر تھے۔ جن پر سیکڑون کبوتر باز نوکر تھے۔ اور اُن کے داروغہ غلام عباس کبوتر بازی کے فن مین جواب نہ رکھتے تھے۔

شوقین اور فن دانی نے پالنے کے رنگین کبوترون مین بھی بے مثل ترقی کی تھی۔

یہ صرف مشہور نہیں ہے بلکہ ایسا شیرازی جو گز بھر کے پنجرے کی وسعت کو بھر لے۔ اور ایسا گلی جو ایک بارہ برس کی لڑکی کی چوڑی میں سے نکل جائے میں نے خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہیں۔ (یہ ذکر ابھی ختم نہیں ہوا۔ باقی آئندہ نمبر میں عرض کروں گا)

(۳۰)

طیور کو لڑا لڑا کے دلچسپی پیدا کرنا اور تفنن کے کمالات دکھانا لکھنؤ کے بیفکروں کا نہایت ہی عام مشغلہ ہو گیا تھا۔ کبوتروں اور بٹیروں کے تیار کرنے اور لڑانے میں اُنھوں نے اس قدر ترقی کی کہ اب ہندوستان کے جس شہر میں اور جہاں کہیں کسی رئیس کو ان چیزوں کا شوق ہے (اور یہ کمبخت شوق نا عاقبت اندیش دولتمندوں میں اکثر ہوا کرتا ہے) وہاں اُستاد لکھنؤ ہی سے بلائے جاتے ہیں اور اس مد کا سارا کارخانہ اُنھیں کے زیر اہتمام ہوتا ہے۔

توتے

طیور لڑانے کے حد سے گزرے ہوئے شوق نے اُس میں جدتیں پیدا کرنا شروع کیں۔ اور بعض شوقینوں کا خیال اس جانب مبذول ہوا کہ جو کام کبوتروں سے لیا جاتا ہے وہ اور کن کن طیور سے لیا جا سکتا ہے؟ چنانچہ میر محمد علی نام ایک بزرگ نے توتوں سے کبوتروں کا کام لینے میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔

توتا فطرۃً نہایت ہی بیوفا جانور ہے۔ زندگی بھر رکھیے اور پالیے لیکن پنجرے سے اُڑا تو پھر اُدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ توتا چشمی نام ہی بے وفائی کا ہو گیا ہے۔ وہ بولتا ہے۔ باتیں کرتا ہے۔ جانوروں کی بولیاں اُڑا لیتا ہے۔ جو فقرے یاد کرا دیجیے اُن کی رٹ لگاتا ہے۔ مگر اُڑانے کے کام کا نہیں۔ اس لیے کہ پنجرے سے چھوٹتے ہی پھر وہ کسی کے بس کا نہیں ہوتا۔ مگر میر صاحب موصوف نے نہ جانے کس تدبیر سے اُس کی فطرت بدل دی تھی کہ دس بار توتوں کی ٹکڑی اُڑاتے۔ اور مجال کیا کہ وہ سیٹی بجا کے "آ" کریں اور وہ آسمان سے اُتر کے سیدھے پنجرے میں نہ چلے آئیں۔ وہ ان توتوں کو روز حسین آباد میں لا کے اُڑاتے۔

طیور کی [illegible] تیار ہونے کا حال بیان کرکے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اہل لکھنؤ نے جتنی محنت طیور کی تیاری میں کی ہے کاش خود اپنی اور اپنے جسم کی تیاری میں کرتے

تو یہ انجام ہرگز نہ ہوتا جو ہوا۔

پتنگ بازی

کنکوے اُڑانے کا شوق کسی نہ کسی حد تک سارے ہندوستان میں ہے۔ اور آج کل عموماً لڑکوں اور نوجوانوں کا نہایت ہی دلچسپ کھیل ہے۔ اسکی کثرت اور تعمیم دیکھ کے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ ہندوستان کی بہت پُرانی چیز ہو گی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ یہ فن ایک صدی پیشتر کا بھی مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ اور اس کا مرکز ترقی لکھنؤ ہی ہے۔

یورپ میں لڑکے ایک قسم کے کپڑے کے کنکوے اُڑایا کرتے ہیں۔ جن کو جب تک ڈور پکڑ کے بھاگتے رہو اُڑتے ہیں۔ اور ادھر قدم رُکا اور اُدھر وہ زمین پر آ رہے۔ اُن کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کب سے ہیں؟ اور کہاں سے لیے گئے؟

سُنا جاتا ہے کہ دہلی میں شاہ عالم بادشاہ اول کے عہد میں یہ شوق شروع ہوا ابتداءً بعض خاص خاص لوگ چنگ اُڑایا کرتے تھے۔ چنگ بڑے اہتمام سے بنایا جاتا تھا۔ اس میں دو تکلیں تھوڑے فصل سے آگے پیچھے برابر کھڑی کر کے جوڑ دی جاتیں۔ تکلوں کی شکل یہ ہوتی تھی جس میں تین طرف مدّور کونے نکلتے۔ اُس میں ایک کھپاچ چھیل کے بیچ میں کھڑی لگائی جاتی جو ٹھڈّا کہلاتی اور دو کھپاچیں خوب چھیل کے اور نرم کر کے اوپر نیچے لگائی جاتیں جو کانپیں کہلاتیں۔ اوپر کی کانپ کی وضع یوں رہتی اور نیچے کی کانپ کی یوں ان کے درمیان میں ہلکا باریک کاغذ منڈھ دیا جاتا۔ یہ ایک تکّل ہوئی۔ ایسی دو تکلوں کو آگے پیچھے رکھ کے اور درمیان میں جا بجا آڑی کھپچیاں لگا کے جوڑ دیا جاتا۔ اور چاروں طرف سے بھی کاغذ منڈھ کے ایک خاص وضع کی تکتی قندیل بنا دی جاتی۔ جس کے اندر ایک کپڑے کا بنا ہوا تیل میں ڈوبا گیند تاروں میں باندھ کے لٹکا دیا جاتا۔ اور اُسے روشن کر کے رات کو لوگ مضبوط سوتی یا ریشمی ڈور پہ اُڑاتے۔ چنگ کی شان یہ تھی کہ معلوم ہوتا ایک لالٹین آسمان پہ اُڑ رہی ہے اور غبارے کے خلاف اُڑانے والے کے اختیار میں ہے۔ جب چاہیں اُڑائیں

اور جب چاہیں اُتار لیں۔ وہ ہوا مین قائم رہتا۔ کبھی اوندھا ہوتا تو پھر سیدھا
ہو جاتا۔

اُسی زمانے مین بعض لوگ اسی وضع سے انسان کا ایک پُتلا بنا کے اُڑاتے
بلکہ بعض قابل وثوق یادگاران سلف کا بیان ہے کہ سب کے پہلے وہ پُتلا ہی
دہلی مین ایجاد ہوا تھا۔ پھر اُسی سے ترقی کر کے چنگ ایجاد ہوا۔ جس کا طول و
عرض برابر ہونے کی وجہ سے اُڑانا اور ہوا مین ٹھہرانا زیادہ آسان تھا۔ اس
کا شوق زیادہ تر ہندوون مین تھا۔ اور کیا عجب کہ اُنکے وہان کی قومی و مذہبی
چیز ہوا وا کاس دیا وغیرہ کے خیال سے ماخوذ ہو۔ پھر اُس چنگ کے کاٹنے کے
لیے یا دن کو اُڑانے کے خیال سے تکل اُڑنے لگی۔ جو دراصل آدھا چنگ یا چنگ
کی فقط ایک طرف کی دیوار تھی۔ تکل مین خوبی یہ تھی کہ بہ نسبت چنگ کے آسانی
سے اُڑ سکتی تھی۔ اُس مین چلت پھرت تھی۔ آسمان پر ہوا مین ناچتی اور دُور ہوتی
چلی جاتی تھی۔ چنگ ایک جگہ قائم رہتا۔ اور تکل ادھر اُدھر چلتی پھرتی تھی۔ اور
اُس پر اتنا قابو تھا کہ جب چاہیں اُس کی ڈور سے رگڑا دیکے دوسرے کے چنگ کو
کاٹ دین۔

تکل نے دراصل قندیل یا روشن پُتلا اُڑانے کا خیال بُھلا دیا۔ اور لوگون کو
اس جانب متوجہ کیا کہ ہوا مین کوئی ایسی چیز اُڑائی جائے جو زیادہ قابو مین ہو۔
ادھر اُدھر آسمان پر دوڑے اور ناچے۔ تکل کا شوق مسلمان امیرون اور
معزز ہندوون مین بڑھا۔ اُس پر دولت صرف ہونے لگی۔ اعلیٰ درجے کی تکل
کا نام تینگ مشہور ہوا۔ جس کا ٹھڈا مرشد آبادی بانس کا ہوتا۔ جس مین اسّی
روپے لاگت آتی۔ بیس روپئے کی جھُل جھُل ہوتی۔ دو روپئے کا کاغذ لگتا۔ اور
پانچ روپئے بنوائی پڑتی۔ غرض ایک سو سات روپئے مین ایک تینگ تیار ہوتا۔

بہر حال دہلی مین تکل اور تینگ ہی تک ترقی ہوئی تھی کہ قدردان دربار دہلی
سے لکھنؤ مین منتقل ہوا۔ اور اُس کے ساتھ ہی زمانے کے شوقین بھی یہان چلے
آئے۔ اب تینگ اُڑانے سے پتنگ لڑانے کا شوق نکلا۔ ایسی زوردار تکلین
بنائی جانے لگین جن کو معمولی قوت کا آدمی مشکل سے سنبھال سکتا۔ آٹھ آٹھ دل کی

مضبوط ڈور چرخیون پر چڑھائی جاتی - اور اُنھین چرخیون کے ذریعے سے تکلون کا زور سنبھالا جاتا - لڑائی کی یہ شان تھی کہ دو تکلون کی ڈور ایک دوسری مین ڈال کے دونون طرف سے ڈھیل دی جاتی - دونون تکلین چکر گھنی کھاتی ہوئی اوپر چڑھتی اور بلند ہوتی چلی جاتین - اور دونون طرف سے چرخیون پر چرخیان خالی ہوتی رہتین - لکھنؤ کے شوق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ نواب آصف الدولہ کی تکل مین پانچ روپے کی مقیش کی جھلجھل ہوتی - جو لوٹ کے لاتا اُسے پانچ روپے دے کے تکل لے لی جاتی - اور نہ لاتا تو بھی جہان چاہتا جھلجھل پانچ روپے کو بیچ لیتا -

پتنگ بازی کے پُرانے نامی اُستاد لکھنؤ مین میر عمدو - خواجہ مٹھن - شیخ امداد تھے - ایک جولاہے نے بھی اُن دنون اِس فن مین کمال حاصل کیا تھا جسکی وجہ سے امرا کی صحبتون مین اُس کی بڑی قدر ہوتی -

امجد علی شاہ کے زمانے مین یک بیک گڈی ایجاد ہوئی جس کی قطع لوزات کی سی ہوتی - وہ تکل کی بہ نسبت آسانی سے بنتی - تکل مین دو کانپین اور ایک ٹھڈا ہوتا تھا - گڈی مین صرف ایک ہی کانپ اور ایک ہی ٹھڈا رہ گیا - واجد علی شاہ کے زمانے مین ڈیڑھ کنّا کنکوا بن گیا - جس کی قطع موجودہ کنکوے کی تھی مگر نیچے تکل کی یادگار رہین کا غذ کا چھوٹا سا پھُندنا ہوتا - اب نواب محمد حسین خان سالار جنگی - آغا ابو تراب خان اور دو ایک شوقین رئیسون نے پھُندنے کی جگہ نیچے پتہ لگا کے وہ کنکوا ایجاد کیا جو فی الحال مروج ہے - اور جس مین ابھی تک اور کسی ترقی کی گنجایش نہین نظر آتی - فی الحال سارے ہندوستان مین پتے دار کنکوا یا پھُندنے دار کنکوا جو ڈیڑھ کنّا کہلاتا ہے اُڑتا ہے - مگر اس کی ایجاد لکھنؤ ہی مین ہوئی ہے - یہین سے سب جگہ گیا اور مقبول عام ہوا -

کنکوون کے لڑانے مین بھی پہلے تکل کی طرح ڈھیل کا رواج تھا - بڑے بڑے کنکوے بنتے اور سیرون ڈور پیٹے چلے جاتے - آخر شاہی اور آغاز انگریزی کے مشہور اُستاد ولایت علی جو ولایتی کہلاتے - الٰہی بخش ٹنڈے جو مٹیا برج مین جا کے مشہور ہوے - اور لکھنؤ کے سیکڑون با کمال اُستاد تھے جن کے نام سبھے

اسوقت نہین یاد آتے۔ مگر سچ یہ ہے کہ لڈو رے پیچ لڑانے کے بادشاہ تھے۔
انگریزی کے آغاز مین کھینچ لڑانے کا رواج ہوا۔ اس کا آغاز تو اُن چھوٹے لڑکون سے ہوا جن کے پاس تھوڑی سی ڈور ہوتی۔ اور دوسرے کے کنکوے مین پیچ ڈال کے اپنی بے ایگی سے بے تحاشا کھینچ جاتے اور کاٹ دیتے۔ پرانے اُستاد اُن دنون ان لوگون کو حقارت کی نظر سے دیکھتے اور اپنے کنکوون کو اُن سے الگ رکھتے۔ مگر آخر کار کھینچ ہی کنکوے بازی کا اعلیٰ ترین فن ہوگیا۔ جس مین بڑے بڑے اُستاد پیدا ہوے۔ اور آج لکھنؤ مین بیسیون اُستاد پڑے ہوے ہین جو اسی شوق مین لاکھون روپے اُڑا کے اُستاد بنے ہین۔ اور گھر بگاڑ کے اتنی فوقیت حاصل کی ہے کہ کنکوے کے میدانون مین بڑے شوق سے بُلائے اور ادب و تعظیم کے ہاتھون سے لے کے آنکھون پر بٹھائے جاتے ہین۔

(۲۱)

اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ فن موسیقی کا اور اُسکے سلسلے مین اُن لوگون کا جو اس فن سے وابستہ ہین لکھنؤ مین کیا حال رہا۔

گانا اُن چیزون مین سے ہے جن کو انسان کی فطرت نے سب سے پہلے ایجاد کیا۔ جن الفاظ کے ادا کرنے مین جوش ظاہر کرنے کو جی چاہا لوگ گانے لگے۔ اور جن حرکات و افعال مین جذبات نے اُبھارا ناچنا شروع کر دیا۔ اور چونکہ سب سے زیادہ جوش و شیفتگی انسان کی عبادت مین ہوتا ہے اور دنیوی امور مین سب سے زیادہ بے اختیاری کا ناقابل برداشت جوش عشق و محبت کے اظہار مین ہوتا ہے۔ اس لیے گانے کا آغاز بھی ابتداءً عبادت و عشق مین ہوا۔ ہندوستان مین گانے کا آغاز قطعاً عبادت سے ہوا۔ اس لیے کہ یہان کے پہلے گوئیے خاص برہمن تھے۔ جو ابتداءً عبادت کرتے اور کراتے وقت اپنے معبودون کی تعریف کے بھجن گایا کرتے۔ کنھیاجی کی ولادت نے اُن کی محبت اور اُن کے عشق کو عبادت بنا کے عاشقانہ موسیقی ایجاد کی

اور یہی وجہ ہے کہ ہندوستان مین شاعری اور موسیقی دونون کا اظہار عورت کی زبان سے ہوا کرتا ہے۔ ابتداءً برہمن فقط گیت اور سنگیت یعنی سیدھے سادے

گانے گایا کرتے تھے۔ جن میں فن کی ترقیوں کا ذرا بھی شائبہ نہ تھا۔ مگر بعد کو مصریوں یا بابلیوں اور ایرانی محققوں کے مذاق کی آمیزش سے اس فن کی بنیاد پڑی۔ اور سب سے پہلے سات سُر ایجاد ہوے۔ اس لیے کہ ہر آواز پھیلنے میں ایک حد پر پہونچ کے بدل جاتی ہے۔ ان تبدیلیوں کا صحیح اندازہ کر کے محققین نے سات سُر ایجاد کیے۔

اس کے بعد ہندوستان میں موسیقی کی تقسیم اس حیثیت سے ہوئی کہ جو راگ عبادت میں گائے جاتے وہ یا تو برہما (پیدا کرنے والی قوتِ الٰہی) کی منقبت میں ہوتے یا بشن (جِلانے اور پالنے والی قوت الٰہی) کی تعریف میں ہوتے۔ یا مہیش یعنی مہادیو (مارنے والی قوت الٰہی) کی مدح میں ہوتے۔ اسی لحاظ سے تین قسم کے راگ بن گئے۔ پہلی قسم کے راگوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ برہمنوں نے کسی کو نہ بتائے اور اپنے ساتھ لے کے مر گئے۔ جو راگ تمام مراحل زندگی زچہ خانے۔ شادی۔ اور دنیا بھر کے کاروبار کے متعلق تھے وہ دوسری قسم کے راگ قرار پائے۔ آخری قسم کے راگ مابعد الموت کی حالت اور ثواب و عقاب سے وابستہ تھے۔ وہ اکثر مہیب خوف دلانے والے اور دل پر عالم کے فانی ہونے کا اثر ڈالنے والے ہوتے۔ عاشقانہ راگ بھی محض اس لیے کہ عاشق مرگ کا خواہاں ہوتا ہے اسی قسم میں شامل کر دیے گئے۔ خصوصاً اس لیے کہ کنھیّا یا سری کرشن جی مہادیو ہی کا ایک اوتار تھے۔ اس قسم کے راگ عموماً "بروگ" کہلاتے۔ اُن کے راگ بھیروں۔ سرس راگ۔ اور راگنیاں بھیرویں۔ پرچ۔ کالنگڑا۔ سوہنی سندھ۔ پیلو وغیرہ ہیں۔

اس کے بعد جب برہمنوں کو راجاؤں کے دربار میں اُن کی مدح کے قصائد گانا پڑے تو اُن کے مناسب رعب داب اور سطوت و شوکت کے راگ ایجاد ہوے۔ جیسے مالکوس۔ درباری۔ شاہانہ (اڈانہ) وغیرہ۔

مسلمان اپنے ساتھ اپنا موسیقی لائے تھے۔ اُن کا موسیقی سب کے پہلے ابن مسجح نے مدوّن و مکمل کیا تھا۔ اُسکے بعد جب عراق میں عباسی دربار قائم ہوا تو عربی اور فارسی موسیقی سے مل کے ایک نیا اور نہایت مکمل فن غنا ایجاد ہوا

جو ساری دنیا مین پھیل گیا۔ اور وہی آخر مین عجمی موسیقی تھا۔ مسلمان اُسی فن کو ہندوستان مین لائے۔ اور جو گوئیے اُنکے ساتھ یہان آئے تھے اُنھین کی یادگار آج کل قوّال ہین۔ اُن کے آلات طرب سرود۔ چنگ۔ شہنائی (سینائی) بربط اور رباب ہین

ہندوستان مین ہر چیز پر مسلمانون نے اپنا اثر ڈالا۔ تمام علوم و فنون۔ اور معاشرت کی تمام باتون کو بدل دیا۔ مگر یہان موسیقی پر بہت کم اثر ڈال سکے جس کی وجہ عموماً یہ خیال کی جاتی ہے کہ خود یہان کا موسیقی اس قدر باضابطہ اور اعلیٰ درجے کا تھا کہ اپنی مضبوطی و باقاعدگی کے باعث بیرونی اثر سے متاثر ہی نہ ہوسکا۔ لیکن حقیقت حال اور اُس کا اصلی باعث یہ ہے کہ کسی ملک اور زبان کی موسیقی کی طرف انسان اسوقت توجہ کرتا ہے جب اُس ملک کا باشندہ بن لے اور وہان کی زبان و معاشرت کا رنگ اُسپر چڑھ جائے لہذا یہان آنے کے بعد جانہ آور مسلمان جب تک عربی یا عجمی رہے یہان کے موسیقی کی طرف توجہ نہ کی۔ اور جب توجہ کی تو اُس وقت ہندوستانیت اُنکے رگ و پے مین سرایت کر چکی تھی۔ اپنے قومی راگون کو بھول چکے تھے۔ اور یہان کے نغمون کے دلدادہ تھے۔ اُسوقت وہ اس قابل ہی نہین رہے تھے کہ یہان کے موسیقی مین کسی قسم کا تصرف کرتے یا اُس مین کچھ نکتہ چینی کر سکتے۔

پھر بھی عجمی قوالون کے نغمون نے ہندوستان کے موسیقی پر تھوڑا بہت اثر ڈال ہی دیا۔ چنانچہ اُنکے متعدد راگ ہندی موسیقی مین شامل ہوگئے۔ زنگولہ (جنگلا) زلیف۔ شاہانہ۔ درباری۔ منلع (کماچ) وغیرہ کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ عجمی راگ ہین جو ہندوستانی فن غنا مین شامل ہوگئے ہین۔

امیر خسرو نے دونون فنون کو حاصل کیا۔ اور دونون کے ملانے کی بہت کچھ کوشش کی۔ کہتے ہین کہ ستار کو اُنھین نے ایجاد کیا۔ اور یقیناً بہت سی دُھنین اُن کی ایجاد کی ہوئی ہین۔ لیکن اس کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ امیر خسرو نے یہان کی موسیقی مین کون کون خاص چیزین بڑھائین۔

مسلمانون مین معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہون سے پہلے مشائخ صوفیہ نے موسیقی کی

طرف توجہ کی ۔ اور حال وقال کی جو صحبتیں عراق وعجم کے زہاد سلف میں عبادت
کی شان سے قائم تھیں ہندوستان میں بھی قائم ہو گئیں ۔ اور جو گویئے اس سے پیشتر
بتخانوں میں بھجن گایا کرتے تھے ۔ مسلمان زہاد و صوفیہ کے حلقے میں بیٹھ کے معرفت
کی غزلیں گانے لگے ۔

بادشاہوں کے دربار میں بھی یہاں کے گویئے اور گانے ناچنے والی رنڈیاں
موجود رہا کرتیں ۔ مگر اُن کا افسر اعلیٰ کوئی عجمی گویا ہوا کرتا جو اُنکے موسیقی پر
اپنا کچھ نہ کچھ اثر ضرور ڈالتا ۔ محمد تغلق کے عہد میں دربار کا سب سے بڑا گویا
امیر شمس الدین تبریزی تھا اور کل زن و مرد ارباب نشاط اُس کے زیر حکم تھے ۔
اُنھیں دنوں دیوگڑھ یعنی دولت آباد کے متصل ارباب نشاط کی ایک پوری
بستی آباد تھی جو "طرب آباد" کہلاتی ۔ اُس کے چوپڑ کے بازار کے بیچوں بیچ میں
ایک برج تھا جس میں روز بعد عصر ارباب نشاط کا چودھری آ کے بیٹھتا اور اسکے
سامنے تمام گویوں اور رنڈیوں کے طائفے باری باری آ کے گاتے ۔ اُن میں سے
اکثر مسلمان تھے اور صوم وصلوٰۃ کے پابند ۔ اس بستی میں جابجا مسجدیں تھیں جن میں
ماہ مبارک رمضان میں تراویح پڑھی جاتی ۔ بڑے بڑے راجہ یہاں آ کے گانا
سنتے ۔ کئی مسلمان تاجداروں نے بھی یہاں آ کے گانا سنا تھا ۔ اہل طرب کے سرگروہ
اور چودھری چونکہ عموماً مسلمان تھے اس لیے ظاہر ہے کہ عربی وعجمی اور ہندوستانی
فنون غنا کس قدر جلد ل جُل گئے ہوں گے ۔

ہند و موسیقی کے مرکز شمالی ہند میں متھرا ۔ اجودھیا اور بنارس تھے ۔ جہاں
مذہبی عنصر اعظم ہونے کی وجہ سے موسیقی کا فن ہمیشہ پرورش پاتا رہتا تھا ۔ جونپور
کے سلاطین شرقی میں سے سلطان حسین شرقی کو موسیقی کا شوق بہت تھا ۔ وہ خود
ایک بڑا گویا تسلیم کیا جاتا ۔ اور چونکہ اجودھیا اور بنارس دونوں اُسکی قلمرو میں
تھے اس لیے یقیناً اُس نے ہندوستان کے اس شریف فن کو بڑا فائدہ پہونچایا ہوگا ۔

اکبر نے اس فن کی یہاں تک قدر کی کہ اُسکے عہد کا سب سے بڑا نامور گویا
تانسین اُس کے "نورتن" میں شامل ہوا ۔ ایک مسلمان شہنشاہ کی یہ توجہ غنا
دیکھ کے وہ خود یا اُس کا بیٹا بلاس خان مسلمان ہو گیا ۔ اس خاندان میں دربار کی

قدردانی سے ہندی موسیقی کو روز بروز عروج حاصل ہوتا رہا۔ بعد کے درباروں میں اسی نسل کے گویے سرفراز ہوتے رہے۔ چنانچہ آج تک اس خاندان کے لوگ اپنے آپ کو دربار مغلیہ ہی سے وابستہ خیال کرتے ہیں۔ عموماً سمجھا جاتا ہے کہ اسی نسل کے ذریعے سے ہندوؤں کا یہ فن مسلمانوں میں آیا۔ مگر جن واقعات کو ہم بیان کر آئے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اس خاندان سے بہت پہلے مسلمانوں نے اس ہندی کمال کو حاصل کر لیا تھا۔ چنانچہ فی الحال ہندی موسیقی کے تمام باکمال اور کل نامی گویے مسلمان ہی ہیں۔

دہلی میں اس فن پر سب سے پہلے شاہجہان بادشاہ کے عہد میں کتاب "شمس الاصوات" لکھی گئی جو اب کہیں نہیں ملتی۔ پھر اکبر ثانی کے عہد میں میرزا خان نام ایک بزرگ نے پنڈتوں اور علمائے سنسکرت کی مدد سے کتاب "تحفۃ الہند" تصنیف کی جس کے دو ہی ایک نسخے بعض لوگوں کے پاس رہ گئے ہیں۔ اس میں بہت سے ہندی فنون کو جمع کیا ہے۔ جہاں جوتش۔ سروودھا۔ سامدرک۔ کوک۔ نائکہ بھید۔ اندرجال وغیرہ مختلف فنون پر بحث کی ہے وہاں ہندی موسیقی کو بھی بتایا ہے۔

دہلی میں اسی حد تک ترقی ہونے پائی تھی کہ یہ دلچسپ فن دربار لکھنؤ میں منتقل ہو آیا۔ اور نواب شجاع الدولہ کی قدردانی و فیاضی نے سارے ہندوستان کے موسیقی دانوں کو اودھ کی سرزمین پر لا کے اکٹھا کر دیا۔ یہاں اجودھیا اور بنارس کے موسیقی کے پرانے اسکول قائم ہی تھے۔ جونپور کے شرقی سلاطین کی قدردانی کی کچھ نہ کچھ یادگاریں بھی باقی تھیں۔ اُن میں جب دہلی کے باکمال گویئے اور تانسین خان کے مستند اسکول کے اُستادان موسیقی بھی آ کے مل گئے تو خاص شان پیدا ہو گئی۔ اور موسیقی کا درحقیقت ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

شجاع الدولہ کی نسبت مصنف تاریخ فیض آباد لکھتے ہیں کہ ارباب نشاط کا بڑا شوق تھا۔ ہزارہا گانے والی رنڈیاں عموماً دہلی سے اور دیگر بلاد دور و دراز سے یہاں آ کے جمع ہو گئی تھیں۔ عام رواج پڑ گیا تھا کہ نواب وزیر کے علاوہ اور تمام اُمرا و سرداران فوج بھی کسی طرف کوچ کرتے تو ارباب نشاط اور رنڈیوں

کے ڈیرے اُن کے ساتھ ساتھ جاتے۔

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ نواب آصف الدولہ بہادر کے عہد مین فارسی زبان میں کتاب "اصول النغمات الآصفیہ" لکھی گئی۔ ہندوستان کے فن موسیقی پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک تصنیف نہین ہو سکی۔ اگرچہ اس کتاب کے بھی بہت ہی کم نسخے دستیاب ہوتے ہین میرے پاس موجود ہے۔ اور میں نے اُسے پڑھا ہے۔ مصنف پختہ مغز۔ صاحب علم وفضل ہے۔ عربی فارسی اور سنسکرت تینون زبانون مین پوری دستگاہ رکھنے والا معلوم ہوتا ہے۔ جس نے اس امر مین بڑی کامیاب کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی موسیقی کو بہت ہی وضاحت کے ساتھ ہر شخص کے ذہن نشین کر دے۔ اسداللہ خان کوکب مرحوم جنھون نے چند ہی روز ہوے انتقال کیا موسیقی کے اعلیٰ درجے کے صاحب علم اُستاد تھے۔ اور کلکتے مین ہندوستانی موسیقی کے پروفیسر مشہور تھے۔ وہ اس کتاب کی نسبت مجھے اپنے ایک خط مین لکھتے ہین کہ "موسیقی کا یہ فارسی رسالہ میرے پاس موجود ہے۔ یہ رسالہ اُن معتبر کتابون سے جو اس علم کی قدیم مایۂ بساط ہین مضامین اخذ کر کے بڑی تحقیق اور تدقیق سے لکھا گیا ہے۔" افسوس یہ لاجواب کتاب آج تک نہین چھپی۔ اور اس کے نسخے اس قدر کمیاب ہین کہ اُس کے فنا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اگر کوئی رئیس توجہ کرین تو مُلک اور اپنی قدیم تاریخ پر بڑا احسان کرین۔

یہ رسالہ ہی بتا رہا ہے کہ آصف الدولہ کے عہد کے لکھنؤ مین موسیقی کو کس قدر ترقی ہو گئی تھی۔ اس کا مصنف ایک بڑا محقق معلوم ہوتا ہے جسنے ابن سینا کی کتاب شفا سے لے کے عربی اور فارسی موسیقی کے اصول بھی بصراحت بتا دیے ہین۔ دلگداز کے اس مضمون کی تکمیل کے لیے ہم نے پروفیسر کوکب مرحوم سے مدد مانگی تھی۔ اُنھون نے جواب مین ہمین جو کچھ لکھا اُسے ہم بجنسہٖ شایع کیے دیتے ہین۔ اس سے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ لکھنؤ مین آنے کے بعد فن موسیقی کی کیا حالت رہی؟ افسوس اب وہ دنیا مین نہین ہین ورنہ ہمین اُن سے بہت زیادہ مدد ملتی۔ خصوصاً اس لیے کہ اپنی نئی کتاب جو فن موسیقی مین لاجواب ہے وہ ہمارے یہان چھپوانا چاہتے تھے۔ آصف الدولہ کے عہد کی ترقی موسیقی

تسلیم کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں :-
نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں موسیقی پر اوس پڑ گئی۔ غازی الدین حیدر کے زمانے میں اس فن کا ایک بہت بڑا کامل و اکمل شخص لکھنؤ میں موجود تھا۔ جس کا نام حیدری خاں تھا۔ یہ صاحب اپنی وارفتہ مزاجی کی وجہ سے "سڑے حیدری خاں" مشہور تھے۔ اور گولہ گنج میں رہتے تھے۔ غازی الدین حیدر کو ان کا گانا سننے کا بڑا شوق تھا۔ مگر کبھی اس کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک روز سہ پہر کو غازی الدین حیدر ہوادار پر سوار دریا کنارے تفریح کو نکلے۔ رومی دروازے کے نیچے لوگوں نے دیکھا کہ "سڑے حیدری خاں" چلے جاتے ہیں۔ بادشاہ سے عرض کی کہ قبلۂ عالم حیدری خاں یہی ہیں۔" بادشاہ کو تو اشتیاق تھا ہی حکم دیا کہ "بلاؤ" لوگ پکڑ لائے۔ اور سامنے کھڑا کر دیا۔ بادشاہ نے کہا "ارے میاں حیدری خاں۔ کبھی ہمیں اپنا گانا نہیں سناتے؟" بولے "جی ہاں کیوں نہ سناؤں گا۔ مگر مجھے آپ کا مکان نہیں معلوم ہے۔" بادشاہ بے اختیار ہنس پڑے اور کہا "اچھا ہمارے ساتھ چلو۔ ہم خود تمھیں اپنے مکان پر لے چلیں گے۔" "بہت خوب" کہہ کے بے تکلف ساتھ ہو لیے۔ چھتر منزل کے قریب پہونچے تھے کہ حیدری خاں ہتھے پر سے اُکھڑ گئے۔ اور بولے "میں چلتا تو ہوں مگر پوریاں اور بالائی کھلوائیے گا تو گاؤں گا۔" بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور محل میں بیٹھ کے گانا سننے لگے۔ تھوڑی ہی دیر سُن کے بہت محظوظ ہوئے۔ وجد کا عالم طاری ہوا۔ اور بیخود و بیتاب ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کے حیدری خاں خاموش ہو گئے۔ بادشاہ نے پھر گانے کو کہا تو بولے "حضور۔ یہ دنیا کو جو آپ کے بیچوان میں بھرا ہوا ہے بہت ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ آپ کس کی دُکان سے منگواتے ہیں؟" غازی الدین حیدر خود بھی آشفتہ مزاج تھے۔ اور سڑی مشہور تھے۔ اس سوال پر متنفص ہوئے تو مصاحبوں نے عرض کیا "قبلۂ عالم! یہ سڑی تو ہئی ہے۔ ابھی تک یہی نہیں سمجھا ہے کہ کس سے باتیں کر رہا ہوں۔"

اب لوگ بادشاہ کے ایما سے حیدری خاں کو دوسرے کمرے میں لے گئے۔ پوریاں بالائی کھلوائی۔ حقّہ پلوایا۔ آپ نے پاؤ بھر پوریاں آدھ پاؤ بالائی

اور ایک پیسے کی شکر منگوا کے اپنی بی بی کو بھجوائی (جوان کا ہر جگہ معمول تھا)
جب تک ان کامون مین رہے بادشاہ نے بادۂ ناب کے جام پیے۔ اور جب
نشے کا زور ہوا تو پھر حیدری خان کی یاد ہوئی۔ فوراً بلوا کے گانے کا حکم دیا
مگر جیسے ہی اُنھون نے اپنا نغمہ شروع کیا روک کے کہا "حیدری خان سنتے ہو
اگر مجھے خالی خوش کیا اور رُلایا نہین تو یاد رکھو کہ گومتی مین ڈبوا دون گا"۔
اب تو حیدری خان کی عقل چکر مین آئی۔ سمجھے کہ یہ بادشاہ ہین۔ کہا "حضور
اللہ مالک ہے"۔ اور جی توڑ کے گانے لگے۔ خدا کی قدرت۔ یا یہ کہیے کہ
حیدری خان کی زندگی تھی کہ تھوڑی ہی دیر مین بادشاہ پر اثر ہوا۔ بے
اختیار رونے لگے۔ اور خوش ہو کے کہا "حیدری خان۔ مانگ کیا مانگتا ہے؟"
عرض کیا "جو مانگون گا دیجیے گا؟" بادشاہ نے وعدہ کیا۔ اور حیدری خان نے
تین دفعہ قبولوا کے کہا "حضور یہ مانگتا ہون کہ مجھے پھر کبھی نہ بلوائیے گا اور نہ
گانا سنیے گا"۔ بادشاہ نے تعجب سے پوچھا "کیون؟" عرض کیا "آپ کا کیا ہے؟
مجھے مروا ڈالیے گا۔ پھر مجھ سا حیدری خان نہ پیدا ہو گا۔ اور آپ مر جائینگے
تو فوراً دوسرا بادشاہ ہو جائے گا"۔ اس جواب پر غازی الدین حیدر نے
ناراض ہو کے منہ پھیر لیا۔ یہ موقع پاتے ہی حیدری خان اپنی جان لے کے
بھاگے اور اپنے گھر آئے"۔

غرض غازی الدین حیدر کے زمانے مین بھی ایک باکمال موسیقی دان لکھنؤ مین
تھا۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے مین یون تو ہزارون گانے والے تھے مگر اس
پائے کا گویا کوئی نہ تھا۔ محمد علی شاہ اور امجد علی شاہ کے زمانے ثقاہت آبی کے
عہد تھے۔ اس لیے کہ محمد علی شاہ مین پیرانہ سالی کی بے حسی تھی اور امجد علی شاہ
بغیر جناب قبلہ و کعبہ سے پوچھے کوئی کام نہ کرتے تھے۔ لہٰذا اُن کے زمانے
مین بعض شوقین رؤسائے شہر اگر ارباب نشاط کے قدر دان بھی تھے تو چھپ کے
گانا سنتے۔ اس لیے اب اس فن کی جو کچھ قدر ہوئی واجد علی شاہ کی عہد شباب
کی تخت نشینی مین ہوئی۔ جبکہ لکھنؤ کا ساغر عیش چھلکنے کو تھا۔ اور گُل ہونے والا چراغ
آخری مرتبہ بھڑک کے روشن ہوا تھا۔

(۲۴)

اگرچہ ہم نصیرالدین حیدر، اور بعد والے فرمان روایان عہد کے موسیقی کے بارے مین کچھ اور بھی بیان کرنا چاہتے ہین مگر اس سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسداللہ خان کوکب مرحوم کے خط کا باقیماندہ حصہ بھی اپنے ناظرین کو سنا دین جس سے لکھنؤ کی موسیقی پر ایک مستند ماہر فن کی رائے معلوم ہو جائے گی -

وہ تحریر فرماتے ہین "واجد علی شاہ کے زمانہ مین لکھنؤ مین باکمالان موسیقی کا گروہ کثیر جمع ہو گیا تھا - لیکن دربار کے رسوخ یافتہ اور صاحب خطاب گویے کاملین فن نہ تھے - صرف ایک قطب الدولہ رامپور کے رہنے والے البتہ ستار خوب بجاتے تھے - اور اپنے فن مین اچھے تھے - انیس الدولہ - مصاحب الدولہ - وحید الدولہ اور رونق الدولہ اگرچہ گوئیے تھے مگر ایسے باکمال نہ تھے - فقط عنایت شاہی سے دولہ ہو گئے تھے - کاملین فن مین یہ لوگ تھے - پیار خان - جعفر خان - حیدر خان - باسط خان - یہ سب لوگ میان تان سین کے خاندان کی یادگار تھے - اس خاندان کے دو نامی شخص آج کل بھی موجود ہین - ایک وزیر خان جو ریاست رامپور مین ہین - دوسرے محمد علی خان جو ریاست پرنڈا مین ملازم ہین - محمد علی خان کے والد باسط خان تھے جن کا نام اوپر آ چکا ہے "

اس موقع پر کوکب خان مرحوم بتاتے ہین کہ میرے والد مرحوم نعمت اللہ خان نے باسط خان ہی سے علم موسیقی حاصل کیا تھا - نعمت اللہ خان تقریباً گیارہ سال تک مٹیا برج مین واجد علی شاہ کے ساتھ رہے - پھر اس کے بعد تیس برس تک دربار نیپال مین رہے "

اس کے بعد لکھتے ہین :- واجد علی شاہ کے عہد مین موسیقی کا خوب چرچا رہا - لیکن علم موسیقی اپنے بلند پائے سے گر کے چھوٹی چھوٹی چیزون پر آ گیا تھا - لکھنؤ مین کدر پیا نے ٹھمریان تصنیف کر کر کے عوام مین پھیلا دین - اور موسیقی کو بے حس کر دیا - چنانچہ اکثر شیدایان موسیقی اعلیٰ درجہ کی راگ راگنیون کو چھوڑ کے کدر پیا کی ٹھمریان پسند کرنے لگے - موسیقی کے مذاق مین تنزل محمد شاہ رنگیلے ہی کے عہد سے شروع ہو گیا تھا - جب میان سارنگ نے خیال کو تصنیف کیا جس سے فن موسیقی اصولاً ناقص

ہو گیا۔ مگر اس سے بدرجہا زیادہ خرابی کدر کی ٹھمریوں سے پیدا ہو گئی۔ اور اب
عوام و رؤسا کی یہ حالت تھی کہ اعلیٰ قسم کی موسیقی کو اگر سنتے بھی تھے تو دلچسپی و
شوق سے نہیں۔ بلکہ ناپسند کرتے تھے۔

واجد علی شاہ کے مصاحب گویوں میں سے انیس الدولہ اور مصاحب الدولہ
نے موسیقی کو پیار خان سے حاصل کیا تھا جو بہت بڑا صاحب کمال اُستاد تھا۔
اور جو کچھ اُس نے ان دونوں شاگردوں کو بتایا وہ بیشک اعلیٰ پیمانے پر تھا لیکن
اس کا کیا علاج کہ دربار میں ایسے موسیقی کی قدر ہی نہ تھی۔ رہس جو قیصر باغ
میں ہوتا تھا جس میں واجد علی شاہ خود کنھیا بنتے تھے بہت ہی بتذل درجے کا
موسیقی تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ رغبت نہ ہونے پر بھی اہل کمال کی دربار
شاہی میں بڑی قدر ہوتی تھی۔ جس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ واجد علی شاہ نے بھی
باسط خان سے فن موسیقی حاصل کیا تھا۔ اور فن میں پوری بصیرت رکھتے
تھے۔ اپنی عالی دماغی کی وجہ سے بادشاہ نے اپنے طرز میں نئی راگنیاں تصنیف
کیں جن کے نام اپنی طبیعت داری سے جوگی کنتر۔ جوہی۔ شاہ پسند وغیرہ رکھے
واجد علی شاہ کو اس فن میں اساتذہ کا درجہ حاصل تھا۔ صاحب کمال تھے۔
لیکن اس الزام سے نہیں بچ سکتے کہ اُن کے عامیانہ مذاق نے لکھنؤ میں موسیقی
کو سبک اور عام فہم بنا دیا۔ زمانے کا یہ رنگ دیکھ کے نفیس طبیعتیں رکھنے والے
گویوں نے بھی راگ راگنیوں کی مشکلات کو ترک کر کے چھوٹی چھوٹی سادی دلکش
اور عام فہم چیزوں پر موسیقی کو قائم کیا۔ عوام میں غزل ٹھمری کا چرچا ہو گیا۔
اور دھرپد و ہوری وغیرہ جو نہایت ثقیل اور مشکل چیزیں ہیں اُن کی طرف مطلق
توجہ نہ کی گئی۔ کھماج جھنجھوٹی۔ بھیرویں۔ سیندورا۔ تلک کاموو۔ پیلو وغیرہ
چھوٹی چھوٹی مزہ دار راگنیاں اہل مذاق کے تفنن کے لیے منتخب کی گئیں۔ اور
یہی چیزیں بادشاہ کو بالطبع مرغوب تھیں۔ یہ راگنیاں لکھنؤ کی قدردان سوسائٹی
کے مذاق میں یہاں تک سرایت کر گئیں کہ آج سارے ہندوستان میں لکھنؤ کے
سفیدے خربوزوں کی طرح لکھنؤ کی بھیرویں بھی مشہور ہو گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ بھیرویں
لکھنؤ ہی کا حصہ ہے ایسی بھیرویں ہندوستان کے کسی حصے میں نہیں گائی جاتی۔

سوز خوانوں نے بھی انھیں عام پسند و عام فہم راگنیوں کو زیادہ رواج دیا جو مذہب کی سفارش سے گھر کی بیٹھنے والی عورتوں تک کے گلے میں اتر گئیں۔ یہاں تک کہ اُن کی نوحہ خوانی سُن کے بڑے بڑے باکمال گویے نقش حیرت بن جاتے ہیں۔ سوز خوانوں میں سے اکثر پیار خان اور حیدر خان کے شاگرد تھے۔

"لے" ایک اہم جزو موسیقی ہے۔ جس کو عرف میں ٹائم یا وقت کہنا زیادہ موزوں ہے۔ اُس کا مادہ واجد علی شاہ میں بہت زیادہ تھا۔ جسے قدرت کی دین کہنا چاہیے۔ اور یوں تو لے کا مادہ کم و بیش ہر شخص میں ضرور موجود ہوتا ہے۔ شعرا نے جو اوزان مقرر کیے ہیں وہ بھی "لے" ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم عروض دراصل مکمل لے ہے۔ ارکان تال کے اجزا ہیں۔ یہ بدیہی امر ہے کہ جس شخص میں فطرۃً لے کا مادّہ بہت بڑھا ہوا ہوگا اُس کے ہر عضو اور بُن مو سے حرکتِ بے اختیاری و ربودگی پیدا ہو جائے گی۔ اور لے پر عضو عضو پھڑکنے لگے گا۔ عوام کی نظر میں یہ حرکت بے وقعت اور مہمل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن وہ شخص جس سے سرزد ہوتی ہے مجبور ہے۔ وہ دانستہ اس فعل کو نہیں کرتا بلکہ اعضا خود بخود لے پر حرکت کرنے لگتے ہیں۔ واجد علی شاہ کے اسی فعل کو لوگ کہتے ہیں کہ وہ ناچتے تھے۔ حالانکہ وہ "ناچتے" نہ تھے بلکہ لے داری میں محو ہو کے اُنکے اعضا سے ایسے حرکات سرزد ہونے لگتے تھے۔ جو لوگ اصول موسیقی سے ناواقف ہیں کہنے لگے بادشاہ ناچتے ہیں۔ دراصل واجد علی شاہ کبھی اور کسی زمانے میں نہیں ناچے اُن کا ناچنا بس یہی تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ لے داری میں کوئی اعلیٰ درجے کا کامل فن گویا بھی بادشاہ کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ میں نے اُنکی صحبت کے معتبر گویوں سے سُنا ہے کہ بادشاہ کے پاؤں کا انگوٹھا سوتے میں بھی لے ہی پر چلتا تھا۔

نرت جس کو بھاؤ بتانا کہتے ہیں یہ فن بھی علم موسیقی کا ایک خاص جز ہے۔ نرت کا مقصد یہ ہے کہ مافی الضمیر حرکات اور اشاروں سے ادا کیا جائے جس کو انگریزی میں موشن کہتے ہیں۔ موشن بڑے بڑے جید اسپیکروں اور لکچراروں میں پایا جاتا ہے۔ لیکن انھیں کوئی ہدف ملامت نہیں بناتا۔ مگر بیچارے واجد علی شاہ

محض اپنی لَے داری کی وجہ سے بدنام کیے جاتے ہیں۔"

یہ ہے جو لکھنؤ کی موسیقی اور واجد علی شاہ کے متعلق کوکب مرحوم کی تحریر سے معلوم ہوا۔ اس سے صاف پتہ چل سکتا ہے کہ لکھنؤ نے چاہے اعلیٰ درجے کے موسیقی کو رواج نہ دیا ہو مگر اسکے سُدھارنے اور عام پسند بنانے کا یہ شہر کتنا بڑا زبردست اسکول قرار پا گیا تھا۔

غازی الدین حیدر ہی کے زمانے میں یہاں اعلیٰ درجے کے قوالوں کی شہرت تھی۔ چھجو خان اور غلام رسول خان اُستادِ فن مانے جاتے تھے۔ شوری اتنا بڑا زبردست موجدِ فن تھا کہ ٹپّے کا موجد وہی مانا گیا ہے۔ بخشو اور سلاری اُن دنوں طبلہ بجانے کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ اور اُن کے مقابل کسی کو طبلہ چھونے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

اس آخر زمانے میں صادق علی خان سارے ہندوستان میں اُستادِ بے بدل مانے جاتے تھے۔ چھوٹے اور بڑے مُنّے خان کے گانے میں ایسا مزہ اور لطف تھا کہ باوجود کاملِ فن ہونے کے ناواقف عوام کو بھی اپنے نغمے پر فریفتہ کر لیتے۔

مٹیا برج میں جو ڈھاڑی واجد علی شاہ کے دربار میں ملازم تھے اُن سب کو میں نے خود سُنا تھا۔ احمد خان۔ تاج خان اور غلام حسین خان اُس وقت کے زبردست صاحبِ کمال مانے جاتے۔ مُنّی خان جس نے سارے کلکتے میں اپنی دھوم مچا رکھی تھی اور اپنے سحر آفرین گلے سے ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو فریفتہ کر لیا کرتا۔ لکھنؤ ہی کا تھا۔ اور لکھنؤ ہی کے اسکول موسیقی کا تعلیم یافتہ تھا۔ مردگویوں کے علاوہ لکھنؤ میں بعض رنڈیوں نے وہ کمال حاصل کیا کہ بڑے بڑے ڈھاڑی اُنکے سامنے کان پکڑتے تھے۔ زُہرہ و مشتری جو شاعرہ بھی تھیں گانے میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں۔ چُونے والی حیدر کو وہ ناموری حاصل ہوئی کہ اُس کے گلے سے سوز سننے کے لیے لوگ محرم کے انتظار میں دن گنا کرتے۔ اور محرم میں باہر کے سیکڑوں ہزاروں شوقین لکھنؤ میں آ کے حیدر کے امام باڑے میں گھنٹوں اُمیدوار بنے بیٹھے رہتے کہ کب بی حیدر اپنا نغمۂ غم شروع کریں گی۔

طبلہ بجانے میں آخری عہد کا کامل محمد جی تھا جس کی سارے ہندوستان میں

شہرت تھی۔ تقریباً تیس سال کا زمانہ ہوا۔ مجھے چوک مین ایک جنٹلمین مرہٹہ ملا جو کوٹ پتلون پہنے تھا اور کسی معزز خدمت پر مامور تھا۔ مجھ سے مل کے اُس نے کہا کہ "مین لکھنؤ مین صرف اس شوق مین آیا ہون کہ یہان کے باکمالان موسیقی کا کمال دیکھون۔" مین نے پوچھا "آپ کون ہین؟" کہا "مین خاندانی گویا ہون اور میرے باپ دادا سیواجی کے دربار کے گویے تھے۔ اگرچہ اب انگریزی تعلیم پانے کے بعد نوکری کر لی ہے مگر اپنے خاندانی فن کو بھی جانتا ہون"۔ اتفاقاً اُسوقت ایک اور صاحب آگئے جو لکھنؤ کی مشہور گانے والی "محمدی" کے وہان آتے جاتے تھے بولے "چلیے آپ میرے ساتھ چلیے۔" وہ مرہٹے صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گئے۔ اور ہم سب محمدی کے وہان پہونچے۔ اتفاقاً وہان صادق علی خان بھی موجود تھے۔ اور سب نے اپنا کمال دکھایا۔ خود وہ مرہٹہ بھی گایا۔ اسکے بعد ہم سب چودھرائن کے وہان گئے جو گھر یہان صاحبان فن کا سب سے بڑا کلب سمجھا جاتا ہے۔ وہان دونون منّے خان بُلائے گئے۔ اُنھون نے گا کے اپنا کمال دکھایا۔ آخر مین اُس مرہٹے نے کہا "مجھے تو صرف اتنی تمنا یہان لائی ہے کہ مین ایک ترانہ گاؤن اور محمد جی میرے ساتھ طبلہ بجا دے۔" فوراً محمد جی بُلوائے گئے۔ اور مرہٹے جنٹلمین کے گانے اور محمد جی کے بجانے مین کُل حاضرین کو بڑا مزہ آیا۔ سب عش عش کر گئے۔ اور آخر مین اُس مرہٹے نے قبول کر لیا کہ "مین سب جگہ گیا ہون مگر محمد جی سے زیادہ باکمال طبلہ نواز آج تک آنکھ سے نہین دیکھا تھا۔"

لکھنؤ مین موسیقی کو اس قدر عروج ہو گیا تھا کہ بخلاف اور شہرون کے اُمرا اور دولتمندون کے یہان کے امرا ذوق صحیح رکھتے ہین۔ سمجھتے ہین۔ دُھنون راگون اور راگنیون کو پہچانتے ہین۔ اور دو ہی ایک تانین سُن کے سمجھ جاتے ہین کہ یہ گویا کس پائے کا ہے۔ معمولی گانے والا یہان کی صحبتون مین فروغ نہین پا سکتا۔ بازاری لوگ اور عموماً لڑکے جو سڑکون اور گذرگاہون مین گاتے پھرتے ہین۔ وہ بھی مختلف چیزون کو ایسے سچے سُرون مین ادا کرتے ہین کہ معلوم ہوتا ہے۔ راگنی اور سُر گلے مین اُتری ہوئی ہے۔ اکثر شہرون مین لوگ کثرت سے ایسے ملین گے جو شعرون کو موزون نہین پڑھ سکتے۔ بخلاف اسکے یہان

آپ کو ایسا جاہل ڈھونڈھے نہ ملے گا جو اشعار کو موزون نہ پڑھ سکتا ہو۔ دلیل ہے اس بات کی کہ لئے داری یہان کے بچے بچے کے رگ و پے مین سرایت کر گئی ہے۔ بعض اوقات کسی بازاری لڑکے کو بھیرون۔ سوہنی۔ بہاگ۔ یا کسی اور دھن مین ایسی خوبی سے گاتے سُنا گیا ہے کہ سُننے والے محو ہو گئے۔ اور بڑے بڑے گویّون کو اُن پر حسد آنے لگا۔

موسیقی کے سلسلے مین مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سازون اور آلاتِ موسیقی کا بھی حال بیان کر دین۔

موسیقی مین دو چیزین ہوتی ہین۔ سُر اور لَے۔ ان دونون چیزون مین بگڑتا گانے کا ناقابل عفو عیب ہے۔ لہذا ان دونون کی نگہداشت کے لیے دو ہی سازون کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ فی الحال سُر پہ رہنے کی مدد کے لیے سارنگی اور لَے پر قائم رہنے کی ضرورت سے طبلہ کام مین لائے جاتے ہین۔

سُرون کی مدد کے لیے ہندوستان کا پُرانا ساز بین تھی۔ جس مین ایک مجوّف چوبی نلی کے دونون سرون پر دو تونبیان لگائی جاتین۔ اور اُس پر ساتون سُرون کے سات تار کھینچدیے جاتے۔ جن کا نغمہ نلی کے اندر سے دونون جانب دوڑ کے دونون تونبیون مین گونجتا۔ مسلمان اپنے ساتھ رباب۔ چنگ اور سرود لائے۔ رباب خالص عربی باجا تھا جس نے عباسیہ کے دَور مین بہت ترقی کی تھی۔ چنگ اور سرود عجمی باجے تھے۔ ان مین سے چنگ بہت ہی پُرانا ساز ہے جس کا سراغ اسیریا۔ بابل۔ مصر۔ یونان اور روم غرض تمام اگلی قومون مین لگتا ہے۔ سرود خالص فارسی باجا تھا۔ جس کو عباسی دور کے مغنّیون نے اختیار کر کے بہت ترقی دی۔ ہندوستان مین آنے کے بعد جب ہندوون اور مسلمانون کے نغمون مین میل جول ہوا تو پہلے طنبورہ ایجاد ہوا جو در اصل بین کا اختصار اور صرف سُرون کے قائم رکھنے کا کام دیتا تھا۔ اور تنہا بجانے کی چیز نہ تھا۔ چند روز بعد امیر خسرو نے ستار ایجاد کیا جو در اصل بین اور طنبورہ دونون مین ایک آسان اور عام پسند تصرف تھا۔ لیکن بین ہو یا طنبورہ یا ستار رسگلے کا پورا ساتھ کوئی نہ دے سکتا تھا۔ یہ کمی دیکھ کے محمد شاہ رنگیلے کے دربار کے زبردست و نامور مغنی میان سارنگ نے

سارنگی ایجاد کی جو اُنھیں کی طرف منسوب ہے۔ سارنگی نے بین طنبورے اور ستارہ سب کو پیچھے ڈال دیا۔ اور رقص و سرود کی محفلوں میں ایسا رسوخ حاصل کیا کہ اُن اگلے سازوں کے بجانے والے بھی فنا ہو گئے۔ اُنھیں پرانے سازوں میں یہاں ایک قانون بھی تھا جسے یقیناً مسلمان شام و عراق سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُسکے بجانے والے بھی اب کہیں شاذ و نادر ہی نظر آتے ہیں۔ غرض عیش و طرب کی محفلوں سے سارنگی نے ان سب کو نکال دیا۔ اور ان قدیم سازوں کی یہ شان رہ گئی کہ اعلیٰ درجے کے اُستادوں میں کبھی کبھی کوئی ایک فنیاً نظر آ جاتا ہے جسے بین یا سرود۔ رباب یا قانون کے بجانے میں کمال حاصل ہوتا ہے۔ ستار نوجوانوں کے تفنن طبع کے لیے رہ گیا۔ جسے وہ بغیر گانے کے بجاتے اور سنتے ہیں۔ اور کبھی اُس کے ساتھ کوئی گانے بھی لگتا ہے۔

اب رہا طبلہ۔ یہ اگرچہ لے کے لیے بہت ہی لازمی چیز ہے مگر اس قسم کی کسی چیز کا پتہ دیگر ممالک کی پُرانی قوموں میں نہ تھا۔ لڑائی میں طبل جنگ بجتا۔ نوبت میں نقارہ بجایا جاتا۔ مگر ناچ گانے کے ساتھ سوا ہندوستان کے اور کہیں اس قسم کی کوئی چیز اگلے زمانے میں نہ تھی۔ سوا دف کے جو عربوں میں تھی۔ اور گانے کے ساتھ بجائی جاتی تھی۔ یہاں بھی گانے کے ساتھ سب سے پہلے دف کا رواج معلوم ہوتا ہے۔ جو بین کے ساتھ بجتی اور لے کے قائم رکھنے میں مدد دیتی۔ اس کے بعد قدیم الایام ہی میں مردنگ نکلی جو غالباً سری کرشن جی کے زمانے میں موجود تھی اور اُن کی بانسری کے نغمے کے ساتھ مردنگ کی گمک بھی جمنا کنارے برج کے جنگل میں سُنی جاتی تھی۔ مردنگ کے بعد ترقی یہ ہوئی کہ پکھاوج بنی جو اعلیٰ موسیقی کا خوب ساتھ دے سکتی تھی۔ اب اسکے بعد سے عام لوگوں میں اور گھر کی بیٹھنے والی عورتوں میں ڈھول کا رواج ہوا جو مردنگ اور پکھاوج سے نکل کے عام پسند ہو گئی۔ اور خاص باکمال موسیقی کی اعلیٰ محفلوں کے لیے طبلہ ایجاد ہوا جس میں پکھاوج کے دونوں رُخ دو جدا سازوں میں تقسیم ہو کے ڈہنا اور بایاں کے نام سے مشہور ہوئے۔ طبلہ یقیناً مسلمانوں کے آنے کے بعد کی ایجاد ہے۔ اگرچہ ہمیں نہیں معلوم کہ لے داری کے ان سازوں میں مذکورہ ترقیاں کب اور کس کے ہاتھ سے ہوئیں۔

(۲۳)

موسیقی کے ساتھ ناچ نے بھی ایک ممتاز فن کی حیثیت سے لکھنؤ میں بہت نمایان ترقی کی۔ رقص ہر قوم مین تھا۔ اور قدیم سے قدیم زمانے مین تھا۔ فراعنۂ مصر کے سامنے بانکی رسیلی عورتین کھڑی ہو کے سازکے ساتھ ناچا کرتی تھین۔ حضرت مسیح کے عہد مین بپتسما دینے والے یوحنا کا سر ہیرو ڈیا نے ناچ ہی کے کٹوایا تھا۔ مگر ہندوستان مین بہت صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ گانے کی طرح ناچنا بھی عبادت مین داخل تھا۔ اور یہان فن رقص کی پرورش ہمیشہ مذہب ہی کے آغوش مین ہوئی۔ چنانچہ اس فن کے جاننے اور کرنے والے خاص برہمن تھے۔ اور اُن کا مرکز یا تو اجودھیا اور بنارس کے کتھک تھے یا متھرا اور برج کے رہس دھاری۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان کے تمام قدیم مندرون مین اگرچہ سیکڑون ہزارون عورتین دیوتاؤن کی مورتون کے سامنے روز مجرا کیا کرتی تھین۔ اور جہان بڑے معبد تھے وہان قدیم سے قدیم زمانے مین ناچنے والیون کا ایک بڑا بھاری گروہ بھی موجود رہا کرتا تھا مگر ناچنے کی اُستادی ہمیشہ مردون مین رہی اور وہی جوان عورتون کو اُس کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

ناچنا دراصل حرکات جسمانی کے باقاعدہ بنانے کا نام ہے۔ حرکات کی اس باقاعدگی کو اگر بہت سے اشخاص کے حرکات کے موافق کیلان اور موزون بنانے سے تعلق ہو تو وہ ڈرل یا فوجی قواعد ہے۔ یا یورپ کے میوزک ہالون کا وہ ناچ ہے جو "بیلٹ" کہلاتا ہے۔ اور اب اکثر ہندوستان کے تھئیٹرون مین نظر آجایا کرتا ہے۔ اور اگر وہ حرکات کی باقاعدگی موسیقی کی لَے اور آواز کے نشیب و فراز کے موافق بنانے سے علاقہ رکھے تو وہ رقص ہے۔ ہندوستان کا اصلی خالص رقص یہی ہے کہ جسم کے حرکات و سکنات گیتون اور سُرون کے زیر و بم کے مطابق اور مناسب بنائیے جائین۔ یہ اصلی ناچ ہے جو ہندوستان مین ایک بہت بڑا وسیع فن بن گیا۔ اس کی سیکڑون گتین اور بیشمار توڑے اور ٹکڑے ایجاد ہو گئے۔ اس کے بعد رقص مین جذبات وخیالات کا اشارون اور حرکتون سے ادا کرنا بھی شامل کر لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کبھی گانا ناچنے کی شرح

بن جاتا ہے۔ پھر جب خوبصورت عورتون کا ناچنا لوگون کو فطرۃً زیادہ پسند آیا تو معشوقانہ ناز و انداز دکھانا۔ اور نزاکت و نازنینی کی اداؤن کا ظاہر کرنا بھی اس کا جُزو بن گیا۔ لکھنؤ کے اسکول نے انھین امور کا لحاظ کر کے زنانے اور مردانے طائفون مین امتیاز پیدا کر دیا۔ نزاکت کے ساتھ بتانا۔ معشوقانہ ناز و انداز دکھانا۔ اور ہر حرکت مین معشوقیت و نازنینی کا لحاظ رکھنا ناچنے والی عورتون کے ساتھ مخصوص رہا جو بعض وقت اگر بے مزہ ہو تو ناظرین کی طبیعتون کو سُست اور پست کر دیتا ہے۔ اس کے مقابل حرکات کو لَے کے مناسب بنانے مین چلت پھرت دکھانا اور شاعرانہ دلکشی سے اظہار جذبات کرنا۔ مردانے طائفون کے لیے خاص ہو گیا۔ اگرچہ دونون گروہ ایک دوسرے کے فن کا ایک مناسب حد تک ضرور لحاظ رکھتے ہین مگر یہ امتیاز نمایان طور پر قائم ہے۔

یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہین کہ اودھ اور لکھنؤ مین ارباب نشاط اور مجرا کرنے والی رنڈیون کے طائفون کا آ آ کے جمع ہونا نواب شجاع الدولہ ہی کے زمانے مین انتہائی درجے کو پہونچ گیا تھا۔ اُنکے علاوہ اجودھیا اور بنارس کے کتھک جو یہین یا قریب ہی موجود تھے قدر دانی دیکھ کے دربار کے مرکز کی طرف کھنچنے لگے۔ اور دونون کے میل جول سے رقص کا فن نمایان ترقی کرتے کرتے یہان خاص شان پیدا کرنے لگا۔

مرد ناچنے والون کے یہان دو گروہ ہین۔ ایک ہندو کتھک اور رہس دھاری۔ اور دوسرے مسلمان کشمیری بھانڈ۔ مگر اصلی ناچنے والے کتھک ہین۔ اور کشمیری طائفون نے معلوم ہوتا ہے اپنی نقالی کے کمالات مین جان ڈالنے کے لیے اپنے گروہ مین ایک ناچنے والا نو عمر لڑکا بڑھا لیا۔ جو بال بڑھا کے عورتون کا سا جوڑا باندھتا ہے۔ اور نہایت ہی پھرتیلے پن سے ناچ کے اپنی چلت پھرت سے محفل مین زندہ دلی اور تازگی پیدا کر دیتا ہے۔

ہندو کتھکون مین سے کوئی نہ کوئی باکمال ہر زمانے مین یہان موجود رہا۔ یہ لوگ اپنے فن کا بانی مہادیو جی۔ پاربتی جی۔ اور کنھیا جی کو بتاتے ہین۔ شجاع الدولہ اور آصف الدولہ کے عہد مین خوشی مہاراج ناچنے کا بڑا زبردست اُستاد تھا۔ نواب

سعادت علی خان - غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر کے دور میں ہلال جی پرکاش جی اور دیالو جی مشہور ناچنے والے تھے - محمد علی شاہ کے زمانے سے واجد علی شاہ کے عہد فرمان روائی تک پرکاش جی کے بیٹوں درگا پرشاد اور ٹھاکر پرشاد کے ناچ کی شہرت رہی - درگا پرشاد کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ناچ میں واجد علی شاہ کا اُستاد تھا - اُسکے بعد درگا پرشاد کے بیٹوں کالکا اور بندادین کی شہرت ہوئی - اور قریب قریب تمام لوگوں نے مان لیا کہ سارے ہندوستان میں ناچنے کا ان دونوں سے زیادہ صاحب کمال اُستاد کوئی نہیں ہے - پُرانے اُستاد کبھی خاص بات میں نمود حاصل کرتے تھے - مگر ان دونوں بھائیوں خصوص بندادین نے ناچ کے تمام فنون میں کمال دکھا کے اپنے آپ کو ہر حیثیت سے اُستادِ بے بدل ثابت کر دیا - اور آج کل کے اکثر مشہور ناچنے والے اُنھیں دونوں بھائیوں کے شاگرد ہیں - اور اُن کا گھر ہندوستان بھر کا سب سے بڑا رقص کا اسکول ہے -

کالکا تھوڑا زمانہ ہوا کہ مر گیا - اور سچ یہ ہے کہ اُس کے مرنے سے بندادین کے ناچ کا مزہ اُٹھ گیا - بندادین کی عمر اس وقت ۷۷ سال کی ہے - اور اب بھی ناچ کے شائق اُس کا مجرا دیکھنے کو اپنی زندگی کی ایک یادگار مسرت تصور کرتے ہیں - اُس کا گت پر ناچنا - رقص کے اُستادانہ توڑے اور ٹکڑے اصلی صورت میں دکھانا - گھونگھرو بجانے میں یہ اختیار اور قدرت ظاہر کرنا کہ جو گھونگھرو چاہے بجائے - اور اُسکے بعد ہر ہر لفظ اور ہر ہر چیز کو بتانا ایسی چیزیں ہیں جن کا بندادین ہی پر خاتمہ ہے - وہ ایک ایک چیز کو سو سو اداؤں - و ضعوں - نزاکتوں اور دلفریب اشاروں سے بتاتا ہے - اور اُس میں ایسی نازک خیالی اور جدت طرازی ہوتی ہے کہ دیکھنے والا جانتا نہ ہو تو سمجھ بھی نہیں سکتا - معمول تھا کہ بندادین بتاتا اور کالکا پاس کھڑے ہو کے اُس کی تشریح کرتا جاتا - اُس کی تشریح ہی سے لوگوں کو پتہ چلتا کہ بندادین اپنے فن میں کیسا کمال دکھا رہا ہے - ناچ میں اُسکے پاؤں اس نزاکت سے زمین پر پڑتے ہیں کہ مشہور ہے بعض اوقات وہ تلوار کی باڑھ پر ناچا اور مجال کیا جو تلوے میں چرکا آیا ہو -

(۲۴)

مرد ناچنے والون کا دوسرا گروہ بھانڈ ہین ۔ اُن کے طبرے کی شان یہ ہے کہ
کہ ایک نوخیز و خوش رُو لڑکا جس کے بال عورتون کی طرح لمبے ہوتے ہین رنگین
اور زرق برق کپڑے پہن کے اور پاؤن مین گھونگھر و باندھ کے ناچتا گاتا ہے ۔
اُس کے ساتھ کا سازنے مین ڈوبا ہوا اور دلون کو اُبھارنے والا ہوتا ہے ۔
اُسکے ناچ مین غیر معمولی چلت پھرت اور شوخی و چالاکی ہوتی ہے ۔ اور اُس کا
گانا بھی اسی رنگ اور مذاق کے مناسب ہوتا ہے ۔ ساتھ سجانے والون کے علاوہ
سات آٹھ یا اس سے زیادہ بھانڈ رہتے ہین جو اُسکے ناچ گانے پر واہ واہ کے
نعرے بلند کرتے ۔ متاثر ہو ہو کے تال دیتے ۔ اور اکثر خلاف تہذیب بے اعتدالیون
سے اُسکے حرکات و سکنات اور اُسکی اداؤن پر ہنسانے والے ریمارک کرتے
رہتے ہین ۔ اور جہان وہ لڑکا تھوڑی دیر گا چکا وہ سامنے آ کے نقلین کرتے
اور بذلہ سنجی و نقالی کا کمال دکھاتے ہین ۔

لکھنؤ مین اِن لوگون کے دو گروہ ہین ۔ ایک کشمیری جو کشمیر سے آئے ہین ۔ اور
دوسرے خاص یہان کے جن کا پیشہ ابتداءً کچھ اور تھا ۔ مگر اب نقالی اُن کا خاص
فن ہو گیا ہے ۔

نقالی اور خصوصًا رقص و سرود کے ساتھ نقالی ہندوستان کا بہت ہی
پُرانا فن تھا ۔ جو راجہ بکرماجیت کے دربار مین یعنی حضرت مسیح سے بھی پہلے بہت
ترقی پر تھا ۔ مگر اُسوقت اُس مین اعلیٰ درجے کے ڈراما دکھائے جاتے ۔ اور سچ
یہ ہے کہ وہ بہت ہی مہذب و شایستہ نقالی تھی ۔ ہندوستان کی ادنیٰ قومون
کی تفریحون مین آج تک معمول ہے کہ جب وہ لوگ خود ہی ناچتے گاتے ہین تو
اُنھین کے ساتھ مضحک نقلین بھی کرتے ہین ۔

مسلمانون کے زمانے مین دولت مغلیہ سے پہلے بھانڈون اور نقالون کا
پتہ نہین لگتا ۔ ممکن ہے کہ ہون اور اُس دور کے وقائع نگارون نے ان کو قابلِ
لحاظ نہ خیال کیا ہو ۔ مگر دولت مغلیہ کے زمانے مین بھانڈون نے خاص نمود
حاصل کر لی تھی ۔ اُن کا پتہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد سے ملتا ہے جب اُمراء

وسلاطین دہلی کو ملک گیری و ملک داری کی زحمتون سے چھٹی مل گئی تھی - اور صرف دربارداری وعیش پرستی کو اپنا آبائی حق تصور کرنے لگے تھے - مگر در اصل ان بھانڈون نے یہان کی سوسائٹی مین عجیب عجیب کام کیے - یہی یہان کے نیشنل سٹائرز ہین - اور انھون نے قریب قریب وہی کام کیے جو انگلستان مین اسپکٹیٹر اور ٹاٹلر نے کیے تھے - دہلی کا سب سے پہلا بھانڈ کریلا مشہور ہے - جو محمد شاہ کے عہد مین تھا - کسی بات پر ناراض ہوکے محمد شاہ نے حکم دیا کہ بھانڈون کو ہمارے ملک سے نکال دو - دوسرے دن بادشاہ کی سواری نکلی تو اوپر سے ڈھول بجنے اور بھانڈون کے گانے کی آواز آئی - تعجب سے سر اُٹھاکے دیکھا تو کریلا اور چند بھانڈ ایک کھجور کے درخت پر چڑھے ہوے ڈھول بجا بجا کے گا رہے تھے - سواری رکوا کے پوچھا "یہ کیا گستاخی ہے ؟ اور ہمارے حکم کی تعمیل کیون نہ ہوئی؟" عرض کیا "قبلۂ عالم - ساری دنیا تو جہان پناہ کے زیرنگین ہے جائین تو کہان؟ اس لیے عالم بالا کا ارادہ کیا - اور یہ پہلی منزل ہے" اس جواب پر بادشاہ اور جملہ مصاحبین ہنس پڑے - اور اُن کا قصور معاف کیا گیا -

لکھنؤ مین آنے کے بعد ان لوگون کی کچھ ایسی قدر ہوئی کہ ان طائفون کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی قرار پاگیا - جہان تک مجھے معلوم ہے فی الحال دہلی مین بھانڈ نہین ہین - اور ہون تو بہت ہی کم اور گمنام ہین - ہان بریلی مین پرانے زمانے سے بھانڈون کے طائفے موجود ہین - اور اکثر لکھنؤ کے ڈوم ڈھاری بھی بریلی سے آئے ہین - جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوانین روہیلکھنڈ بھی موسیقی اور ارباب نشاط کے قدردان تھے - جن کی فیاضی سے بریلی و مرادآباد مین ان لوگون کا نشو ونما اچھی طرح ہوا - اور وہان سے بھی صاحب کمال ڈھاڑی اور نقال لکھنؤ مین آئے - اگرچہ اب اُن کا اصلی مرکز لکھنؤ ہی بنا ہوا ہے -

اُن کے لطیفے - نوک جھونک کے فقرے - اور نقالی کے عجیب کمالات لکھنؤ مین مشہور ہین - نواب سعادت علی خان کے اشارے سے اُسوقت کے سب سے بڑے بانکے کے سامنے جو چوٹ کرتا ہوا فقرہ ایک بھانڈ نے کہا تھا اس سے پہلے ہم اپنے ناظرین کو سُنا چکے ہین - اُسی زمانے کا ایک یہ واقعہ بھی یادگار رہے گا

کسی رئیس نے انعام مین دوشالہ دیا۔ مگر وہ دوشالہ بوسیدہ اور پُرانا تھا۔ ایک نقال نے ہاتھ مین لے کے اُسے غور سے دیکھنا شروع کیا۔ اور اُس پر بہت ہی گہری نظرین جما دین۔ دوسرے نے پوچھا "دیکھتے کیا ہو؟" کہا "دیکھتا یہ ہون کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے" پوچھا "آخر کیا لکھا ہے؟" عینک نکال کے لگائی۔ اور اٹک اٹک کے بڑی مشکلون سے پڑھا "لا الہ الا اللہ" پوچھا "بس اتنا ہی؟ محمد رسول اللہ نہین لکھا؟" جواب دیا "محمد رسول اللہ کیسے لکھا ہو۔ یہ تو ہمارے حضرت سے پہلے کا ہے"۔

لکھنؤ کے ایک نواب صاحب "گڑھیّا والے نواب" مشہور تھے۔ اس لیے کہ اُنکے مکان کے قریب ایک گڑھیّا تھی۔ اُنھین کے وہان کسی تقریب مین محفل رقص و سرود تھی۔ ایک بھانڈ گھبرایا ہوا انکے سامنے آیا اور سب ساتھیون سے کہا "اُٹھو اُٹھو تعظیم کرو"۔ سب نے کہا "کس کی تعظیم کرین؟ کوئی ہے بھی؟" بولا "نواب صاحب آتے ہین" اور یہ کہ کے ایک ہانڈی جو کھولی تو ایک بڑا سا مینڈک اُچھل کے بیچ محفل مین بیٹھ گیا۔ اور سب سے کہنا شروع کیا "جلدی اُٹھو جلدی اُٹھو"۔ ساتھیون نے حیران ہو کے پوچھا "آخر کس کے لیے اُٹھین؟" کہا "تم نے پہچانا نہین۔ آپ گڑھیّا کے نواب ہین"۔

اُن لوگون کی نسبت مشہور تھا کہ جسکے وہان جا کے ناچتے اُس کی نقل ضرور کرتے اور ممکن نہ تھا کہ اُس پر چوٹ نہ کرین۔ اور سچ یہ ہے کہ جیسی جیسی خوبصورتی سے ان لوگون نے اُمرا و رؤسا کو سبق دیے ہین اور اُن کی لغزشون پر اُنھین متنبہ کیا ہے اور کسی طرح ممکن ہی نہ تھا۔ اسی طرح نقالی مین جس کی نقل کرتے اُسکا ایسا مکمل بہروپ بھرتے اور ایسا سچا کیرکٹر دکھاتے کہ لوگ عش عش کر جاتے۔ آج کل انگریزون کی صحبت مین جس طرح "بابو انگلش" کا مضحکہ اُڑا کرتا ہے اُن دنون کا یتھون کی فارسی آمیز اُردو کا مضحکہ اُڑا کرتا تھا۔ اُنکی نقل اور دیوان جی کا کیرکٹر ایسا اعلیٰ درجے کا یہ بھانڈ دکھایا کرتے تھے کہ لوگ محو حیرت ہو جاتے۔ یہان دوسرا کربلا بھانڈ نصیر الدین حیدر کے زمانے تک موجود تھا۔ اُسکے بعد سجن تائم۔ دائم۔ رحیمی۔ نوشاہ۔ بی بی قدر وغیرہ کی شہرت ہوئی۔ علی نقی خان مع

اپنی بی بی کے جن کا بہت کچھ دَور دَورا تھا قائم کی سبیل دیکھنے کو آئے جسے وہ خوب سجتا اور شربت پلا یا کرتا تھا - ان معزز زائرون کو دیکھتے ہی قائم سامنے آگیا اور ہاتھ جوڑکے کہا "خدا نواب صاحب کو سلامت اور بیگم صاحب کو قائم رکھے!" اتنا سخت فقرہ تھا مگر نواب اور بیگم دونون کو انعام ہی دیتے بنی۔ قائم کا کمال یہ تھا کہ ایک مرتبہ ساڑھے تین گھنٹے تک فقط طرح طرح کے مُنہ بناتا رہا۔

آخر زمانے مین فضل حسین - کھلونا - بادشاہ پسند - کیا خوب کے طائفے بہت مشہور رہے - اب بھی علی جان غنیمت ہے - یہ اُن طائفون کے ناچنے والون کے نام ہین جنھون نے رقص مین بڑی ناموری حاصل کی تھی - اور جو اب نہ رکھتے تھے -

مگر لکھنؤ کی سوسائٹی پر ان سب لوگون سے زیادہ اثر ڈومنیون کا پڑگیا تھا - تمام قصبات اور کُل شہرون مین شادیون مین گانے والی میراثنین اور ڈھاکنین مدت ہاے دراز سے ہوتی آئی ہین - جن کی وضع ڈفالیون کی طرح ہمیشہ یکسان رہی مگر ڈومنیون نے لکھنؤ مین عجیب نمایان ترقی کی - ڈھول کو چھوڑکے اُنھون نے رنڈیون اور مردانے طائفون کی طرح طبلہ سارنگی اور مجیرے اختیار کیے - صرف گانے کی حد سے ترقی کرکے ناچنا شروع کیا - اور اسی پر کفایت نہ کی بلکہ بھانڈون کی طرح زنانی محفلون مین نقلین بھی کرنے لگین - شادی کی تمام رسمون کا وہ سب سے بڑا عنصر بن گئین - اور دولتمند گھرانون کی بیگمون کو ایسا گرویدہ کرلیا کہ کوئی محل اور کوئی ڈیوڑھی نہ تھی جس مین ڈومنیون کا کوئی طائفہ نوکر ہو - اُن مین سے اکثر گانے اور ناچنے مین بےمثل ہوتی تھین - اور ایسے نور کے گلے پائے تھے کہ زنانی محفلین مردانی محفلون سے زیادہ شاندار اور حد درجہ دلکش و پُرلطف ہوگئین - خصوصاً محفلون مین اُنکی شوخیان اور جدت طرازیان ایسی دلفریب ہوتی تھین کہ مردون کو اکثر تمنا رہتی تھی کہ کسی طرح ڈومنیون کا مُجرا دیکھنے کا موقع ملے - اس لیے کہ ڈومنیان مردانی صحبتون مین گانا ناچنا کسی طرح گوارا نہ کرتی تھین - اب بھی ڈومنیان کثرت سے موجود ہین - اور اُسی شان وضع

پر ہیں۔ مگر کمال اُٹھ گیا۔ جسیی حسیی نامی لے دار اور گلے باز ڈومنیان لکھنؤ مین گذر گیئن ویسے گویے بھی کہین نہ پیدا ہوے ہون گے۔

(۴۵)

ناچنے کی اُستادی اگرچہ مردون ہی مین مخصوص ہے مگر علی العموم حسن وسعت اور تعمیم کے ساتھ گانے والی رنڈیون نے اس فن کو ترقی دی مردون سے ممکن نہین۔ ناچنے کو عورتون کے ساتھ خصوصیت اور موزونیت بھی زیادہ ہے یہ چیز ایک حد تک ہندوستان کے ہر شہر مین نظر آئے گی۔ مگر جیسی باکمال ناچنے اور بتانے والی رنڈیان لکھنؤ مین پیدا ہوئین شاید کسی شہر مین نہ ہوئی ہونگی۔ آج سے چالیس سال پیشتر لکھنؤ کی ایک مشہور رنڈی "منصرم والی گوہر" نے کلکتے مین جاکے نمود حاصل کی تھی مین نے ایک محفل مین اُس کا یہ رنگ دیکھا کہ کامل تین گھنٹے تک ایک ہی چیز کو ایسی خوبی سے بتاتی رہی کہ حاضرین محفل (جن مین مٹیا برج کے تمام باکمال ڈھاڑی اور معزز لوگ موجود تھے) اول سے آخر تک محو حیرت وسکوت تھے۔ اور کوئی بچہ بھی نہ تھا جو ہمہ تن غرق نہ ہو۔ زہرہ ومشتری شاعرہ اور صاحب کمال گانیوالیان ہی نہین بے نظیر رقاصہ بھی تھین۔ جدّن نے ایک مدت تک زمانے کو اپنے رقص وسرود کا گرویدہ رکھا ہے۔

یہان کی رنڈیان عموماً تین قومون کی تھین۔ اول کنچنیان جو اصلی رنڈیان تھین اور اُن کا پیشہ علی العموم عصمت فروشی تھا۔ دہلی اور پنجاب انکے اصلی مسکن تھے۔ جہان سے اُنکی آمد شجاع الدولہ ہی کے زمانے سے شروع ہوگئی۔ شہر کی نامی رنڈیان اکثر اسی قوم کی ہین۔ دوسرے چونے والیان۔ اُن کا اصلی کام چونا بیچنا تھا مگر بعد کو بازاری عورتون کے گروہ مین شامل ہوگیئن۔ اور آخر مین انھون نے بڑی نمود حاصل کی۔ چونے والی حیدر جس کے گلے کا شہرہ تھا اور سمجھا جاتا تھا کہ اُسکا سا گلا کسی نے پایا ہی نہین اسی قوم کی تھی۔ اور اپنی برادری کی رنڈیون کا بڑا گروہ رکھتی تھی۔ تیسری ناگرنیان۔ یہ تینون وہ شاہدان بازار ہین جنھون نے اپنے گروہ قائم کرلیے ہین اور برادری رکھتی ہین ورنہ بہت سی اور قومون کی عورتین بھی آوارگی مین پڑنے کے بعد اسی گروہ مین

شامل ہو جاتی ہین -

گویون اور ناچنے والون کے بعد یہان اُسی نوعیت کا ایک اور گروہ بھی ہے جس کا نشو و نما لکھنؤ مین بہت ہوا - اور اُسے لکھنؤ کے ساتھ مخصوص کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو گا - وہ رہس والے ہین - رہس خاص متھرا اور برج کا فن ہے وہین کے رہس دھاریون نے آ کے لکھنؤ کو اُس کا شوق دلایا -

واجد علی شاہ کو جب رہس پسند آیا تو اُنھون نے اپنے مذاق اور اپنے خیالی پلاٹ کا ایک نیا رہس تیار کیا - اُسکو دیکھتے ہی رعایا مین اس بات کا خاص شوق پیدا ہوا کہ عاشقانہ قصے جو اُن دنون پریون کے حسن و عشق سے زیادہ وابستہ تھے عملی صورت مین دکھائے جائین - پبلک کا یہ رجحان دیکھ کے میان امانت نے جو رعایت لفظی مین کمال رکھنے والے ایک مشہور شاعر تھے اپنی اندر سبھا تصنیف کی - جس مین ہندوون کی دیو مالا مین مسلمانون کے فارسی مذاق کی آمیزش کا پہلا نمونہ نظر آیا -

یہ اندر سبھا جیسے ہی شہر مین دکھائی گئی ہر شخص والہ و شیدا ہو گیا - یکایک بیسیون سبھائین شہر مین قائم ہو گئین - اور دیکھتے ہی دیکھتے اُن کا اس قدر رواج ہوا کہ گویون اور ناچنے والی رنڈیون کا بازار چند روز کے لیے سرد پڑ گیا - اب امانت کے سوا اور بہت لوگون نے نئی سبھائین بنانا شروع کین - جن مین اُردو شاعری چاہے بگڑتی ہو مگر زبان منجتی اور پورب کی دیہاتی اور ہندو اہل حرفہ کی آبادی مین سرایت کرتی جاتی تھی - اس مذاق نے ڈراما اور تھیٹر کی مضبوط بنیاد ڈال دی تھی - اور اگر چند روز اور شاہی کا دَور رہتا تو بہت اچھے اصول پر خالص ہندستانی ناٹک ایک خاص صورت پیدا کر لیتا جو بالکل اچھوتی اور ہندوستانی مذاق مین ڈوبی ہوتی -

مگر یکایک مہذب سوسائٹی کو جس مین پرانی موسیقی گھر کر چکی تھی ان کھیلون مین ابتذال نظر آیا - فن موسیقی کے شوق نے شرفا کو پھر گویون اور مجرا کرنیوالے طائفون کی طرف متوجہ کر دیا - اور یہ چیزین جو ناٹک کی شان رکھتی تھین عوام الناس اور بازاری لوگون ہی تک محدود رہ گئین - مگر اسگلے ذوق نے شہر مین

اُس مذاق کو عملی صورت مین دکھانے والا ایک خاص گروہ پیدا کر دیا جن کو آج کل کی اصطلاح مین ایکٹر کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ ہمارے یہ ایکٹر پہلے تو مہذب سوسائٹی کی قدردانی سے زبان اُردو مین ترقی کرتے جاتے تھے۔ مگر چونکہ اُن کا شمار ادنیٰ درجے کے بازاری لوگون مین رہ گیا ہے اسلیے وہ مہذب زبان چھوٹ گئی۔ بازاری زبان مین آج کل بھی یہ لوگ بیسیون طرح کے پرفارمنس دکھاتے ہین۔

ہمارے ان ایکٹرون کے مبتذل ہو جانے کا سب سے بڑا سبب یہ ہوا کہ بمبئی کے پارسیون نے انگریزی مذاق کے تھیٹر کھڑے کیے۔ جن مین سچ یہ ہے کہ نہ فن موسیقی ہی تھا اور نہ صحیح ایکٹ۔ مگر اُن کی صفائی۔ ترتیب۔ طلسم نمائی۔ اور اُنکے زرق برق پردون نے ہمارے قومی ڈراما کا جو ایک بچے کی طرح ہنوز گہوارے مین تھا گلا گھونٹ دیا۔ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگ ناٹکون کی شاندار ی پر فریفتہ ہو کے صحیح مذاق کو بھول گئے۔

سچ یہ ہے کہ بمبئی کے تھیٹرون نے ہندوستان کو بلحاظ فنون رقص وسرود کے بیحد نقصان پہونچا دیا۔ سب سے پہلے موسیقی کو تباہ کیا۔ اور ایسی وضع کے بے اصول نغمون کو اختیار کرکے بازارون مین پھیلا دیا جن سے زیادہ مہمل کوئی چیز نہین ہو سکتی۔ اس کے بعد اُس نے ہمارے رقص کو جو بہت ہی اعلیٰ درجے کا فن تھا مٹانا چاہا۔ اور اپنے اسٹیج پر ناچ کے نام سے یورپ کے "ڈرل" کو رواج دیا۔ جس مین چند لڑکے اپنی ترتیب اور وضع بدل کے دلچسپی پیدا کرلیا کرتے ہین۔ لیکن رہس والون کا موسیقی اور ایکٹ اگرچہ دونون ناقص ہین مگر وطنی رنگ مین ڈوبے ہین اور قومی مذاق رکھتے ہین۔ اُن کے چھوڑنے کی نہین بلکہ اُن کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

(۲۶)

موسیقی ہی کے سلسلے مین سوزخوانی کے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ اس نئے مذہبی فن کو گانے بجانے کے خلاف شرع فنون مین داخل کرنا بے ادبی ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ سوزخوانی ایک خاص قسم کی موسیقی ہی ہے۔ محرم مین

شہادت سبط اصغر علیہ السلام کی یاد تازہ کرنا ہندوستان مین خاص شیعون سے شروع ہوا - خصوصاً اُسوقت سے جبکہ مذہب اثنا عشری ایران کا قومی مذہب بنا اور وہان کے لوگ آآکے ہندوستانی دربار مین رسوخ حاصل کرنے لگے - تاہم دہلی مین چونکہ تاجدارون اور شاہی خاندان کا مذہب سنت وجماعت تھا اس لیے وہ خاص چیزین جو شیعون کے مذہبی معاشرت کے ساتھ مخصوص تھین وہان نشو ونما نہ پاسکین - اس لیے اُن فنون کی پرورش کا گہوارہ شہر لکھنؤ اور اُس کا اگلا شیعہ دربار قرار پاگیا -

جس طرح مذہبی سرگرمی نے شاعری مین مرثیہ گوئی اور تحت اللفظ خوانی کو پیدا کیا اُسی طرح موسیقی مین سوزخوانی پیدا کردی - پھر ان دونون فنون کو یہان تک ترقی دی کہ مستقل فن بن گئے - اور ایسے فن جو ابتدا سے انتہا تک لکھنؤ ہی کے ساتھ مخصوص ہین - تحت اللفظ خوانی مرثیون کا متانت اور بےتکلفی کے ساتھ اس طرح پڑھنا اور بتا بتا کے سُنانا ہے جس طرح شاعر مشاعرے مین اپنی غزل سُناتا ہے - اور سوزخوانی اُن کو پُرسوز وگداز نغمے کے ساتھ سُنانا ہے

اصلی اور پُرانی مرثیہ خوانی سوزخوانی ہی تھی - یعنی مرثیے مجلسون مین ہمیشہ نغمے کے ساتھ سُنائے جاتے تھے - اور اُن کا رواج دہلی ہی نہین ہندوستان کے اُن تمام شہرون مین تھا جن مین حضرات شیعہ آباد تھے - مدراس اور دکن تک مین زور وشور سے اُس قسم کی مرثیہ خوانی ہوتی تھی - اور ڈیڑھ دو سو برس کے تصنیف کیے ہوے نوحے آج تک موجود ہین - مرثیون کو شاعرون کی شعرخوانی کے لہجے مین ادا کرنا خاص لکھنؤ کی ایجاد ہے - اور اس مین میر انیس اور مرزا دبیر وغیرہ نے جو کمالات دکھائے اُن کا ذکر ہم شاعری کے سلسلے مین کرچکے ہین -

سوزخوانی اگرچہ پہلے سے تھی اور ہرجگہ تھی مگر اُس مین بھی لکھنؤ کے سوزخوانون نے ایسے ایسے کمال دکھائے کہ اس فن کو بھی اپنے ساتھ مخصوص کرلیا - سارے ہندوستان کی اگلی سوزخوانی کا اندازہ اس مثل سے ہو سکتا ہے کہ "بگڑا گویا مرثیہ دان" لکھنؤ نے سوزخوانی کا پایہ اس قدر بلند کردیا کہ صاحب کمال گویون کا دار بھی سوزخوانون کے آگے سرد پڑ گیا -

لکھنؤ مین سوز خوان دیگر اہل فن کی طرح نواب شجاع الدولہ کے ساتھ یا اُنکے عہد مین آئے۔ تاریخ فیض آباد مین لکھا ہے کہ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ کے محل مین مجلسین ہوتین۔ اور جواہر علی خان خواجہ سرا جو اُن کی ڈیوڑھی اور سارے علاقے کا مختار تھا مرثیہ خوانون کی نوحہ خوانی سُنا کرتا۔ مگر اُسوقت تک یہان کی سوز خوانی وہی تھی جو ہر جگہ عام تھی۔

بعض لوگ کہتے ہین کہ خواجہ حسن مودودی سے یہ فن شروع ہوا۔ وہ مصنف نغمات الآصفیہ کے اُستاد تھے اور باوجود عطائی ہونے کے فن موسیقی مین ایسا کمال رکھتے تھے کہ دُور دُور تک کہین اُن کا جواب نہ تھا۔ اگرچہ سُنی المذہب تھے مگر اُنھون نے موسیقی کی خاص خاص دُھنین سوزون مین قائم کر کے اپنے شاگردون کو بتائین اور اس فن کے باضابطہ و باقاعدہ بننے کی بنیاد پڑ گئی۔ اسکے بعد جب بڑے حیدری خان کا زمانہ آیا تو اُن کا معمول تھا کہ محرم مین اپنے مذاق کی مناسب دھنون مین نوحہ خوانی کیا کرتے۔ چونکہ وہ بہت بڑے صاحب کمال گویے تھے۔ اور دربار قدردان تھا اس کوشش مین اُن کو نمایان کامیابی حاصل ہوئی اور پتہ لگ گیا کہ اگر ترقی دی جائے تو یہ فن جداگانہ طور پر ایک خاص اور ممتاز شان پیدا کر سکتا ہے۔ موسیقی کی ہزارہا دھنون مین سے وہ دُھنین منتخب کی گئین جو اظہار حزن و ملال اور بین کے لیے مناسب ہون۔ اور وہ صدہا سوزون مین قائم کی گئین۔ آخر مین حیدری خان نے اپنی سوز خوانی سید میر علی صاحب کو سکھا دی جو ایک شریف النسل سیدزادے تھے۔ اور اُنھون نے مذہبی جوش مین اس فن کو بہت زیادہ ترقی دی۔ اور اپنے زمانے مین اتنے بڑے صاحب کمال مشہور ہوے کہ نواب سعادت علی کے عہد مین اُنھون نے کسی بات پر برہم ہو کے لکھنؤ سے چلے جانے کا ارادہ کیا تو انشاء اللہ خان نے اپنے موثر شاعرانہ انداز اور تمسخر کی شان سے سفارش کی۔ اور نواب نے دلدہی و قدردانی کے ساتھ اُنھین رُوکا۔

اس کے بعد تانسین کے خاندان کا ایک گویا ناصر خان لکھنؤ مین آیا اور جب دیکھا یہان سوز خوانی کی طرف لوگون کا توغل دیکھا تو اُس نے بھی اپنے موسیقی کے کمال

کو نوحہ خوانی مین صرف کرکے مقبولیت و شہرت حاصل کی۔ اور آپ ہی کے باپ بالپ کھنؤ کی ایک مفلس و بیوہ سیدانی پر ترس کھا کے اُن کے دو بچون میر علی حسن اور میر بندہ حسن کو سوزخوانی کی تعلیم دی۔ ان دونون کا کمال تمام اسبق اُستادون سے بڑھ گیا۔ اور سوزخوانی مین بے عدیل و نظیر ثابت ہوے۔ اُنھون نے سوزخوانی کو اعلیٰ درجے کا راگ بنا دیا ہے۔ یہان تک کہ موسیقی کے اصلی راگون کے بول تو اکثر گویون تک کو یاد نہین مگر ایسے سوز اکثر سوزخوانون کو یاد ہین جو راگون کے بول ہین جن کو سُن کے حقیقی راگ اور سچی دُھنین متاثر طور پر سمجھ لی جا سکتی ہین۔

انھین بزرگون کی وجہ سے لکھنؤ مین سوزخوانی کا فن گویون سے نکل کے شرفا مین آ گیا۔ اور کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہونے لگے جو ڈوم ڈھاری نہین شریف و وضیع ہین۔ مگر سوزخوانی مین ایسا کمال رکھتے ہین کہ گویون کا بازار اُن کے سامنے سرد پڑ گیا ہے۔

فی الحال منجھو صاحب اور دو ایک اور بزرگ سوزخوانی مین ایسا کمال اور ایسی شہرت رکھتے ہین کہ ہندوستان بھر مین ہر جگہ اُنکے استقبال مین شوق کی آنکھین بچھائی جاتی ہین۔ اور دیگر بلاد کے لوگون کی قدردانی ماہ محرم اور عزاداری کے خاص ایام مین ہمیشہ اُنھین شایقین لکھنؤ کے ہاتھ سے چھین لیا کرتی ہے۔

سب سے زیادہ اثر اس مذاق نے لکھنؤ کی عورتون پر ڈالا۔ سوزون کی موثر اور دل کو پاش پاش کر دینے والی دُھنین میر علی حسن اور میر بندہ حسن کے ہین۔ موسیقی مین اُن کے کمال کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مرہٹون کی دست برد کے زمانے مین وہ میانے مین سوار لکھنؤ سے اٹاوے کی طرف جا رہے تھے۔ راستے مین کسی گانون مین گذر ہوا اور سُنا گیا کہ اُس گانون پر مرہٹے تاخت کرنے والے ہین۔ کہا رون نے جو بہت دور سے اُنھین لیے چلے آتے تھے یکایک میانہ رکھ دیا اور کہا ہم مین اب آگے چلنے کی طاقت نہین ہے۔ ہزار کہا گیا کہ یہ مقام خطرناک ہے مگر اُنھون نے ایک نہ سُنی۔ خواجہ صاحب نے زندگی سے مایوس ہو کے وضو کیا اور عصر کی نماز پڑھی اور بیٹھے بیٹھے کچھ الاپنا شروع کیا اور اُس کا کہارون پر اس قدر اثر پڑا کہ تازہ دم ہو گئے اور امن کی جگہ پہونچا دیا۔

گلے سے مسدہا شریف مردون کے گلے مین اُترین اور اُن کے ذریعے سے ہزارہا شریف شیعہ خاندانون کی عورتون کے نورکے گلون مین اُترگئین - عورتون کو فطرۃً گانے بجانے کا زیادہ شوق ہوتا ہے - اور اُن کے گلے نغمون کے لیے عموماً زیادہ موزون ہوا کرتے ہین - یہ با اصول اور باقاعدہ نوحہ خوانی عورتون مین پہونچی تو اُس مین قیامت کی دلکشی پیدا ہو گئی - اور چند روز مین شیعہ ہی نہین ادنے طبقے کی سنیون کی عورتون مین بھی نوحہ خوانی کا شوق پیدا ہو گیا - اور یہ حالت ہو گئی کہ محرم مین اور اکثر مذہبی عبادتون کے ایام مین لکھنؤ کے گلی کوچون مین تمام گھرون سے پُرسوز وگداز تانون اور دلکش نغمون کی عجیب حیرت انگیز صدائین بلند ہوتی ہین - اور کوئی مقام نہین ہوتا جہان یہ سمان نہ بندھا ہو - آپ جس گلی مین کھڑے ہو کے سننے لگیے ایسی دلکش آوازین اور ایسا سیاست و تجوید کرنے والا نغمہ سننے مین آجائے گا کہ آپ زندگی بھر نہین بھول سکتے - ہندوون اور بعض خاص خاص سُنیون کے مکانون مین تو خاموشی ہوتی ہے - باقی جدھر کان لگائیے نوحہ خوانی کے قیامت خیز نغمون ہی کی آوازین آتی ہوتی ہین -

تعزیہ داری چونکہ نوحہ خوانی کا بہانہ ہے - اس لیے سُنّی اور شیعہ دونون گروہون کے گھرون مین نوحہ خوانی کے شوق مین تعزیہ داری ہونے لگی - اور سُنّی مسلمان ہی نہین ہزارہا ہندو بھی تعزیہ داری اختیار کرکے نوحہ خوانی کرنے لگے - جس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ لکھنؤ مین تعزیہ داری کے بہت زیادہ بڑھنے اور فروغ پانے کا زبردست باعث نوحہ خوانی ہے -

لکھنؤ مین بعض شریف شائستہ اور تعلیم یافتہ عورتین ایسی اچھی سوز خوان ہین کہ اگر پردے کی روک نہ ہوتی تو مرد سوز خوان اُنکے مقابلے مین ہرگز فروغ نہ پا سکتے - اس کو بہت مدت ہوئی کہ ایک سال چہلم کے موقع پر چند احباب کے ساتھ مین تال کٹورے کی کربلا مین گیا تھا اور وہین ایک خیمے مین شب باش ہوا تھا - دو بجے رات کو یکایک آنکھ کھلی تو ایک ایسے دلکش نغمے کی آواز کان مین آئی جس نے سب دوستون کو جگا کے بیتاب کر دیا - ہم سب اُس آواز کے شوق مین خیمے سے نکلے - اور دیکھا کہ آخر شب کا سناٹا ہے - چاندنی کھیت کیے ہوئے ہے

اور اُس میں عورتوں کا ایک غول تعزیہ لیے ہوے آرہا ہے۔ سب بال کھولے اور سر برہنہ ہیں۔ بیچ میں ایک عورت شمع ہاتھ میں لیے ہے۔ اس کی روشنی میں ایک حسین سرو قد نازنین چند اوراق میں سے پڑھ پڑھ کے نوحہ خوانی کر رہی ہے اور کئی اور عورتیں اُس کے ساتھ گلے بازی کر رہی ہیں۔ اُس سناٹے۔ اُس وقت اُس چاندنی۔ اُن برہنہ سر حسینوں۔ اور اُس پُرسوز و گداز نغمے نے جو سماں پیدا کر رکھا تھا اُس کو میں بیان نہیں کر سکتا۔ نازک اداؤں کا یہ مجمع جیسے ہی کربلا کے پھاٹک میں داخل ہوا اُس سرو قامت نازنین نے پرچ کی دھن میں یہ نوحہ شروع کیا۔

جب کاروانِ شہر مدینہ لُٹا ہوا پہونچا قریب شام کے قیدی بنا ہوا
نیزے پہ سر حسینؑ کا آگے دھرا ہوا اور پیچھے پیچھے بیبیوں کا سر کھُلا ہوا

اس مناسب حالت مرثیے نے یکایک ایسا سماں باندھ دیا کہ شبہہ ہوتا تھا کہ ان اشعار کے ذریعے سے وہ خاتون واقعۂ کربلا کی تصویر کھینچ رہی ہے۔ یا خود اپنے اس ماتمی جلوس اور اپنے داخلۂ کربلا کی۔

اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی عورتوں اور اُن کے ساتھ مردوں پر بھی سوز خوانی و عزاداری نے جو نمایاں اثر ڈالا ہے اور کسی چیز نے نہیں ڈالا۔ اسکی پہلی برکت تو یہ ہے کہ تمام عورتیں بہت اچھی گلے باز ہو گئیں۔ اور موسیقی کے سچے اصول کے ساتھ نوحہ خوانی کرنے لگیں۔ دوسری برکت یہ ہے کہ سارے اہل شہر کو عام اس سے کہ مرد ہوں یا عورت موسیقی کے ساتھ مناسبت ہو گئی۔ یہ جو لکھنؤ کے گلی کوچوں میں دیکھا جاتا ہے کہ ادنیٰ درجے کے لڑکے اور بازاری لوگ اکثر چلتے چلتے گانے لگتے۔ اور گانے میں ایسی گلے بازی کرتے اور مشکل سے مشکل دھنوں کو اس آسانی سے اُڑا لیتے ہیں کہ باہر کے لوگوں کو حیرت ہو جاتی ہے۔ اس کا اصلی باعث یہ نوحہ خوانی و سوز خوانی کا مذاق ہے۔ اور تعریف کی بات یہ ہے کہ سوز خوانی کا نشو و نما باوجود عوام الناس اور ادنیٰ درجے کے جہلا میں پھیلنے کے صحیح اصول پر رہا اور موسیقی کے صحیح مذاق سے باہر نہیں ہونے پایا بخلاف اور چیزوں کے جو عوام میں پہونچتے ہی بے قاعدہ اور خراب ہو جایا کرتی

سوز خوانی کو گو کہ عوام شیعہ موجب ثواب تصور کرتے ہین - مگر علماے شیعہ نے
اسوقت تک اسکے جواز کا فتوے نہین دیا ہے - وہ پابندی شرع مین متشدد ہین
اب تک مجتہدین اور ثقہ لوگون کی مجلسون مین صرف حدیث خوانی یا تحت اللفظ
خوانی ہوتی ہے - اور عوام کی جن مجالس مین علماے شریعت شریک ہوتے ہین
اُن مین بھی اُن کے سامنے سوز خوانی نہین ہوتی - لیکن اس سے انکار نہین
کیا جا سکتا کہ سوز خوانی نے اپنی عام مقبولیت کی وجہ سے علما کے فتوون پر پوری
فتح پا لی ہے - مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کے علماے حدیث اور مشائخ صوفیہ کے
نزدیک تو غنا کے جواز کی بہت گنجایش ہے - مگر شاید فقہ اثنا عشری مین اتنی
گنجایش نہین - ورنہ اس فن نے اب تک سند جواز حاصل کر لی ہوتی -

(۲۷)

ارباب نشاط اور فن موسیقی اور اُس سے نکلے ہوے فنون کے متعلق ہم بہت
کچھ بیان کر چکے ہین - لیکن اسی سلسلے مین بازاری باجون کا حال بیان کرنا
باقی ہے - لہذا آج ہم یہ بتلاتے ہین کہ اُن باجون پر لکھنؤ کا کیا اثر پڑا - اور اسی
پر ہم موسیقی کی بحث ختم کر دین گے - باجون کے جوڑ جو شادی وغیرہ کے جلوسون
کے ساتھ جاتے ہین چھ طرح کے ہین - (۱) ڈھول تاشے - (۲) روشن چوکی
(۳) نوبت (۴) تُرہی اور قرنا - (۵) ڈنکے اور نگل (۶) انگریزی باجا جو
ارگن باجا کہلاتا ہے اور روز بروز زیادہ رواج پاتا جاتا ہے -

پہلا یعنی ڈھول تاشا ہندوستان کا قدیم نیشنل باجا ہے جس کا انگریز "انڈین
ٹام ٹام" نام رکھ کے اپنی عدم واقفیت اور جہالت سے مضحکہ اُڑاتے ہین -
۱۸۹۶ء مین جب انگلستان کی نمایشگاہ "ارلس کورٹ" مین ہندوستانی معاشرت
اور یہان کے فنون و مشاغل کے صدہا نمونے دکھائے گئے تھے تو وہان اس باجے
کا نمونہ مین نے خود اپنی آنکھ سے یہ دیکھا کہ ایک نہایت ہی سیاہ فام شخص جسکے
پنڈے پر سوا ایک میلے لنگوٹے کے کچھ نہ تھا - عام مجمع مین برہنہ آ کے کھڑا ہو جاتا
اُسکے گلے مین ایک ڈھول ہوتی - اور وہ نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے بغیر
کسی لے اور ترتیب کے مجنونون کی طرح سر ہلا ہلا کے زور زور سے ڈھول کو لکڑی

سے پیٹنے لگتا۔ اور کہا جاتا کہ یہی ہندوستان کا باجا "تام تام" ہے۔ مگر یہ اُن لوگون کی جہالت و بے عقلی ہے۔ یہ بہت ہی مکمل باجا ہے۔ اور اس کا بجانا ایک باقاعدہ فن ہے جس مین نہایت اعلیٰ درجے کی لَے رکھی گئی ہے۔

اس مین لکھنؤ مین عموماً دو اور کبھی تین تین چار چار بڑے ڈھول ہوتے ہین۔ اور کم سے کم ایک ورنہ دو تین تاشے والے ہوتے ہین۔ اور کم سے کم ایک جھانجھ والا ہوتا ہے۔ جھانجھ کا پتہ ایران وغیرہ مین بھی ملتا ہے۔ اور تاشے مصر وغیرہ مین بھی مروج ہین۔ مگر ڈھول خالص ہندوستان کی چیز ہے۔ لکھنؤ مین یہ باجا فوجون اور خوش باشون کے ساتھ دہلی سے آیا۔ مگر دہلی مین اُسکے جوڑ مین صرف ڈھول اور جھانجھین تھین۔ تاشے لکھنؤ مین بڑھائے گئے۔ اور رواج پاتے ہی اس قدر ضروری اور اہم نظر آئے کہ معلوم ہوا جیسے اُن سے اس باجے مین جان پڑ گئی۔ اگرچہ اکثر شہرون مین صرف ڈھول اور جھانجھین ہی ہوتی ہین مگر لکھنؤ مین تاشے جزو لازمی ہو گئے ہین۔ اور بغیر اُنکے ڈھولین کہین بجتی ہی نہین ہین۔ مگر صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس باجے مین سب سے زیادہ کمال وہی شخص دکھاتا ہے جو تاشا بجاتا ہے۔ وہی لَے قائم کرتا ہے اور لَے مین اُس کی پیروی ڈھول والے کرتے ہین۔ تاشا بجانے کی یہ صفت ہے کہ اتنی جلدی جلدی ضربین پڑین کہ ایک قرعے کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکے۔ اور اُن متواتر و مسلسل قرعون سے نشیب و فراز یا زیر و بم سے لَے اور گت پیدا ہو۔ لکھنؤ مین اس باجے کے بجانے والے ایسے ایسے اُستاد تھے کہ اُنھون نے اس معمولی باجے کو جو سب جگہ بے اصول تھا بہت ہی باقاعدہ بنا دیا۔ اور اب بھی یہان ایسے چابکدست بجانے والے پڑے ہین کہ اُنکے سامنے کسی شہر کے ڈھول بجانیوالے نہین بجا سکتے۔

لکھنؤ مین چہلم کے بعد ایک تعزیہ اُٹھتا ہے جو جھنجھو کا تعزیہ کہلاتا ہے۔ اب تو اُسکے جلوس نے شیعون سنیون کے جھگڑے کی وجہ سے دوسری صورت اختیار کر لی ہے۔ مگر دس بارہ برس پہلے اُسکی شان یہ تھی کہ چونکہ شاہی کے ایک پرانے محب اہل بیت کی یادگار تھا۔ اور اب اُسکے اُٹھانے والے غریب و بے سروسامان

لوگ تھے اس لیے ہر قسم کے باجوں کے بے نظیر و بے بدل اُستاد ثواب سمجھ کے شریک ہوتے اور ثواب کے بہانے اپنے اپنے فنون کا کمال اہل شہر کو دکھاتے اور اسی وجہ سے اُن کا معمول تھا کہ جہاں کھڑے ہوگئے قدردانوں نے گھیر لیا۔ اور وہ گھنٹوں اُسی جگہ کھڑے اس بات کا دعوی کر رہے ہیں کہ کوئی ہے جو ہمارے سامنے آکے بجائے؟ بڑے بڑے اُستاد گویّے اُن کی داد دیتے اور وہ جوش میں آکے اور زیادہ خوبی سے بجاتے۔ خصوصاً اُن میں تاشا بجانے والے بڑے اُستاد ڈھاڑی ہوتے جو موسیقی میں کمال رکھتے اور گتوں میں جدتیں پیدا کرتے۔

ڈھول تاشا بجانے کے فن کے اہم اور با اصول ہونے کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ آخری معزول تاجدار اودھ واجد علی شاہ کو جو موسیقی کے اُستاد بے بدل تھے میں نے کلکتے میں اپنی آنکھ سے دیکھا کہ محرم کی ساتویں تاریخ جب مہندی کا جلوس اُن کی آسمانی کوٹھی سے روانہ ہوتا تو وہ خود گلے میں تاشا ڈال کے بجاتے بڑے بڑے گویّوں کے گلوں میں بڑی بڑی ڈھولیں ہوتیں۔ معززین دربار گرد حلقہ باندھے ہوتے۔ اور وہ ایسی نزاکت اور خوبی سے تاشا بجاتے کہ ناواقف سُننے والے بھی عش عش کر جاتے۔ اور گویّوں کی واہ وا تو ہمارے مشاعروں کے ہنگاموں کو بھی مات کر دیتی۔ اسی طرح میں نے اُنھیں کئی بار ڈھول بجاتے بھی دیکھا۔

بہر حال ہندوستان کے اس قدیم ترین باجے میں بھی لکھنؤ کی سوسائٹی نے اپنا تصرف کیا۔ اور ایسا تصرف کیا جو نہایت ہی مقبول اور ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص آکے یہاں کے تاشہ نوازوں کا کمال دیکھے تو اُسے معلوم ہوگا کہ کس قدر مناسب تصرف ہے۔ اور اُس نے ڈھول اور جھانجھ کو کس قدر اہم بنا دیا ہے۔

دوسرا جوڑ روشن چوکی کا ہے۔ روشن چوکی بہت پرانا باجا ہے اور اگر کل نہیں تو اُس کے اہم ترین اجزا کو مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ کیونکہ شہنائی اس کا اہم جز ہے۔ اور اس کی نسبت مشہور ہے کہ شیخ الرئیس ابن سینا کی ایجاد ہے۔ بالکل انسان کے گلے کی طرح جس قدر سچے سُر گلے بازی کے اعلیٰ ترین کمال کے ساتھ شہنائی

سے ادا ہوتے ہین اور کسی باجے سے نہین ادا ہو سکتے۔ روشن چوکی مین کم از کم دو شہنائی نواز ہوتے ہین اور ایک طبلچی جسکی کمر مین چھوٹے چھوٹے دو طبل بندھے ہوتے ہین۔ طبل نے کو قائم رکھتے ہین۔ ایک شہنائی نواز اصلی سُر قائم رکھنے کے لیے سُر دیتا رہتا ہے اور ایک آواز کی چلت پھرت اور گلے بازی کی مشق دکھاتا ہے۔ اور یہی اصلی شخص ہوتا ہے جو غزلون یا ٹھمریون وغیرہ کو عجیب دلکش سرون مین ادا کرتا ہے۔

روشن چوکی ہندوستان کا خاص درباری باجا تھا۔ جو بادشاہون اور عالی ترین امرا کے خاصے کے وقت بجا کرتی۔ رات کو آرام کے وقت روشن چوکی شاہی قصر کے گرد گشت کیا کرتی۔ اور اُس کا نغمہ دُور سے بہت ہی لطف دیتا۔ دولتِ مغلیہ مین یہ بہت ہی اہم اور لطیف باجا خیال کی جاتی۔ اور دہلی مین خدا جانے کب سے مروج تھی۔ یقیناً لکھنؤ مین روشن چوکی بجانے والے دہلی سے آئے ہونگے۔ مگر اسکے صاحب کمال ان اطراف مین بھی مدت سے موجود تھے۔ بنارس کے اکثر مندرون مین آج تک صبح کو روشن چوکی بجا کرتی ہے۔ اور تڑکے منہ اندھیرے کہین قریب سے جا کے سُنیے تو بہت ہی لطف آتا ہے۔

لکھنؤ مین علی العموم شادی کے جلوسون مین روشن چوکی بجانے والے دولھا کے قریب رہتے ہین۔ خصوصاً ہندوون کی براتون مین راستے بھر قدم قدم پر اُنھین انعام دیا جاتا ہے۔ روشن چوکی بجانے والے میرے خیال اور تجربے مین لکھنؤ سے اچھے آج کل کہین نہ ملین گے۔ جس قدر لے داری اور ہر چیز کو دلکش دُھنون مین سچے سُرون کے ساتھ اہل لکھنؤ ادا کر لیتے ہین اور کسی مقام کے روشن چوکی نواز نہین ادا کر سکتے۔ اُنکے کمال اور فن دانی کا اندازہ اُسوقت ہو سکتا ہے جب کوئی شوق سے سُنے اور داد دیتا جائے۔ اُسی بخشو کے تعزیے مین جس کا ذکر آچکا ہے روشن چوکی بجانے والے بھی اپنا کمال دکھاتے تھے اور اس طرح جان توڑ کے کوشش کرتے تھے کہ پھر اُنکے بعد اور کسی کی شہنائی مین مزہ نہ آتا۔

تیسرا جوڑ نوبت کا ہے۔ ہمارے پُرانے نغمہ ہاے طرب مین سب سے زیادہ عالیشان بینڈ ہے۔ اس مین دو تین شہنائی نواز ہوتے ہین۔ ایک نقارہ بجانیوالا

ہوتا ہے جو دو بہت بڑے بڑے عظیم الشان نقاروں کو اپنے آگے خمیدہ رکھ کے دونوں کو ایک ساتھ چوبوں سے بجاتا ہے۔ ان نقاروں کی آواز بہت بڑی ہوتی ہے۔ اور گرد کی فضا میں بہت دُور تک گونجتی ہے۔ اور ساتھ ہی ایک جھانجھ والا بھی رہتا ہے۔

نوبت بھی تاریخی باجا ہے۔ اور اظہار شوکت کے لیے مدتوں کام میں لایا جا رہا ہے۔ تاریخ اسلام میں ہمیں دمشق و بغداد و مصر کے درباروں میں بھی اس کا پتہ لگتا ہے۔ بغداد میں عباسیہ کے درمیانی دور میں ہر میر کی ڈیوڑھی پر نوبت بجا کرتی تھی۔ اور موجب احترام و عظمت تصور کی جاتی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ہی یہ ہندوستان میں آئی۔ ممکن ہے کہ ہندوستان میں پہلے سے موجود ہو۔ اور گو کہ شہنائی نہ تھی مگر خالی نقارہ اور جھانجھ بجتی ہو۔ لیکن اسکی موجودہ صورت وہی ہے جو ایران و عراق میں مرتب ہونے کے بعد یہاں آئی۔

بادشاہوں اور عالی مرتبہ امیروں کے جلوس اور لشکر کے ساتھ نوبت بہت ہی لازمی شے تھی۔ اُلوالعزم تاجداروں کے جلوس کے آگے آگے ہاتھیوں پر نوبت بجتی جاتی۔ لڑائیوں میں غالب آنے والا گروہ اپنی فتحمندی اور غلبے کے اظہار کے لیے زور شور سے نوبت بجوایا کرتا۔ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر نے حیدرآباد کو فتح کر کے اُسکے قریب ایک پہاڑی پر نوبت بجوائی تھی جو آج تک نوبت پہاڑ کہلاتی ہے۔ دولت مغلیہ میں دربار کے اعلیٰ ترین طبقے کے رئیسوں اور عہدہ داروں کو بادشاہ کی طرف سے نوبت کا حق دیا جاتا۔ جو اپنی ڈیوڑھیوں اور نیز اپنی سواری میں نوبت بجوایا کرتے۔ نوبت بجانے والوں کے لیے کوئی بلند برج منتخب کیا جاتا چنانچہ اکثر شاہی محلوں کے پھاٹکوں کے اوپر نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے جس کے نمونے ہر بڑے شہر میں جہاں کوئی بڑا دربار رہ چکا ہو نظر آتے ہیں۔

اسی قدیم رواج کی پیروی میں لکھنؤ میں آج تک معمول ہے کہ جب دولتمند شخص کے وہاں شادی یا کوئی خوشی کی تقریب ہوتی ہے تو اُس کے دروازے پر لمبی لمبی بلیاں کھڑی کر کے اور سرخ کپڑے اور پنّی وغیرہ سے منڈھ کے عارضی طور پر ایک بلند نوبت خانہ بنوا دیا جاتا ہے

دن بھر ٹھہر کے مختلف اوقات میں بار بار بجایا کرتے ہیں ۔ علیٰ ہذا القیاس جب برائتیں یا تعزیوں کے جلوس چلتے ہیں اسی قسم کے مصنوعی نوبت خانے جو تختوں پر بنالیے جاتے ہیں کہاروں کو کندھوں پر سب کے آگے آگے چلا کرتے ہیں ۔ اور راستے بھر ان پر نوبت بجتی جاتی ہے ۔

یہی نوبت اگلے دنوں خصوص لکھنؤ کے دربار میں وقت پہچاننے کا ذریعہ قرار پاگئی تھی ۔ اُن دنوں وقت کی تقسیم یہ چوبیس گھنٹوں کی نہ تھی جو اب انگریزی گھڑیوں کے رواج سے ہم میں مروج ہوگئی ہے ۔ ان دنوں وقت کی تقسیم کا یہ حساب تھا کہ دن اور رات کے آٹھ پہر ہوتے ہیں ۔ چار پہر دن کے اور چار پہر رات کے ۔ اور ہر پہر کی آٹھ گھڑیاں ہوتیں ۔ ہر نوبت خانے میں ایک پتیلے یا نانڈے میں پانی بھرا رہتا ۔ اُس میں کٹورا جس کے پیندے میں ایک باریک سا سوراخ ہوتا تھا خالی کرکے ڈال دیا جاتا ۔ وہ پانی پر تیرتا رہتا تھا اس سوراخ سے آہستہ آہستہ اُس میں پانی آتا رہتا تھا ۔ اور وہ سوراخ کرکے بنایا جاتا تھا کہ ایک گھڑی بھر میں پانی سے بھرتے بھرتے ڈوب جائے ۔ پہر شروع ہونے کے بعد جب پہلی مرتبہ کٹورا ڈوبتا تو ایک گھڑی بجائی جاتی ۔ جب دوبارہ ڈوبتا دو گھڑیاں بجائی جاتیں ۔ اسی طرح مسلسل آٹھ گھڑیاں بجائی جاتیں ۔ اور آٹھویں گھڑی کے ساتھ گجر بجایا جاتا ۔ یعنی پہلے ممتاز طور پر آٹھ ضربیں بجا کے گھڑیال پر ایک ساتھ بہت سی بے شمار ضربیں جلدی جلدی لگادی جاتیں جس میں یہ اشارہ تھا کہ پہر پورا ہوگیا ۔ اور گھڑیوں کا سلسلہ پھر ایک سے شروع ہو جاتا ۔

جن ڈیوڑھیوں پر نوبت ہوتی وہاں ہر پہر کے خاتمے پر تقریباً ایک گھڑی تک نوبت بجتی رہتی ۔ اس قریب سے رات دن کے آٹھ پہروں کی آٹھ نوبتیں ہوئیں ۔ مگر معمول یہ تھا کہ صرف سات ہی نوبتیں بجا کرتیں ۔ پہلی نوبت تڑکے نماز کے وقت یعنی پہلے پہر کے آغاز پر بجتی اور صبح کی نوبت کہلاتی ۔ دوسری اُس وقت جب ایک پہر دن آجاتا ۔ یہ پہر دن چڑھے کی نوبت کہلاتی ۔ تیسری جب آفتاب نصف النہار پر ہوتا ۔ یعنی ٹھیک بارہ بجے ۔ یہ دوپہر کی نوبت کہلاتی ۔ اسکے بعد

جب آٹھ گھڑیاں پوری ہو جاتیں تو تیسری نوبت بجتی - اور یہ تیسرے پہر کی نوبت کہلاتی - اس کے بعد چوتھا پہر ختم ہونے پر مغرب کے وقت نوبت بجتی - اور یہ شام کی نوبت کہلاتی - اسکے بعد جب پانچواں پہر پورا ہو جاتا تو پانچویں نوبت بجتی جو پہر رات گئے کی نوبت کہلاتی - پھر جب چھٹا پہر گذرتا تو چھٹی نوبت بجتی جو آدھی رات یا دوپہر رات کی نوبت کہلاتی - اسکے بعد جب ساتواں پہر پورا ہوتا اور رات کے تین پہر گذر جاتے تو اُسوقت لوگوں کے آرام میں خلل نہ پڑنے پانے کے خیال سے نوبت نہ بجائی جاتی - صرف گجر بجا دیا جاتا - پھر اسکے بعد آٹھویں پہر کے خاتمے پر صبح کی نوبت بجتی -

اوقات کا یہ حساب تھا جو دربار ملیہ میں اور نیز انتزاع سلطنت تک لکھنؤ میں مروج رہا - اور کلکتے میں جب تک واجد علی شاہ زندہ رہے اسی حساب سے پہرا اور گھڑیاں بجتی رہیں - مگر اتنے ہی دنوں میں وہ حساب اس قدر مفقود ہوگیا کہ اب شاذ و نادر ہی کوئی شخص ہوگا جو پہروں اور گھڑیوں کا حساب جانتا ہو - مگر خرابی یہ ہے کہ باوجود شب و روز کی تقسیم اوقات کے بدل جانے کے اگلا حساب ہماری زبان کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوے ہے - ہم کہتے ہیں "گھڑی بھر میں آؤں گا" "دوپہر کو سوؤں گا" "پہر دن چڑھے کھانا کھاؤں گا" مگر ہم نہیں جانتے کہ پہر کتنا ہوتا ہے اور گھڑی کسے کہتے ہیں - ہم عموماً سُنا کرتے ہیں کہ "پہرہ بیٹھ گیا" اور "پہرے کے سپاہی" مگر نہیں جانتے کہ پہرے کا لفظ اُسی پہر سے نکلا ہے - اس لیے کہ اُن دنوں پہر پہر بھر کی نوکری ہر ایک کو دینا پڑتی تھی - تقسیم اوقات کا یہ پُرانا حساب ہندوون کا ہے - مگر ایران میں بھی اگلے دنوں یہی حساب مروج تھا - اور اسی حساب سے نوبت بجا کرتی تھی - ہمارے موجودہ حساب سے ایک پہر تین گھنٹوں کا ہوا کرتا تھا -

نوبت نواز بھی لکھنؤ میں ایسے اعلیٰ درجے کے تھے کہ ہر جگہ اور ہر شہر میں یہیں سے جایا کرتے - یا یہاں کے اُستادوں کے شاگرد ہوتے - لیکن نوبت میں کوئی ترقی یا اضافہ نہیں ہوا - بجانے والوں کی تعداد وہی رہی - باجے وہی رہے اور بجانے کا طریقہ وہی رہا - پھر بھی اتنا ضرور ہوا کہ لکھنؤ کے اسکول موسیقی نے

جن چیزون اور جن دُھنون کو منتخب کرکے عام سوسائٹی مین مقبول کرا دیا تھا وہی دُھنین اور چیزین نقار خانون مین بھی سُنی جانے لگین - مگر باوجود اسکے نوبت بجانے کا جو قدیم طریقہ تھا وہ بھی اپنی حد پر قائم رہا - امیر خسرو نے اپنے زمانے کی نوبت نوازی کی جو تصویر اپنی نظم مین دکھائی ہے اُس سے اُسوقت کی نوبت بجنے کے طرز کا بہت کچھ اندازہ ہو سکتا ہے - وہی طرز آج تک مروج ہے اور اُس مین بہت کم فرق آیا ہے - لیکن اسپر بھی شہنائی سے جو دُھنین اور گیت بجاتے ہین اُن پر لکھنؤ کی موسیقی کا جو کچھ اثر پڑا ہے وہ سنتے ہی نظر آجاتا ہے -

تُرہی اور قرنا ہندوستان کے بہت پُرانے قومی باجے ہین - جن کو فوجون کے ساتھ زیادہ خصوصیت تھی - تُرہی کی صورت سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریزون کے ساتھ ہندوستان مین آئی اور اُنکے ورود کے ابتدائی دَور مین رواج پا گئی مگر قرنا خاص ایرانی باجا ہے - اور اُس کی آواز مین کچھ ایسا رعب وداب ہے کہ میدان جنگ مین رعب بٹھانے کے لیے زیادہ موزون ہے - ان دونون باجون کا بھی لکھنؤ کے جلوسون مین رواج ہے - لیکن مستقل باجے کی حیثیت سے نہین بلکہ فوجی دستون یا پلٹنون کے ساتھ ایک تُرہی نواز یا قرنا نواز رہا کرتا ہے جو تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنا باجا بجا کے اپنے گروہ کی موجودگی کی اطلاع دے دیا کرتا ہے - ان دونون باجون کے مقابل ہندوون کا قدیم باجا نرسنگھا ہے جو اکثر ہندوون کے مذہبی جلوسون کے ساتھ بجا کرتا ہے - یہ باجے دہلی سے آئے اور جیسے تھے ویسے ہی رہے - اور شاید اُن مین ترقی کی گنجایش بھی نہین ہے -

بگل اور ڈنکا جو فی الحال لکھنؤ کے شادی کے جلوسون مین نظر آیا کرتا ہے وہ دراصل اگلے اور پچھلے باجون کا ایک مبتذل مجموعہ ہے - ڈنکے سے مراد وہ نقارہ ہے جو اگلے دنون فوجون اور زبردست فاتحون کے ساتھ گھوڑے پر رہا کرتا تھا اور اُسپر چوب پڑتے ہی لوگون پر ایسا رعب پڑتا کہ بڑے بڑون کے کلیجے دہل جایا کرتے تھے - بگل یا بیوگل انگریزی فوج کا وہ باجا ہے جس کے ذریعے سے فوج کو حسب ضرورت نقل وحرکت اور دوسرے کامون کا حکم دیا جاتا - لہذا اب ڈنکے کے ساتھ بگل کو شریک کرکے ایک نیا جوڑ بنا لیا گیا جو شادی کے جلوسون

کے ساتھ نظر آیا کرتا ہے۔ مگر چونکہ کرایہ کے اور بہت ہی پتذل حالت کے لوگ ہوتے ہین اس لیے اُن کا لباس۔ اُنکے گھوڑے اور خود اُنکی صورتین ایسی ذلیل و خوار ہوتی ہین کہ اُن سے بجاے رونق کے اور ابتذال اور ایک شرمناک منظر پیدا ہو جاتا ہے۔

اب سب کے آخر مین اور سب سے زیادہ ترقی پذیر باجا انگریزی باجا ہی۔ یہ خالص انگریزون کا لایا ہوا ہے جو اُن سے پیشتر مطلقاً نہ تھا۔ لکھنؤ مین خدا جانے کیون مگر اسکے بجانے والے صرف مہتر ہی ہین۔ جو پاکھانے صاف کرنے کے علاوہ اس کام کو بھی کرتے ہین۔ غالبًا اسکی وجہ یہ ہو کہ ابتداءً ہندو مسلمان دونون گروہون کو عیسائیون سے ایسی سوشل نفرت تھی کہ اگر وہ کسی برتن کو ہاتھ لگا دیتے تو ہمیشہ کے لیے چھوت ہو جاتا۔ اور اس باجے کو انگریزون سے سیکھنا اور اُسے مُنہ لگانا پڑتا۔ اس لیے سوا مہترون کے اور کسی کو اُسکے اختیار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ بہرحال اب قریب قریب یہ مہترون کا لازمی پیشہ ہو گیا ہے۔

چونکہ اس کام کو یہان ایک ایسے گروہ نے اختیار کیا جو سب سے زیادہ ذلیل و خوار ہے اور جسے موسیقی سے بالکل مس نہین۔ اس لیے امید نہ تھی کہ اس فن مین یہان ذرا بھی ترقی ہو سکے گی۔ مگر ایسا نہین ہوا۔ مہترون ہی مین ترقی کا شوق پیدا ہوا۔ اور چونکہ شہر کی سوسائٹیون مین ہندوستانی موسیقی کی دُھنین پھیلی اور مذاق مین سرایت کی ہوئی تھین اس لیے مہترون کو مجبور ہونا پڑا کہ اس مغربی ارغنون مین اپنی دُھنون کو ادا کرین۔ انگریزون یا انگریزی بجانے والے فوجی باجیون سے اُنھون نے صرف یہ حاصل کیا تھا کہ انگریزی باجون کا بجانا آ جائے یا دو چار مغربی موسیقی کی دُھنین سیکھ لی ہون گی۔ لیکن اب اُنھون نے ہندوستانی دُھنون مین مروجہ چیزون کو بجانا شروع کیا تو روز بروز اُس مین ترقی ہی کرتے گئے۔

انگریزی باجا مین نے ہر جگہ سُنا ہے۔ اور سب جگہ وہی انگریزی کی چیزین بجائی جاتی ہین۔ جن کو اُنھون نے اپنے انگریزی بینڈ ماسٹرون سے سیکھ لیا ہے

یہ کہین نہ نظر آیا کہ اس باجے کو بجانے والون نے ہندوستانی موسیقی کے سانچے
مین ڈھال لیا ہو۔ یہ بات اگر غور سے دیکھیے تو لکھنؤ ہی مین نظر آئے گی کہ جن
غزلون یا ٹھمریون کو روشن چوکی والے شہنائی سے ادا کر رہے ہین۔ اُنھین
چیزون کو انگریزی باجے والے اپنے باجون سے ادا کر رہے ہین۔ اور ایسی
خوبی سے کہ خواہ مخواہ سننے کو جی چاہتا ہے۔

انگریزی باجے کے بینڈ مہترون کی مستعدی سے لکھنؤ مین سیکڑون قائم ہو گئے
ہین۔ جن مین سے بعض ایسے ہین کہ اُن مین پچیس پچیس تیس تیس بجانے والے
ہوتے ہین اور بعض مین چھ سات یا چار ہی پانچ۔ اُنھون نے گورون کی وردیون
مین ہندوستانی مذاق کے مطابق تصرف کر کے اپنے لیے رنگ رنگ کی وردیان
بھی بنا لی ہین۔ اور اگر وہ وردیان صاف اور نئی ہون تو اُنکو پہن کے جب وہ
برات کے ساتھ ارگن باجا بجاتے ہوے چلتے ہین تو بہت اچھے اور بہت شاندار
معلوم ہوتے ہین۔

وردی کی خصوصیت انھین لوگون مین ہے۔ اور قسم کے باجے والون کو
کبھی اس کا خیال نہ آیا کہ اپنے لیے کوئی وردی ایجاد کرین۔ وہ نہایت ہی
ذلیل اور کثیف کپڑے پہنے ہوا کرتے ہین۔ مگر انگریزی بینڈ والے مہترون نے
اپنے لیے طرح طرح کی وردیان ایجاد کر کے اپنی شان بڑھا لی ہے۔ اور ہندوستانی
موسیقی کو انگریزی ارغنون مین شامل کر کے لوگون مین اپنی قدر بھی زیادہ
کر لی ہے۔

(۲۸)

انسانی معاشرت مین سب سے زیادہ ضروری اور سب سے اہم کھانا پینا ہے
اور کسی گروہ اور قوم کے ترقی کرتے وقت سب سے پہلے شوق اپنی خوش مذاقی اور
جدتون کا اظہار دسترخوان پر کرتا ہے۔ اسی لیے اب ہم یہ بتانا چاہتے ہین کہ باورچیخانے
اور دسترخوان کے متعلق لکھنؤ کے مشرقی دربار نے کیا رنگ دکھایا۔ اور کیا کیا جدت
طرازیان کین۔ اور اس فن مین یہان کے لوگون نے کس درجے تک ترقی کی۔

اودھ کے تمدن کی تاریخ شجاع الدولہ سے اور اُنکے بھی آخر عہد سے شروع

ہوتی ہے - یعنی اُسوقت سے جبکہ وہ کبسر کی لڑائی مین شکست کھاکے اور انگریزون سے نیا معاہدہ کرکے خاموش بیٹھے اور فوجی سرگرمیون کی طرف سے بے توجہی ہوئی اُس زمانے مین اُن کے مہتمم باورچی خانہ حسن رضا خان عرف مرزا حسنو تھے جو ایک دہلی کے آئے ہوئے معزز و شریف گھرانے سے تھے - صفی پور ضلع اُناؤ کے ایک شیخ زادے مولوی فضل عظیم جو لکھنؤ مین طالبعلمی کو آئے تھے خوش قسمتی سے مرزا حسنو کے گھر مین اُنکی رسائی ہوگئی - اور اُن کے ساتھ ہی مل کے اور کھیل کود کے بڑے ہوے تھے - اُن کو اُنھون نے اپنی طرف سے نائب مہتمم باورچی خانہ مقرر کرادیا تھا - اور اُن کا معمول تھا کہ خاصے کے خوانون کو درست کرکے اور اُن مین اپنی مُہر لگاکے نوابی ڈیوڑھی مین لیجاتے - اور بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی کی مخصوص مہریون دھنیا پنیا - اور منیا کے حوالے کر دیتے - محض اس غرض کے لیے کہ یہ مہریان اُنکے خلاف کوئی کارروائی نہ ہونے دین مولانا نے اُن مہریون سے بھائی چارہ کر لیا تھا - چنانچہ یہ مہریان بہت ہی نازک موقعون پر اُن کے کام آئین -

نواب شجاع الدولہ کا معمول تھا کہ محل کے اندر اپنی بی بی بہو بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھاتے - مہریان خوانون کو بیگم صاحب کے سامنے لیجاکے کھولتین - اور دسترخوان پر کھانا چنا جاتا -

نواب اور بیگم کے لیے ہر روز چھ باورچی خانون سے کھانا آیا کرتا - (اول) مذکورۂ بالا اصلی نوابی باورچی خانے سے جس کے مہتمم مرزا حسنو تھے - اور مولوی فضل عظیم خاصے کے خوان خود لے کے ڈیوڑھی مین حاضر ہوتے - اس باورچی خانے مین دو ہزار روپیہ روز کی پخت ہوتی - جسکے یہ معنی ہوے کہ باورچیون اور دیگر ملازمون کی تنخواہون کے علاوہ ساٹھ ہزار روپیہ ماہوار یا سات لاکھ بیس ہزار روپیہ سالانہ کی رقم فقط الوان نعمت اور غذاؤن کی قیمت مین صرف ہوتی تھی - (دوسرے) سرکاری چھوٹے باورچی خانے سے جس کے مہتمم پہلے تو مرزا حسن علی مہتمم توشہ خانہ تھے - لیکن بعد ازان وہ عنبر علیخان خواجہ سرا کے سپرد ہو گیا تھا - اس مین تین سو روپیہ روز یعنی ایک لاکھ آٹھ ہزار روپیہ ہر سال کھانون کی تیاری مین صرف ہوتے - (تیسرے) خود بہو بیگم صاحبہ کے محل کے اندر کا باورچی خانہ جس کا مہتمم بہار علی خان خواجہ سرا تھا جو تھے

نواب بیگم صاحبہ یعنی شجاع الدولہ کی والدۂ محترمہ کے باورچی خانے سے (پانچوین) مرزا علی خان کے باورچی خانے سے۔ اور (چھٹے) نواب سالار جنگ کے باورچی خانے سے۔ آخر الذکر دونون رئیس بہو بیگم صاحبہ کے بھائی اور شجاع الدولہ بہادر کے سالے تھے۔

اُس عہد کے یہ چھ باورچی خانے شاہی باورچی خانے کے ہم پلّہ تھے۔ اور جن مین روز پُر تکلف اور لذیذ کھانے فرمان روا کے وقت کے خاصے کے لیے تیار کیے جاتے۔ ایک دن کسی کھانے مین جو بڑے سرکاری باورچی خانے سے آیا تھا خاص نواب صاحب کے سامنے ایک مکھی نکل آئی۔ نواب نے برہم ہو کے دریافت کیا کہ یہ کھانا کہان سے آیا ہے؟ دھنیا نے خیال کیا کہ اگر سرکاری باورچی خانے کا نام لیتی ہون تو مولانا بھائی کی قضا آ جائے گی۔ بولی "حضور یہ کھانا نواب سالار جنگ بہادر کے وہان سے آیا ہے"۔

نواب شجاع الدولہ کے بعد دربار فیض آباد سے لکھنؤ مین منتقل ہو آیا۔ اور نواب آصف الدولہ نے مرزا حسن رضا خان کو سرفراز الدولہ خطاب دے کے خلعت وزارت سے سرفراز کیا تو داروغگی باورچی خانہ کو اپنی شان کے خلاف خیال کر کے اُنھون نے مولوی فضل عظیم صاحب کو مستقل مہتمم باورچی خانہ سرکاری مقرر کرا دیا۔ مگر مولوی فضل عظیم صاحب پہلے جس طرح خاصے کے خوان لے کے بہو بیگم صاحبہ کی ڈیوڑھی پر حاضر ہوا کرتے تھے اسی طرح اب لکھنؤ مین بھی نواب آصف الدولہ بہادر کی ڈیوڑھی پر حاضر ہونے لگے۔ اور اپنے دیگر اعزہ کو بھی بلا کے اپنے کام مین شریک کر لیا۔ جن مین اُن کے سگے بھائی مولوی فائق علی اور چچا زاد بھائی غلام عظیم اور غلام مخدوم زیادہ پیش تھے۔ اور باری باری چارون بھائی ڈیوڑھی پر خاصہ لیجایا کرتے۔

آصف الدولہ بہادر کے بعد وزیر علی خان کے چند روزہ عہد مین تفضل حسین خان وزیر ہوے تو اُنھون نے اُن برادران صفی پور کو ہٹا کے ایک اپنے آورد بے غلام محمد عرف بڑے مرزا کو مہتمم باورچی خانہ مقرر کر دیا۔

ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کو اپنے ابتدائی عہد ہی مین ایسے

بڑے بڑے زبردست اور شوقینی کے باورچی خانے نصیب ہوگئے جن کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نہایت ہی اعلیٰ درجے کے باورچی تیار ہوں۔ غذاؤں کی تیاری میں تکلفات بڑھیں۔ جدت طرازیاں ہوں۔ اور جو صاحب کمال باورچی دہلی اور دیگر مقامات سے آئے ہوں وہ یہاں کی خریداری چڑھ کے اپنے ہنر میں خاص قسم کا کمال اور اپنے تیار کیے ہوئے کھانوں میں نئی طرح کی نفاست اور خاص قسم کی لذت پیدا کریں۔

یہ معمول ہے کہ جو کام جس شخص کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ اُس میں کچھ نہ کچھ ترقی ضرور کرتا ہے اور اُس کا شوقین بن جاتا ہے۔ چنانچہ لکھنؤ میں کھانے کے ابتدائی شوقین بھی وہی رؤسا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جن کے باورچی خانوں کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ خود حسن رضا خان سرفراز الدولہ کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ کھانے کھلانے کے وہ نہایت ہی شایق تھے۔ اور جب اُن کا یہ مذاق دیکھ کے اعلیٰ ترین سرکاری باورچی خانہ اُنکے سپرد ہوگیا تو اُنھیں اپنے شوق کے فن میں ایجاد و اختراع کا کہاں تک موقع نہ ملا ہوگا؟

اور اسی کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ یوں تو اِس سرزمین میں کھانے کے شوقین صدہا نہیں پیدا ہوگئے۔ مگر نواب سالار جنگ کے خاندان کو آخر تک الوان نعمت کی ایجاد و ترقی میں خاص شہرت ہوئی۔

معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ خود نواب سالار جنگ کا باورچی جو صرف اُنکے لیے کھانا تیار کیا کرتا تھا بارہ سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ جو تنخواہ آج بھی کسی بڑے سے بڑے ہندوستانی دربار میں کسی باورچی کو نہیں ملتی۔ خاص اُنکے لیے وہ ایسا بھاری پلاؤ پکاتا کہ سوا اُنکے اور کوئی اُسے ہضم نہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ ایک دن نواب شجاع الدولہ نے اُن سے کہا "تم نے کبھی ہمیں وہ پلاؤ نہ کھلایا جو خاص اپنے لیے پکوایا کرتے ہو؟" عرض کیا "بہتر ہے۔ آج حاضر کروں گا"۔ باورچی سے کہا "جتنا پلاؤ روز پکاتے ہو آج اُس کا دُونا پکانا"۔ اُس نے کہا "میں تو صرف آپ کے خاصے کے لیے نوکر ہوں۔ کسی اور کے لیے نہیں پکا سکتا"۔ کہا "نواب صاحب نے فرمائش کی ہے۔ ممکن ہے کہ میں اُن کے لیے نہ لے جاؤں؟

اُس نے کہا "کوئی ہو۔ مین تو اورکسی کے لیے نہین پکا سکتا"۔ جب سالار جنگ نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے کہا "بہتر۔ مگر شرط یہ ہے کہ حضور خود لے جاکے اپنے سامنے کھلائین۔ اور چند لقمون سے زیادہ نہ کھانے دین۔ اور احتیاطاً آبدار خانے کا انتظام بھی کرکے اپنے ساتھ لیجائین"۔ سالار جنگ نے یہ شرطین قبول کین۔ آخر باورچی نے پلاؤ تیار کیا اور سالار جنگ خود لے کے ہوپنچے اور دسترخوان پر پیش کیا۔ شجاع الدولہ نے کھاتے ہی بہت تعریف کی۔ اور رغبت کے ساتھ کھانے لگے۔ مگر دو ہی چار لقمے کھائے تھے کہ سالار جنگ نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔ اور کہا "بس۔ اس سے زیادہ نہ کھائیے"۔ شجاع الدولہ نے حیرت سے اُن کی صورت دیکھی اور کہا "اِن چار لقمون مین کیا ہوتا ہے؟" اور یہ کہکے زبردستی دو ایک لقمے اور کھا ہی لیے۔ اب پیاس کی شدت ہوئی۔ سالار جنگ نے اپنے آبدار خانے سے جو ساتھ گیا تھا پانی منگوا منگوا کے پلانا شروع کیا۔ بڑی دیر کے بعد خدا خدا کرکے تشنگی موقوف ہوئی۔ اور سالار جنگ اپنے گھر آئے۔

آج کل کے مذاق مین یہ غذا کی کوئی خوبی نہین سمجھی جا سکتی۔ مگر اُس زمانے مین اور پُرانے مذاق کے کھانے والون کے نزدیک اب بھی غذا کی خوبی کا اصلی معیار یہی ہے کہ غذائین بظاہر نفیس ولطیف ہون مگر اصل مین اس قدر قوی اور معدے پر گران ہون کہ ہر معدہ برداشت نہ کرسکے۔

دوسرا کمال یہ تھا کہ کسی ایک چیز کو مختلف صورتون مین دکھاکے ایسا بنا دیا جائے کہ دسترخوان پر بظاہر ہین تو یہ نظر آئے کہ بیسیون قسم کے الوان نعمت موجود ہین۔ مگر چکھیے اور غور کیجیے تو وہ سب ایک ہی چیز ہین۔ مثلاً معتبر ذرایع سے سُنا جاتا ہے کہ دہلی کے شاہزادون مین سے مرزا آسمان قدر فرزند مرزا خرم بخت جو لکھنؤ مین آکے شیعہ ہوے اور چند روز یہان ٹھہرنے کے بعد بنارس مین جاکے قیام پذیر ہوگئے۔ قیام لکھنؤ کے زمانے مین واجد علی شاہ نے اُنکی دعوت کی تو دسترخوان پر ایک مربّہ لاکے رکھا گیا جو صورت مین نہایت ہی نفیس ولطیف اور مرغوب معلوم ہوتا تھا۔ مرزا آسمان قدر نے اُسکا لقمہ کھایا تو چکرائے۔ اسلیے

کہ وہ مربہ نہ تھا بلکہ گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ جس کی صورت رکابدار نے بعینہ مربے کی سی بنا دی تھی۔ یون دھوکا کھا جانے پر اُنھین ندامت ہوئی۔ اور واجد علی شاہ خوش ہوے کہ دہلی کے ایک معزز شاہزادے کو دھوکا دیدیا۔

دو چار روز بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ اور واجد علی شاہ یہ خیال کر کے آئے تھے کہ مجھے ضرور دھوکا دیا جائے گا۔ مگر اس ہوشیاری پر بھی دھوکا کھا گئے۔ اس لیے کہ آسمان قدر کے باورچی شیخ حسین علی نے یہ کمال کیا تھا کہ گو دسترخوان پر صدہا الوان نعمت اور قسم قسم کے کھانے چنے ہوے تھے۔ پلاؤ تھا۔ زردہ تھا۔ بریانی تھی۔ قورمہ تھا۔ کباب تھے۔ ترکاریان تھین۔ چٹنیان تھین۔ اچار تھے۔ روٹیان تھین۔ پراٹھے تھے شیرمالین تھین۔ غرضکہ ہمہ نعمت موجود تھی۔ مگر جس چیز کو چکھا شکر کی بنی ہوئی تھی۔ سالن تھا تو شکر کا۔ چانول تھے تو شکر کے۔ اچار تھا۔ تو شکر کا۔ اور روٹیان تھین تو شکر کی۔ یہان تک کہ کہتے ہین تمام برتن۔ دسترخوان۔ اور سلفچی آفتابہ تک شکر کے تھے۔ واجد علی شاہ گھبرا گھبرا کے ایک ایک چیز پر ہاتھ ڈالتے تھے اور دھوکے پر دھوکا کھاتے تھے۔

ہم بیان کر آئے ہین کہ نواب شجاع الدولہ بہادر کے خاصے پر چھ مقامون سے کھانے کے خوان آیا کرتے تھے۔ مگر یہ اُنھین تک منحصر نہ تھا۔ انکے بعد بھی یہ طریقہ جاری رہا کہ اکثر معزز امرا خصوصاً اعزائے شاہی کو یہ عزت دی جاتی کہ وہ خاصے کے لیے خاص خاص قسم کے کھانے بلاناغہ بھیجا کرتے۔

چنانچہ ہمارے دوست نواب محمد شفیع خان صاحب بہادر نیشاپوری کا بیان ہو کہ اُنکے نانا نواب آغا علی حسن خان صاحب کے گھر سے جو نیشاپوریون مین سب سے زیادہ نامور اور ممتاز تھے بادشاہ کے لیے روغنی روٹی اور میٹھا گھی جایا کرتا۔ روغنی روٹیان اس قدر باریک اور نفاست سے پکائی جاتین کہ موٹے کاغذ سے زیادہ گندہ نہ ہوتین۔ اور پھر یہ ممکن نہ تھا کہ چتیان پڑین اور نہ یہ مجال تھی کہ کسی جگہ پر کچی رہ جائین۔ میٹھا گھی بھی ایک خاص چیز تھا جو بڑے اہتمام سے تیار کرایا جاتا۔ دہلی مین بریانی کا زیادہ رواج ہے اور تھا۔ مگر لکھنؤ کی نفاست نے پلاؤ کو

اُس پر ترجیح دی۔ عوام کی نظر مین دونون قریب قریب بلکہ ایک ہی ہین۔ مگر بریانی مین مسالے کی زیادتی سے سالن سلے ہوے چاولون کی شان پیدا ہوجاتی ہے۔ اور پُلاؤ مین اتنی لطافت۔ نفاست۔ اور صفائی ضروری سمجھی جاتی ہے کہ بریانی اُسکے سامنے ملغوبہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اس مین شک نہین کہ معمولی قسم کے پُلاؤ سے بریانی اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ پلاؤ خشکہ معلوم ہوتا ہے جو عیب بریانی مین نہین ہوتا۔ مگر اعلیٰ درجے کے پُلاؤ کے مقابل بریانی نفاست پسند لوگون کی نظر مین بہت ہی لدھڑ اور بدنما غذا ہے۔ بس یہی فرق تھا جس نے لکھنؤ مین پلاؤ کو زیادہ مروج بنا دیا۔

پلاؤ یہان کہنے کو تو سات طرح کے مشہور ہین۔ اُن مین سے بھی صرف گلزار پلاؤ۔ نور پلاؤ۔ کوکو پلاؤ۔ موتی پلاؤ۔ اور چنبیلی پلاؤ کے نام ہمین اس وقت یاد ہین۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہان کے اعلیٰ درجے کے دسترخوان پر بیسیون طرح کے پلاؤ ہوا کرتے تھے۔ محمد علی شاہ کے بیٹے مرزا عظیم الشان نے ایک شادی کے موقع پر سمدھی ملاپ کی دعوت کی تھی جس مین خود فرمان رواے وقت واجد علی شاہ بھی شریک تھے۔ اُس دعوت مین دسترخوان پر نمکین اور میٹھے کُل ستر قسم کے چاول تھے۔

غازی الدین حیدر بادشاہ کے عہد مین نواب سالار جنگ کے خاندان سے ایک رئیس تھے۔ نواب حسین علی خان۔ اُنھین کھانے کا بڑا شوق تھا۔ خصوصاً پلاؤ کا۔ اُن کے دسترخوان پر بیسیون طرح کے پلاؤ ہوا کرتے۔ اور وہ ایسی نفاست اور لطف کے ساتھ تیار کیے جاتے کہ شہر بھر مین اُن کی شہرت ہوگئی۔ یہان تک کہ رؤسا و عمائد مین سے کوئی اُن کے مقابلے کی جراءت نہ کرسکتا۔ خود بادشاہ کو اُن پر رشک تھا۔ اور کھانے کے شوقینون مین وہ "چاول والے" مشہور ہوگئے تھے۔

نصیر الدین حیدر کے عہد مین باہر کا ایک باورچی آیا جو پستے اور بادام کی کھچڑی پکاتا۔ بادام کے سڈول اور صاف ستھرے چاول بناتا۔ پستے کی دال تیار کرتا۔ اور اس نفاست سے پکاتا کہ معلوم ہوتا نہایت عمدہ نفیس اور کھری

ماش کی کھچڑی ہے۔ مگر کھائیے تو اور ہی لذت تھی۔ اور ایسا ذائقہ جس کا مزہ زبان کو زندگی بھر نہ بھولتا۔

نواب سعادت علی خان کے زمانے مین ایک صاحب کمال باورچی صرف چانولون کی گلتھی پکاتا۔ مگر ایسی گلتھی جو شاہی دسترخوان کی رونق۔ فرمانرواے وقت کو نہایت ہی مرغوب تھی۔ اور شہر کے تمام رئیسون کو اُس کا ایک لقمہ ملجانے کی تمنا تھی۔ مشہور ہے کہ نواب آصف الدولہ کے سامنے ایک نیا باورچی پیش ہوا۔ پوچھا گیا "کیا پکاتے ہو؟" کہا صرف ماش کی دال پکاتا ہون۔" پوچھا "تنخواہ کیا لوگے؟" کہا "پانسو روپیہ" نواب نے نوکر رکھ لیا۔ مگر اُس نے کہا "مین چند شرطون پر نوکری کرون گا۔" پوچھا "وہ شرطین کیا ہین؟" کہا "جب حضور کو میرے ہاتھ کی دال کا شوق ہو ایک روز پہلے سے حکم ہو جائے۔ اور جب اطلاع دون کہ تیار ہے تو حضور اُسی وقت تناول فرمالین۔" نواب نے یہ شرطین بھی منظور کرلین۔ چند ماہ کے بعد اُسے دال پکانے کا حکم ہوا۔ اُس نے تیار کی۔ اور نواب کو خبر کی۔ اُنھون نے کہا "اچھا دسترخوان بچھاؤ مین آتا ہون۔" دسترخوان بچھا۔ مگر نواب باتون مین لگے رہے۔ اُس نے جا کے پھر اطلاع دی کہ "خاصہ تیار ہے۔" نواب کو پھر آنے مین دیر ہوئی۔ اُس نے سہ بارہ خبر کی۔ اور اسپر بھی نواب صاحب نہ آئے تو اُس نے دال کی ہانڈی اُٹھا کے ایک سوکھے پیڑ کی جڑ مین انڈیل دی۔ اور استعفا دے کے چلا گیا۔ نواب کو افسوس ہوا۔ ڈھونڈھوایا مگر اُس کا پتہ نہ لگا۔ مگر چند روز بعد دیکھا تو جس درخت کے نیچے دال پھینکی گئی تھی وہ سرسبز ہو گیا تھا۔ اس مین شک نہین کہ اس واقعے مین مبالغہ ہے۔ جس نے اسے خلاف قیاس ہونے کے درجے تک پہونچا دیا ہے۔ مگر اس سے اتنا اندازہ البتہ ہو جاتا ہے کہ دربار مین باورچیون کی کس درجہ قدر ہوتی تھی۔ اور کوئی صاحب کمال باورچی آ جاتا تو کس فیاضی سے روک لیا جاتا۔

امیرون کا یہ ذوق وشوق دیکھ کے باورچیون نے بھی طرح طرح کی جدت طرازیان شروع کردین۔ کسی نے پلاؤ انار دانہ ایجاد کیا۔ اُس مین ہر چانول آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور چلادار ہوتا اور آدھا سفید۔ مگر اُس مین بھی

کی سی چمک موجود ہوتی - جب دسترخوان پر لاکے لگایا جاتا تو معلوم ہوتا کہ پلیٹ
میں ابلق رنگ کے جواہرات رکھے ہوے ہیں - ایک اور باورچی نے نورتن
پلاؤ پکا کے پیش کیا جس میں نورتن کے مشہور جواہرات کے مثل نو رنگ کے چاول
ملا دیے - اور پھر رنگوں کی صفائی اور آب و تاب عجیب نفاست اور لطف
پیدا کر رہی تھی - اسی طرح کی خدا جانے کتنی ایجادیں ہو گئیں جو تمام گھروں
اور باورچی خانوں میں پھیل گئیں -

کھانے کے شوقین اگلے رئیسوں میں سے ایک نواب مرزا خان نیشاپوری
تھے جو کہتے ہیں کہ چودہ ہزار ماہوار کے وثیقہ یاب تھے - اچھا کھانے کے شوق
میں اُنھوں نے وہ کمال دکھایا اور ایسے اچھے اچھے باورچی جمع کر لیے کہ
شہر میں اُن کے دسترخوان کی دھوم تھی - دوسرے مرزا حیدر تھے - یہ بھی
نیشاپوری اور ایسے محترم رئیس تھے کہ تمام نیشاپوری اُنکو اپنا سرتاج اور
بزرگ مانتے - اُن کی شان یہ تھی کہ جس کی دعوت میں جاتے اُن کا آبدارخانہ -
گلوریوں کا سامان - اور سو ڈیڑھ سو حقے اُن کے ساتھ جاتے - اُن کی اس وضع
سے اکثر متوسط الحال لوگوں کو بڑی مدد مل جاتی - کسی نہ کسی طرح خوشامد
درآمد کر کے اُن سے دعوت قبول کرا لیتے - اور اُن کے قبول کر لینے کے
یہ معنی تھے کہ محفل میں حقوں - گلوریوں - اور پانی کا انتظام اُنکے ذمے ہو گیا -
اور پھر کیسا انتظام جو کسی بڑے سے بڑے رئیس کے بھی امکان سے باہر تھا -

کھانا تیار کرنے والے تین گروہ ہیں - پہلے دیگ شو - جن کا کام دیگوں کا
دھونا اور باورچیوں کی ماتحتی میں مزدوری کرنا ہے - دوسرے باورچی - یہ
لوگ کھانا پکاتے ہیں اور اکثر بڑی بڑی دیگیں تیار کر کے اُتارتے ہیں تیسرے
رکابدار - یہی لوگ اس فن کے اعلیٰ درجے کے ماہر اور صاحب کمال ہوتے ہیں
یہ لوگ علی العموم چھوٹی ہانڈیاں پکاتے ہیں - اور بڑی دیگیں اُتارنا اپنی شان
اور مرتبے سے ادنیٰ کام خیال کرتے ہیں - اگرچہ اکثر باورچی بھی چھوٹی ہانڈیاں
پکاتے ہیں - مگر رکابداروں کا کام فقط چھوٹی ہانڈیوں تک محدود تھا - یہ لوگ
میوہ جات کے پھول کترتے - کھانا لگاتے اور لگانے میں سلیقہ - نفاست - اور

تکلف ظاہر کرتے۔ چمچوں اور قابوں میں جو پلاؤ یا زردہ نکالا جاتا اُسپر میوہ جات اور دیگر طریقوں سے گلکاریاں کرتے اور نقش ونگار بناتے۔ نہایت نفیس اور لطیف مربے اور اچار تیار کرتے اور کھانوں میں اپنی طبیعتداری سے صدہا قسم کی صنعتیں دکھاتے۔

غازی الدین حیدر پہلے شاہ اودھ کو پراٹھے پسند تھے۔ اُن کا رکابدار ہر روز چھ پراٹھے پکاتا۔ اور فی پراٹھا پانچ سیر کے حساب سے ۳۰ سیر گھی روز لیا کرتا۔ ایک دن وزیر سلطنت معتمد الدولہ آغا میر نے شاہی رکابدار کو بُلا کے پوچھا "ارے بھئی یہ تیس سیر گھی کیا ہوتا ہے؟" کہا "حضور پراٹھے پکاتا ہوں۔" کہا "بھلا میرے سامنے تو پکاؤ۔" اُس نے کہا "بہت خوب۔" پراٹھے پکائے۔ جتنا گھی کھپا کھپایا۔ اور جو باقی بچا پھینک دیا۔ معتمد الدولہ آغا میر نے یہ دیکھ کے حیرت اور استعجاب سے کہا "پورا گھی تو خرچ نہیں ہوا؟" اُس نے کہا "اب یہ گھی تو بالکل تیل ہو گیا۔ اس قابل تھوڑے ہی ہے کہ کسی اور کھانے میں لگایا جائے۔" وزیر سے جواب تو نہ بن پڑا مگر حکم دے دیا کہ "آیندہ سے صرف پانچ سیر گھی دیا جایا کرے۔ فی پراٹھا ایک سیر بہت ہے۔" رکابدار نے کہا "بہتر میں اتنے ہی گھی میں پکا دیا کروں گا۔" مگر وزیر کی روک ٹوک سے اس قدر ناراض ہوا کہ معمولی قسم کے پراٹھے پکا کے بادشاہ کے خاصے پر بھیجدیے۔ جب کئی دن یہی حالت رہی تو بادشاہ نے شکایت کی کہ "یہ پراٹھے اب کیسے آتے ہیں؟" رکابدار نے عرض کیا "حضور جیسے پراٹھے نواب معتمد الدولہ بہادر کا حکم ہے پکاتا ہوں۔" بادشاہ نے اس کی حقیقت پوچھی تو اُس نے سارا حال بیان کر دیا۔ فوراً معتمد الدولہ کی یاد ہوئی۔ اُنھوں نے عرض کیا "جہان پناہ۔ یہ لوگ خواہ مخواہ کو لوٹتے ہیں۔" بادشاہ نے اس کے جواب میں دس پانچ تھپڑ اور گھونسے رسید کیے۔ خوب ٹھونکا۔ اور کہا "تم نہیں لوٹتے ہو؟ تم جو ساری سلطنت اور سارے ملک کو لوٹے لیتے ہو اس کا خیال نہیں۔ یہ جو تھوڑا سا گھی زیادہ لے لیتا ہے اور وہ بھی میرے خاصے کے لیے۔ یہ تمھیں نہیں گوارا ہے؟" بہرحال معتمد الدولہ نے توبہ کی۔ کان اُمیٹھے۔ تو خلعت ہوا۔ جو اس بات کی نشانی تصور کی جاتی کہ آج

جہان پناہ نے دست شفقت پھیرا ہے۔ اور اپنے گھر آئے۔ پھر اُنھون نے کبھی اُس رکابدار سے تعرض نہ کیا۔ اور وہ اُسی طرح ۳۰ سیر گھی روز لیتا رہا۔

(۲۹)

نواب ابوالقاسم خان ایک شوقین رئیس تھے۔ اُنکے وہان بہت بھاری پلاؤ پکتا۔ ۴۳ سیر گوشت کی یخنی تیار کرکے مقطر کرلی جاتی اور اُس مین چانول دم کیے جاتے۔ اور پھر اس لطف کے ساتھ کہ لقمہ مُنہ مین رکھتے ہی معلوم ہوتا کہ سب چانول خود ہی گھُل کے حلق سے اُتر گئے۔ پھر اُسکے ساتھ اس درجہ لطافت کہ مجال کیا جو ذرا بھی محسوس ہو سکے کہ اُس مین کسی قسم کی گرانی ہے۔ اتنی ہی یا اس سے زیادہ قوت کا پلاؤ واجد علی شاہ کی خاص محل صاحبہ کے لیے روز تیار ہوا کرتا تھا۔

ممدوح بالا معزول شاہ اودھ کے ہمراہ مٹیا برج مین ایک رئیس تھے جن کا نشی السلطان بہادر خطاب تھا۔ بڑے وضعدار اور نفیس مزاج شوقینون مین تھے کھانے کا بیحد شوق تھا۔ اور اگرچہ کئی صاحب کمال باورچی موجود تھے مگر اُنھین جب تک دو ایک چیزین خود اپنے ہاتھ سے نہ پکا لیتے کھانے مین مزہ نہ آتا۔ آخر اُنکے اچھے کھانے کی یہان تک شہرت ہوئی کہ واجد علی شاہ کہا کرتے "اچھا تو نشی السلطان کھاتے ہین۔ مین کیا اچھا کھاؤن گا"۔ بچپن مین چھ سات برس تک مٹیا برج مین مین اُنھین کے ساتھ رہا۔ اور اُنھین کے ساتھ دسترخوان پر شریک ہوتا رہا۔ مین نے اُن کے دسترخوان پر تیس چالیس قسم کے پلاؤ اور بیسیون قسم کے سالن کھائے۔ جن مین سے بعض ایسے تھے کہ پھر کبھی کھانا نصیب ہوئے۔ اُنھین حلوا سوہن کا بھی بڑا شوق تھا۔ جس کا ذکر اپنے محل پر آئے گا۔

آخر زمانے مین اور غدر کے بعد لکھنؤ مین حکیم بندہ مہدی مرحوم کو کھانے اور پہننے کا بیحد شوق تھا۔ اور بڑے بڑے دولتمند اور شوقین لوگون کو یقین ہے کہ جیسا کھانا اُنھون نے کھایا اور جیسا کپڑا اُنھون نے پہنا اس زمانے مین بہت کم کسی کو نصیب ہو سکا۔ ہمارے ایک معمر و معزز دوست فرماتے ہین کہ ہمارے

خاندان سے حکیم صاحب موصوف سے بہت ربط وضبط تھا۔ ایک دن حکیم صاحب
نے ہمارے والد اور چچا کو بلا بھیجا کہ ایک پہلوان کی دعوت ہے۔ آپ بھی آکے
لطف دیکھیے۔ والد تشریف لے گئے اور میں بھی اُن کے ساتھ گیا۔ وہاں جاکے
معلوم ہوا کہ وہ پہلوان روز صبح کو بیس سیر دودھ پیتا ہے۔ اُس پر ڈھائی تین سیر
میوہ یعنی بادام اور پستے کھاتا ہے اور دوپہر اور شام کو ڈھائی سیر آٹے کی
روٹیاں اور ایک متوسط درجے کا بکرا کھا جاتا ہے۔ اور اسی غذا کے مناسب
اُس کا تن و توش بھی تھا۔ وہ ناشتے کے لیے بیتاب تھا۔ اور بار بار تقاضا
کر رہا تھا کہ کھانا جلدی منگوائیے۔ مگر حکیم صاحب جان بوجھ کے ٹال رہے تھے۔
یہاں تک کہ بھوک کی شدت نے اُسے بیتاب کر دیا۔ اور اب وہ ناراض ہو کے
اُٹھنے لگا۔ تب حکیم صاحب کھانا بھیجنے کا وعدہ کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی سی
دیر اور ٹالا۔ اور جب دیکھا کہ اب وہ بھوک کو بالکل برداشت نہیں کر سکتا تو
مہری کے ہاتھ ایک خوان بھیجا۔ جس کی صورت دیکھتے ہی پہلوان صاحب کی جان
میں جان آئی۔ مگر جب اُسے کھولا تو ایک چھوٹی طشتری میں تھوڑا سا پلاؤ تھا۔
جس کی مقدار چھٹانک بھر سے زیادہ نہ ہوگی۔ پُرخور مہمان کو یہ چاول دیکھ کے
بڑا طیش آیا جو اُس کے ایک لقمے کے لیے بھی کافی نہ تھے۔ قصد کیا کہ اُٹھ کے
چلا جائے مگر لوگوں نے سمجھا بجھا کے روکا۔ اور اُس نے مجبوراً وہ طشتری اُٹھا
کے مُنہ میں اُنڈیل لی۔ اور بغیر مُنہ چلائے نگل گیا۔ پانچ منٹ کے بعد اُس نے
پانی مانگا۔ اور اُسکے پانچ منٹ بعد پھر پانی پیا اور ڈکار لی۔ اب اندر سے
کھانے کے خوان آئے۔ دسترخوان بچھا۔ خود حکیم صاحب بھی آئے۔ کھانا چُنا گیا
اور وہی پلاؤ جس میں سے ایک لقمہ پہلے بھیجا گیا تھا اُس کی پلیٹ جس میں کوئی
ڈیڑھ پاؤ چاول ہونگے حکیم صاحب کے سامنے لگائی گئی۔ حکیم صاحب نے
اُس پلیٹ کو اُس پہلوان کے سامنے پیش کیا اور کہا دیکھیے یہ وہی پلاؤ ہے یا کوئی
اور؟ اُس نے قبول کیا کہ وہی ہے۔ حکیم صاحب نے کہا "تو اب کھائیے۔ مجھے
افسوس ہے کہ اسکی تیاری میں دیر ہوئی۔ اور آپ کو تکلیف اُٹھانا پڑی" پہلوان
نے کہا "مگر اب مجھے معاف فرمائیے۔ میں اُسی پہلے لقمے سے سیر ہو گیا۔ اور اب

ایک چاول بھی نہیں کھا سکتا"۔ ہزار اصرار کیا گیا مگر اُس نے قطعاً ہاتھ روک لیا۔ اور کہا "کھاؤں کیونکر؟ جب پیٹ میں جگہ بھی ہو"۔ حکیم صاحب نے وہ چاول لے کے سب کھا لیے۔ اور اُس سے کہا "بیس بیس سیر اور تیس تیس سیر کھا جانا انسان کی غذا نہیں۔ یہ تو گائے بھینس کی غذا ہوئی۔ انسان کی غذا یہ ہے کہ چند لقمے کھائے۔ مگر اُن سے قوت و توانائی وہ آئے جو بیس تیس سیر غلہ کھانے میں بھی نہ آسکے۔ آپ اس ایک لقمے میں سیر ہو گئے ہیں۔ کل پھر آپ کی دعوت ہے۔ کل آکے بتائیے گا کہ اس ایک لقمے سے آپ کو ویسی ہی قوت و توانائی محسوس ہوئی جیسی کہ ۲۰ سیر دودھ اور سیروں میوے اور گوشت اور غلے سے حاصل ہوتی تھی یا اُس سے کم؟" اور ہم سب کو بھی حکیم صاحب نے دوسرے دن مدعو کر دیا۔ دوسرے دن اُس پہلوان نے آکے بیان کیا کہ "مجھے زندگی بھر ایسی توانائی اور چونچالی نہیں نصیب ہوئی تھی جیسی کہ کل سے آج تک رہی"۔

شاہی خاندان کے لوگوں میں سے آخر عہد میں نواب محسن الدولہ اور نواب ممتاز الدولہ دسترخوان اور باورچی خانے کے شوق اور کمال میں بے نظیر سمجھے جاتے۔ اور انھیں کا باورچی تھا جو حکیم بندہ مہدی صاحب کے لیے یہ پلاؤ تیار کیا کرتا تھا۔ اُنھیں دنوں ملکہ زمانیہ کی ایک بڑی سرکار قائم تھی اور اُن کا باورچی خانہ مشہور تھا۔ جس میں روزانہ تین سو روپے کی پخت ہوتی۔ اسی عہد میں شاہزادہ یحییٰ علی خان کی سرکار میں عالم علی نام ایک باورچی نوکر تھا وہ مسلّم مچھلی ایسی بے مثل پکاتا تھا کہ تمام رئیسوں میں مشہور تھی۔ اور دوسری سرکاروں کے باورچیوں نے ہزار کوشش کی مگر وہ بات نہ پیدا کر سکے۔

نصیر الدین حیدر کے زمانے میں محمد و نام ایک ولایتی شخص نے آکے فرنگی محل میں باورچی کی دوکان کھولی۔ اور اُس کی نہاری کی ایسی شہرت ہوئی کہ بڑے بڑے رئیس اور شاہزادے تک اُس کی نہاری کی قدر کرنے۔ قدردانی نے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ اور اُس نے شیرمال ایجاد کی جو آج تک لکھنؤ کا سرمایۂ ناز ہے۔ روٹیوں کی بہت سی قسمیں مشہور اور مختلف شہروں میں مروج

ہین - ایران سے مسلمان خمیری روٹیان کھاتے اور ہندوستان کی سرزمین مین تنور گاڑتے ہوے آئے تھے - مگر اُسوقت تک سادی روٹیان تھین - جن مین گھی کا لگاؤ نہ ہوتا - ہندوؤن کو پوریان تلتے دیکھ کے مسلمانون نے توے کی روٹیون مین گھی کا جزو دے کے پراٹھے ایجاد کیے - اور پھر اُن مین متعدد پرتین اور تہین دینا شروع کین - پھر اُسی پراٹھے مین پہلی ترقی یہ ہوئی کہ باقرخانی کا رواج ہوا جو ابتدائے امرا کے دسترخوان کی بہت تکلفی روٹی تھی - لکھنؤ مین محمدو نے باقرخانی پر بہت ترقی دے کے شیرمال پکائی جو مزے - بوباس - نفاست اور لطافت مین باقرخانی اور تکلفی روٹیون کے تمام اصناف سے بڑھ گئی - شیرمال آج تک سوا لکھنؤ کے اور کہین نہین پکتی - اور پکتی بھی ہے تو ایسی نہین پک سکتی - چند ہی روز مین شیرمال کو ایسی عام مقبولیت حاصل ہوئی کہ وہ لکھنؤ کی نیشنل روٹی قرار پا گئی - یہان تک کہ جس دعوت مین شیرمال نہ ہو وہ مکمل نہین سمجھی جاتی -

شیرمال کی ایجاد نے محمدو کی اس قدر قدر بڑھائی کہ شاہی مجالس اور تقریبون کے لیے اُسے بعض اوقات ایک ایک لاکھ شیرمالون کا آرڈر ایک دن مین ملا - اور اُس نے بھی ایسا کافی انتظام کر رکھا تھا کہ جتنی شیرمالین مانگی جاتین مہیا کر دیتا - محمدو کا جانشین ان دنون علی حسین تھا جو کئی مہینے ہوے مرگیا - مگر اُسکی دُکان سے آج بھی جیسی اعلیٰ درجے کی شیرمالین مل سکتی ہین اور کہین نہین مل سکتین -

شیرمال سے بھی زیادہ مزہ دار نان جلیبی ہوتی ہے جو خاص اہتمام سے پکوائی جاتی ہے - اور وہی رکابدار اُسے طیار کر سکتے ہین جو واقف ہین - اور باورچیون کو دعوے ہے کہ لکھنؤ کے باورچیون سے اچھی نان جلیبی کوئی نہین پکا سکتا - پراٹھون مین لکھنؤ اُسی درجے پر ہے جو دوسرے شہرون کو حاصل ہے - اس مین بظاہر کوئی خاص ترقی نہین ہوئی - بلکہ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے اچھے نان بائی بہت اعلیٰ درجے کے پراٹھے پکاتے ہین - اور سیر بھر آٹے مین پورا سیر بھر گھی کھپا دیتے ہین - مگر مین نے اپنے زمانۂ قیام دہلی مین کئی بار مشہور

نان بائیوں سے پراٹھے پکوائے۔ بیشک اُنھوں نے گھی بہت خرچ کر دیا۔ مگر چونکہ آٹے کے اندر گھی نہین دیا تھا اس لیے وہ اُسی وقت تک کھانے کے قابل تھے جب تک کہ تازے کھا لیے جائین۔ ٹھنڈے ہوتے ہی چمڑے ہو گئے روٹی کو توڑ کے اور اُس مین گھی شکر ملا کے مَل دینا ایک عام اور معمولی غذا ہے جس کا اکثر فاتحون اور نیازون مین زیادہ رواج ہے۔ مگر شاہی باورچی خانے کے یہان کے باورچی ایسا لطیف ملیدہ تیار کرتے جو بعض فرمان رواؤن کو نہایت ہی مرغوب تھا۔ اور تعریف یہ تھی کہ منہ مین لقمہ لیتے ہی شربت بن جائے اور معلوم ہو کہ چبانے یا منہ چلانے کی مطلق ضرورت نہین۔

اسی روٹی کے سلسلے مین یہان تک ترقی ہوئی کہ صرف دودھ کی پوریان پکائی جانے لگین جن مین آٹے کا بالکل جُزو نہ ہوتا۔ صرف دودھ کے جُھن مین گندھے ہوے مَیدے کی شان پیدا کر لی۔ اور آخر مین یہان تک ترقی ہوئی کہ دودھ کی گلوریان اور دیگر اقسام کی چیزین تیار ہونے لگین۔ اسی طرح خالص دودھ کی پنجیری دسترخوانون پر آتی جو بہت ہی نفیس و لطیف غذا اور امرا کو بہت پسند تھی۔

لیکن مسلمانون کی نیشنل ڈِش یعنی قومی غذا پُلاؤ اور قورمہ ہے۔ لہذا سب سے زیادہ نزاکت و لطافت اُنھین چیزون مین دکھائی گئی۔ پُلاؤ کے متعلق ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہین۔ پھر بھی بعض باتین باقی رہ گئین۔ دولتمند اور شوقین امیرون کے لیے مُرغ مشک و زعفران کی گولیان کھلا کھلا کے تیار کیے جاتے۔ یہان تک کہ اُن کے گوشت مین ان دونون چیزون کی خوشبو سرایت کر جاتی۔ اور ہر رگ و ریشہ معطر ہو جاتا۔ پھر اُن کی یخنی نکالی جاتی۔ اور اُس یخنی مین چانول دم دے دیے جاتے۔

موتی پُلاؤ کی یہ شان تھی کہ معلوم ہوتا چاولون مین آبدار موتی ملے ہوے ہین۔ اُس کے لیے موتیون کے تیار کرنے کی یہ ترکیب تھی کہ تولہ بھر چاندی کے ورق اور ماشہ بھر سونے کے ورق انڈے کی زردی مین خوب حل کیے جاتے۔

پھر اس حل شدہ مرکب کو مرغ کے نرخرے میں بھر کے نرخرے کے ہر ہر جوڑ پر
باریک دھاگا کس کے باندھ دیا جاتا۔ اور اُسے خفیف سا جوش دے کے
چاقو سے نرخرے کی کھال چاک کر دی جاتی اور سڈول آبدار موتی نکل آتے
جو پلاؤ میں گوشت کے ساتھ دم کر دیے جاتے۔ بعض رکابدار پنیر کے موتی
بناتے اور اُس پر چاندی کا ورق چڑھا دیتے۔ بہرحال ایسی ایسی جدتیں عمل
میں آتیں کہ اور کہیں لوگوں کے خیال میں بھی نہ آئی ہوتیں۔ بعض رکابداروں
نے پلاؤ کی تیاری میں یہ صنعت دکھائی کہ گوشت کی چھوٹی چھوٹی چڑیاں بنا کے
اور خوب احتیاط سے اس طرح پکا کے کہ صورت نہ بگڑنے پائے پلیٹ میں
بٹھا دیں۔ چانولوں کی صورت دانے کی کر دی۔ اور معلوم ہوتا کہ ہر مہمان کے
سامنے پلیٹ میں چڑیاں بیٹھی دانہ چُگ رہی ہیں۔ پھولے ہوئے سموسے جن میں
سے توڑتے ہی لال نکل کے اُڑ جاتے۔ حیدرآباد دکن میں غالباً لکھنؤ کے رکابدار
پیر علی نے آ کر تیار کیے جو سرکاری ڈنروں میں میز پر آئے اور معزز انگریزوں
اور لیڈیوں کو بہت محظوظ کیا۔ اس کی ایجاد سب سے پہلے نصیر الدین حیدر
کے دسترخوان پر ہوئی تھی۔ مگر چڑیوں والا مذکورۂ بالا پلاؤ اس سے بدرجہا زیادہ
دلچسپ صنعت تھا۔

ایک رکابدار نے یہ صنعت دکھائی کہ دسترخوان پر بڑے بڑے سیر سیر بھر
کے انڈے اُبلے اور تلے ہوئے پیش کیے۔ جن میں سفیدی اور زردی اُسی نسبت
اور وضع سے قائم تھی جو معمولی انڈوں میں ہوا کرتی ہے۔ بعض رکابداروں
نے بادام کا سالن پکایا جو بعینہٖ سیم کے بیجوں کے مثل اور مزے اور لطافت
میں اُس سے بڑھا ہوا تھا۔ وزیر سلطنت روشن الدولہ کے باورچی نے کچے
بھٹوں کے پچھے اس نفاست سے کاٹے کہ کہیں ٹوٹنے نہ پائے۔ اور اُن کا
رائتا ایسا اعلیٰ درجے کا بنایا کہ جس نے چکھا عش عش کر گیا۔

ہمارے معجز رقم خوشنویس منشی شاکر علی صاحب نے چانول پر قُل ہو اللہ
لکھ کے بے مثل کمال دکھایا ہے۔ مگر یہاں کے ایک باورچی نے شاہی میں خشخاش
کے دانوں میں چاروں طرف کٹھل کے خاصے پیدا کیے۔ وہ اُسے خاص

ترکیب سے پکاکے دسترخوان پر پیش کیا تھا۔
پیر علی لکھنؤ کا مشہور رکابدار جو حضور نظام کے باورچی خانے مین ملازم تھا ایک نہایت قیمتی اور لذیذ ارہر کی دال پکایا کرتا جو اگلے فرمانروایان لکھنؤ کے باورچی خانون مین پکا کرتی تھی۔ اور سلطانی دال کے نام سے مشہور تھی۔
بعض رکابدار مسلّم کریلے ایسی نفاست اور صفائی سے پکاتے کہ دیکھیے تو معلوم ہوتا کہ اُنھین بھاپ بھی نہین لگی ہے۔ ویسے ہی ہرے اور کچے رکھے ہین۔ مگر کاٹ کے کھائیے تو نہایت ہی پُرلطف اور لذیذ ہوتے ہین۔ اسی قسم کا ایک واقعہ آج ہی کل کے زمانے مین ہمارے مکرم دوست سید علی اوسط صاحب کو پیش آیا۔ اُن کا بیان ہے کہ موجودہ خاندانی رؤسائے لکھنؤ مین سے نواب علی نقی خان نے ایک دن مجھسے کہا کہ رات کا کھانا ذرا انتظار کرکے کھائیے گا مین کچھ بھیجون گا۔ رات کو حسب وعدہ کھانے کے وقت اُن کا آدمی ایک خوان لے کے آیا۔ مین نے ذوق شوق سے خوان اپنے سامنے منگوا کے کھلوایا تو اُس مین صرف ایک پلیٹ تھی اور اُس پر ایک کچّا کدو رکھا ہوا تھا دیکھ کے طبیعت نہایت منغّص ہوئی۔ انتہا ے یاس سے مین نے ماما سے کہا اسے لیجاکے رکھو۔ کل پکا لینا۔ مگر شاہزادے صاحب کے آدمی نے ہنس کے کہا "اسے کاٹ کے یون ہی کھائیے۔ پکانے کی ضرورت نہین" اب مین نے جو اُسے کاٹا تو عجیب لذیذ اور مزے کی چیز نظر آئی۔ اور ایسا کبھی نہین کھایا تھا۔
رکابدارون نے سچ یہ ہے کہ اس قسم کی صنعتون مین یہان عجیب عجیب کمال دکھائے تھے۔ پیر علی رکابدار مٹھائی کا انار بنا تا تھا۔ جس مین اوپر کا چھلکا۔ اندر کے دانے۔ اُن کی ترتیب۔ اور اُنکے بیچ کے پردے سب اصلی معلوم ہوتے۔ دانون کی گٹھلیان بادام کی ہوتین۔ ناشپاتی کے عرق کے دانے ہوتے۔ دانون کے بیچ کے پردے اور اُوپر کا چھلکا دونون شکر کے ہوتے۔
علی العموم رکابدار مربے اور اچار وغیرہ اور طرح طرح کی مٹھائیان تیار کرتے۔ جن مین صدہا قسم کی ترکیبین اور عجیب عجیب صنعتین اور نفاستین دکھائی

جاتیں۔ آم کا مربّہ سب نے کھایا ہے مگر یہاں رکابدار سلم ہری کیریوں کا مربہ تیار کرتے۔ اور ان میں ویسے ہی سبز چھلکے اپنی اصلیت پر قائم رہتے بس یہ معلوم ہوتا کہ تازی کیریاں ابھی توڑ کے لائی اور شیرے میں ڈال دی گئی ہیں۔

(۳۰)

مذکورہ تمام تکلفات نے دعوتوں اور حصوں کے لیے جو کھانے علی العموم منتخب کر دیے تھے اُنکے مجموعے کا نام تورا تھا۔ جس میں لازمی طور پر حسب ذیل غذائیں ہوتیں (۱) پلاؤ۔ (۲) مزعفر (۳) متنجن (۴) شیرمال (۵) سفیدہ دمیٹھے چاول جن میں زعفران کا رنگ نہ دیا گیا ہو) (۶) بورانی کے پیالے (۷) شیر برنج کے خوانچے (۸) قورمہ (۹) تلی ہوئی اروبیاں گوشت میں (۱۰) شامی کباب (۱۱) مربہ (۱۲) اچار یا چٹنی۔ اکثر جگہ توڑے میں اِن میں سے بعض چیزیں کم وبیش بھی کر دی جاتیں۔ مگر لکھنؤ میں علی العموم یہی کھانے مقبول تھے اور دعوتوں اور حصوں میں ان کے سوا اور کوئی چیز کم ہوتی تھی۔ دعوتوں میں یہ چیزیں دسترخوان پر ہر شخص کے سامنے جدا جدا پلیٹوں میں چنی جاتیں اور کہیں بھیجنا ہوتا تو یہی تورہ لکڑی کے خوانوں میں رکھ کے اہتمام سے بھیجا جاتا۔

انگریزوں میں رواج ہے کہ میز پھولوں گلدستوں اور طرح طرح کی زینتوں سے آراستہ کی جاتی ہے۔ اس کا اس قدر نمونہ یہاں بھی تھا کہ امیروں نوابوں اور شاہزادوں میں جو تورے تقسیم ہوتے اُن میں کھانوں کے درمیان میں کاغذ کے پھولوں کا ایک گلدستہ بھی رکھ دیا جاتا۔ جس کو عوام اور اوسط درجے کے لوگوں نے فضول سمجھ کے ترک کر دیا۔

جن معزز سرکاروں اور اعلیٰ درجے کی ڈیوڑھیوں میں کھانا جاتا اُنکے رتبے اور درجے کے مطابق توڑے میں الوان نعمت کا شمار بھی بڑھ جاتا۔ بادشاہ کے محل میں خاص جہاں پناہ کے لیئے ایک سو ایک خوانوں کا تورہ جاتا۔ جس کی لاگت کا اندازہ پانچ سو روپیہ کا تھا۔ فرماں روایان اودھ میں واجد علی شاہ کے دادا امجد علی شاہ بڑے ثقہ اور متقی و پرہیزگار فرماں روا تھے۔ سنا ہے

سمجھتے۔ اور امر شریعت کی پوری پابندی کرتے۔ اور کوئی کام بغیر جناب قبلۂ وکعبہ کی اجازت کے نہ کرتے۔ انھون نے جوش اتقا مین ملک کا روپیہ اپنی ذات پر صرف کرنا حرام تصور کیا۔ اور اپنے تمام اعزا سے خواہش کی کہ ہمین دعوت مین بجاے کھانے کے تم لوگ نقد روپیہ بھیجا کرو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ پانچ سو روپیہ بھیجا کرتے۔ مگر انکے ساتھ خوشنودی مزاج کے لیے ایک تورا بھی ضرور بھیجا جاتا۔ جس کے لیے اس کی پابندی نہ تھی کہ ایک سو ایک خوان ہون۔

خوانون کی شان عام سوسائٹیون مین یہ تھی کہ لکڑی کے خوان اُن پر رنگین تیلیون کا گنبد نما جھابہ۔ اُسپر ایک سفید کپڑے کا کسنا جو چوٹی کے اوپر باندھ دیا جاتا۔ اور شاہی باورچی خانے اور معزز امرا مین دستور تھا کہ اُس بندھن پر لاکھ لگا کے مُہر بھی کر دی جاتی۔ تاکہ درمیان مین کسی کو تصرف کا موقع نہ ملے پھر اُس کسنے کے اوپر نہایت پُر تکلف رنگین اور اکثر ریشمی خوان پوش ہوتا۔ یہ خوان پوش بڑی سرکارون مین لازمی طور پر اطلس اور کمخاب یا زربفت کے ہوتے۔ اور کبھی فقط لچکا ٹانک دیا جاتا یا کارچوب کا کام ہوتا۔

ممکن ہے کہ یہ طریقہ دربار مغلیہ مین بھی جاری ہو۔ اور وہین سے لکھنؤ مین آیا ہو مگر ہم نے ان تکلفات کو جس اعلی پیمانے پر لکھنؤ مین دیکھا دہلی مین نہین دیکھا۔ یہان کھانے پینے کے ادنے ادنے معاملے مین یہ تکلفات لازمی اور طبیعت ثانیہ ہو گئے ہین۔ کسی معمولی شخص کے لیے بھی فقط پانی مانگا جائے تو خدمتگار نہایت نفاست کے ساتھ گلاس کو تھالی مین رکھ کے اور اس پر بھرا ڈھانک کے لائے گا اور ادب سے پیش کرے گا۔

اس شوق۔ اس نفاست۔ اور ان تکلفات نے سو ہی برس کے اندر لکھنؤ مین ایسے باکمال باورچی پیدا کر دیے جن کی ہندوستان کے ہر شہر اور ہر دربار مین شہرت اور قدر تھی۔ اور مین نے ہندوستان کے تمام مسلمان دربارون اور ریاستون مین جہان گیا لکھنؤ ہی کے باورچیون کو پایا۔ جن کو خاص امرا اور والیان ملک کے مزاج مین دخل تھا اور اُن کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ اس سے انکار

نہین کیا جا سکتا کہ اب حیدرآباد دکن - بھوپال - اور رامپور مین بڑے بڑے صاحب کمال باورچی موجود ہین - لیکن اگر آپ اُن کی اصلیت کا پتہ لگائین اُن کے خاندان کا پتہ لگائین اور اُن کی ترقی کی تاریخ پر غور کرین تو یہی ثابت ہوگا کہ باورچی یا تو وہ لکھنؤ کے ہین یا لکھنؤ سے آئے ہوے باورچیون کی نسل سے ہین یا کسی لکھنوی باورچی کے شاگرد ہین -

ہم باورچی خانے کا حصہ ختم کر چکے مگر ابھی مٹھائیون کا ذکر باقی ہے - مٹھائیون کا بنانا ہندو حلوائیون کا کام ہے - اور انھین کی مٹھائیون سے عام پبلک آشنا ہوئی ہے - لیکن مٹھائیان تیار کرنے مین مسلمان رکابدارون کا درجہ بڑھا ہوا ہے - رکابدار عوام کی ضرورتون کو نہین پورا کر سکتے - اس لیے کہ یہ ہندو حلوائیون کا حصہ ہے - رکابدار خاص امیرون اور شوقین اور نفاست پسند امیرون کے لیے مٹھائیان تیار کرتے ہین جو بے نظیر اور بہت ہی لذیذ ہوتی ہین -

حلوائی لکھنؤ مین دو طرح کے ہین - مسلمان حلوائی اور ہندو حلوائی - مسلمان حلوائیون کی شان یہ ہے کہ اگر عام قسم کی مٹھائی لی جائے تو اُن کی دکان کی چیز ہندو حلوائیون کی دوکانون سے اچھی نہین ہوتی - لیکن اگر فرمائش کر کے اُن سے خاص قسم کی تکلفی مٹھائی بنوائیے تو ہندو حلوائیون کی مٹھائی سے بہت زیادہ اچھی اور بہت ہی نفیس ولذیذ ہوتی ہے - لیکن علی العموم لکھنؤ مین جلیبیان - امرتیان اور بالوشاہی بہت اچھی بنتی ہین -

مٹھائیون مین یہ امتیاز کرنا دشوار ہے کہ کون اصلی ہندوون کی ہے اور کون مسلمانون کے ساتھ ہندوستان مین آئی - لیکن نامون اور مذاق پر قیاس کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلوا خالص عربی چیز ہے - جو عرب سے ایران ہوتا ہوا ہندوستان مین آیا اور اپنا نام بھی ساتھ لیتا آیا - لیکن بظاہر یہ عام فیصلہ نہین ہو سکتا - اس مین تفریق ہے - تر حلوہ جو عموماً حلوائیون کے وہان ملتا ہے اور پوریون کے ساتھ کھایا جاتا ہے وہ خالص ہندو چیز ہے - جسے وہ موہن بھوگ بھی کہتے ہین - مگر حلوا سوہن کی چار قسمین پپڑی - جوزی - حبشی - اور دودھیا یہ خالص مسلمانون کی معلوم ہوتی ہین - جدید عربی مذاق کے حلوے جو جنوبی ہند خصوصاً مدراس مین مروج

ہین - اُن کا پتہ نہین - وہ واقعی خالص عربی حلوے ہین جو براہ راست عرب سے ہندوستان مین آگئے -

مگر ہندو حلوائیون کی اکثر مٹھائیان بھی مسلمانون ہی کے زمانے کی ایجاد معلوم ہوتی ہین - مثلاً برفی کا نام بتا رہا ہے کہ اُسے فارسی وعجمی مذاق نے ایجاد کیا - بالوشاہی خرمے - نکتیان - گلاب جامن - دربہشت - وغیرہ بھی عہد اسلام کی ایجادین ہین - جلیبی کو عربی مین زلابیہ کہتے ہین - اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ زلابیہ ہی سے بگڑکے جلیبی کا لفظ بنا ہے - اس لیے یہ بھی انھین عربی و فارسی مٹھائیون مین شامل کرنے کے قابل ہے - پیڑا خالص ہندی مٹھائی ہے اور امرتیان بھی ہندی ہین - مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ امرتی خاص لکھنؤ مین ایجاد ہوئی - فی الحال ان مٹھائیون کے اعتبار سے لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہین - جو درجہ بلندی ہند کے تمام ممتاز شہرون کو حاصل ہے وہی لکھنؤ کو بھی حاصل ہے - بلکہ یہ عجیب تماشا نظر آتا ہے کہ لکھنؤ مین تو آگرے اور پنجاب کے حلوائی زیادہ مشہور ہین - اور دوسرے شہرون مین مجھے یہ نظر آیا کہ لکھنؤ اور اطراف لکھنؤ کے حلوائیون کو زیادہ نمود حاصل ہے - دراصل اس کو کسی دُکان کے چل جانے سے تعلق ہے - اس لیے کہ جس حلوائی کی دُکان جس قدر زیادہ چل جاتی ہے اُسی قدر اُسے مٹھائیون مین ترقی کرنے کا موقع مل جاتا ہے -

حلوائیون کی نسبت اصلی فیصلہ یہ ہے کہ ہندو حلوائیون کا درجہ بہت بڑھا ہوا ہے مٹھائیون کے جتنے قدردان ہندو ہین مسلمان نہین - مسلمانون کو شاید گوشت خوری کی وجہ سے علی العموم نمکین کھانون کا زیادہ شوق ہے - بخلاف اُنکے ہندو مٹھائیون کے زیادہ شوقین ہین - وہ فقط مٹھائیون سے پیٹ بھر لیتے ہین جو مسلمانون سے غیر ممکن ہے - اور ہندوؤن کی رغبت کی وجہ سے متھرا - بنارس اور اجودھیا جو ہندوون کے مذہبی مرکز ہین مٹھائیون کے اقسام اور مزے کے اعتبار سے دوسرے شہرون پر فوقیت رکھتے ہین -

مگر حلوا سوہن کے بنانے مین مسلمان رکابدارون کے علاوہ اور بہت سے لوگون نے بھی شہرت حاصل کی - آخر زمانے مین یہان کے مشہور خوشنویس منشی ہادی علی صاحب نے پپڑی حلوا سوہن مین خاص ناموری حاصل کی - وہ سیر بھر سمنک مین پچیس تیس

سیر گھی کھپا دیتے۔ اور اُس کی ٹکیون پر عجیب عجیب قسم کے خوبصورت طغرے بناتے جن سے حلوا سوہن بنانے کے ساتھ خوشنویسی اور نقاشی کے کمالات بھی ظاہر ہوتے۔ اسکے بعد مین نے مٹیا برج (کلکتہ) مین منشی السلطان بہادر کو جو لکھنؤ کے ایک رئیس زادے تھے اپنی آنکھون سے بارہا دیکھا کہ چھٹانک بھر سمنک مین دو ڈھائی سیر گھی کھپا دیتے۔ جو فی سیر چالیس سیر کے قریب پڑا۔ ان کا پپڑی حلوا سوہن بجائے زرد کے دھوئے کپڑے کے مانند اُجلا اور سفید ہوتا۔

(۳۱)

باورچی خانے اور کھانون کی ایجاد و ترقی کے متعلق ہم کافی درجے تک لکھ چکے ہین۔ لیکن اتنا اور کہنا چاہتے ہین کہ یہان اور عموماً ایشیائی ممالک مین خوش مزگی پیدا کرنے کے ساتھ اس بات کی بھی کوشش اہمیت کے ساتھ کی جاتی تھی کہ لطافت ذوق کے ساتھ غذاؤن مین اعلیٰ درجے کی روح افزا خوشبوئین پیدا ہون۔ رنگ نفیس اور دلکش رہے۔ صورت نظر فریب اور شوق دلانے والی ہو۔ اگرچہ ہندوستان کے تمام شہرون مین جہان لوگون کو اچھا کھانے کا شوق ہے اِن تمام امور کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ لکھنؤ سب جگہ سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ کسی جگہ کھانے کا سچا ذوق چند امیرون اور مخصوص لوگون تک محدود رہا ہے۔ مگر یہان قریب قریب ہر شخص مین ایک صحیح ذوق پیدا ہو گیا۔ اچھے باورچی ہی نہین پیدا ہوے بلکہ معزز اور شریف گھرانون کی عورتون مین رکابدارون سے زیادہ نفاست مزاجی اور ذوق کی خوش سلیقگی پیدا ہو گئی۔ کوئی معزز خاندان نہین ہے جس کی محترم بیگمون مین سے ہر ایک کھانا پکانے مین اچھا سلیقہ نہ رکھتی ہو۔ اور اُسے کسی اچھی غذا کے تیار کرنے مین دعوے نہ ہو۔

دودھ دہی کا ہر جگہ رواج ہے۔ لکھنؤ مین ان دونون چیزون کے علاوہ بالائی کی تیاری مین زیادہ توجہ ہوئی۔ اس لیے کہ دودھ کا لطیف ترین حصہ اُس مین آ جاتا ہے۔ انگریزی مین اسی کو "کریم" کہتے ہین۔ جسکا رواج یورپ مین کثرت سے ہے۔ مگر وہان کریم اس کا نام ہے کہ دودھ تھوڑی دیر رکھا رہے اور جب دُہنیت کا سفید اور لطیف حصہ اوپر آ جائے تو کاچھ کے الگ کر لیا جائے

یہان دودھ کا یہ لطیف حصہ ہلکی آگ پر رکھ کے اور جما کے الگ کیا جاتا ہے۔ اور بڑی نفاست سے اُس کی تہ پر تہ جما دی جاتی ہے۔ بالائی کی تہون کو نفاست اور خوشنمائی سے جمانا ایسا کام ہے جو لکھنؤ کے سوا شاذ ونادر ہی کسی اور شہر کے لوگون کو آتا ہوگا۔

اس کو پرانی زبان مین مَلائی کہتے ہین۔ آصف الدولہ بہادر نواب اودھ کو یہ اس قدر پسند تھی کہ خاص اہتمام سے اُن کے لیے تیار کی جاتی۔ اُنھون نے اس کا نام مَلائی کے عوض بالائی رکھ دیا۔ اس لیے کہ یہ دودھ کے اوپر کی چیز ہے۔ اہل لکھنؤ کو اپنے فرمان روا کا یہ تصرف بہت پسند آیا۔ اور بالائی کا لفظ زبانون پر اس قدر چڑھ گیا کہ اب لکھنؤ مین سوا دیہاتیون یا ہندو جہلا کے سب اسے بالائی ہی کہتے ہین اور ملائی کا لفظ کسی مہذب شخص کی زبان پر باقی نہین رہا۔

اس پر مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم نے آب حیات مین اعتراض کردیا اور انصاف کو ذوق سلیم پر محول فرمایا۔ جس معیار سے اُنکے مذاق مین "ملائی" کا لفظ بالائی سے زیادہ لطیف و فصیح ہے۔ کسی لفظ کو محض اپنے مذاق کے اعتبار سے غیر فصیح کہدینا میرے نزدیک ایک بے معنی سی چیز ہے۔ اس لیے کہ ہر جماعت کو وہی الفاظ اپنے ذوق مین اچھے معلوم ہوتے ہین جو اُن لوگون کی زبان پر چڑھے ہون اور اُن کے لہجے اور محاورے سے مانوس ہوگئے ہون۔ جن شہرون کے لوگ ملائی کہتے ہین انکو بے شک بالائی کا لفظ گران گذرتا ہوگا۔ اور اُن کی زبان سے ناآشنا ہوگا۔ مگر جس شہر مین لوگ بالائی کہتے ہین اور یہی لفظ اُنکے محاورے مین شامل ہوگیا ہے اُن کو جو فصاحت بالائی مین نظر آتی ہے ملائی مین ممکن نہین۔ اُن کو مَلائی جاہلون اور گنوارون کا لفظ معلوم ہوتا ہے۔ فصاحت و لطافت زبان کا اندازہ کسی خاص ذوق یا کسی منطق سے نہین ہوتا بلکہ جو لوگ اہل زبان مان لیے جاتے ہین فقط اُن کا ذوق اور محاورہ معیار قرار پا جاتا ہے اور سب کو بغیر کسی منطقی دلیل کے اُن کی پیروی کرنا پڑتی ہے۔ اُردو کے لیے اب دہلی و لکھنؤ دونون اہل زبان کے مستند اسکول سمجھے جاتے ہین۔ لہذا دونون مسلم الثبوت معیار سخن ہین۔ چاہے ایک کا لفظ دوسرے کو

غیر مانوس ہی کیون نہ ہو۔ یہ اور بات ہے کہ لکھنؤ کی زبان کو سچا اور مستند معیار رہی نہ تسلیم کیا جائے۔ لیکن اس جھگڑے مین ہم پڑنا نہین چاہتے۔ اور غالباً یہ جھگڑا طے بھی ہو چکا ہے۔ بہرحال اگر دونون شہر معیار مانے جائین تو ملائی اور بالائی سجائے خود دونون فصیح ہین۔ ملائی اہل دہلی کے نزدیک اور بالائی اہل لکھنؤ کے نزدیک۔ کسی کو کسی پر اعتراض کرنے کی کوئی وجہ نہین ہو سکتی۔

کھانے کے پکانے سے زیادہ یا اُسی کے برابر ضرورت کھانون کے نکالنے مین اچھا سلیقہ دکھانے۔ اور نکالنے کے بعد اُسکے آراستہ کرنے اور سجنے کی ہے۔ یورپ کا موجودہ مذاق یہ ہے کہ میز خوب آراستہ کی جاتی ہے۔ اُسپر جابجا گلدستے لگائے جاتے ہین۔ اور بعض جگہ تکلف کے لیے کچے چاولون کو مختلف رنگون مین رنگ کے اُن سے میز پر حروف اور نقش و نگار بنا دیے جاتے ہین۔ ظروف بھی نہایت صاف ستھرے قیمتی اور اکثر چاندی کے کام مین لائے جاتے ہین۔ مگر خاص کھانے کی سجاوٹ کا انگریزی باورچیون یا خانساماؤن کو چندان خیال نہین ہوتا۔ بجز شادیون کے کیک کے جو امرا اور لارڈون کے عروسی ڈنرون مین عجیب تکلفات سے بُرجون یا خوبصورت عمارتون کی وضع مین بنا کے دعوت ولیمہ کی میز پر لگا دیے جاتے ہین۔

اسکے خلاف ہندوستان مین دسترخوان کی آراستگی کی طرف تو کم توجہ کیجاتی ہے مگر خود کھانے اعلیٰ درجے کی نفاست سے نکال کے سجے جاتے ہین۔ اُن پر چاندی سونے کے ورق لگائے جاتے ہین۔ پستہ اور بادام کی ہوائیون سے نقش و نگار اور رنگ رنگ کے پھول بنائے جاتے ہین۔ کھوپرے کے ورق کاٹ کاٹ کے نہایت ہی موزون ترتیب سے اُنپر آراستہ کیے جاتے ہین۔ اس فن مین رکابدارون کو خاص کمال حاصل ہے۔ بلکہ اُن کا کام یہی ہے کہ جس خوبی سے غذاؤن کو تیار کرین اُس سے زیادہ خوشنمائی سے انکو سجین۔ اور ہر لبیٹ کو ایک گلدستہ بنا دین۔

لکھنؤ مین یہ تکلفات اہل پیشہ باورچیون اور رکابدارون سے شروع ہو کے شرفا کے عام گھرون مین پہونچ گئے۔ اور خاتونون اور بیگمون کو اس مین ایسا

اچھا سلیقہ ہوگیا کہ جو خوبی پلیٹون اور قابون کے سجنے مین اکثر دہ دکھاتی ہین خود رکابدارون سے بھی ممکن نہین - اگرچہ یہ خاص اُنھین کا ہنر ہے - یورپ کے محققین نے طے کر دیا ہے کہ عورتین فنون لطیفہ سے خاص مناسبت رکھتی ہین - خصوصاً کسی چیز کے سجنے اور آراستہ کرنے مین ان کو بالطبع مردون پر فوقیت حاصل ہوتی ہے اس کا ثبوت ہندوستان مین لکھنؤ کی اُن عورتون کی طبیعت داری سے مل سکتا ہے جو کھانون کے سجنے مین کمال دکھا دیا کرتی ہین -

ہندوستان کے عروسی کے کیک جن کا ابھی ذکر ہو چکا چو کھے ہین - جو عموماً رسم کے طریق سے شادیون مین دولہا دولھنون کے سامنے لگائے جاتے ہین اُن کو اکثر گھرون کی خاتونین ایسی نفاست مزاجی اور ذہانت وطباعی سے آراستہ کرتی ہین کہ جی چاہتا ہے بیٹھے اُنھین دیکھا کیجیے -

کھانے کے ساتھ ہی آبدارخانے کی ترقیون کو بھی بیان کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا - آبدارخانہ بادشاہون اور امیرون کے پانی کے انتظام کا نام ہے - اگلے دنون برف نہ تھی - اور بعض موسمون مین ٹھنڈا پانی ملنا نہایت ہی دشوار ہوتا تھا - اسکے لیے اُن دنون خاص قسم کے انتظام کیے جاتے تھے - پانی کورے گھڑون مین بھر کے رکھا جاتا - نازک اور نفیس آبخورے پینے کے لیے موجود رہتے - گھڑون اور آبخورون پر سرخ کپڑا چڑھا دیا جاتا - اور وہ تر رکھا جاتا - اس لیے کہ ہوا لگنے سے بھیگا کپڑا خوب ٹھنڈا ہو جائے اور قدیم تک کہ گرم ہوا اور لو بھی جتنی زیادہ گرم ہوتی اُتنا ہی زیادہ ہوتا ہے کہ ٹھنڈا کر دیتی - اور کپڑے کی ٹھنڈک اندر کے پانی کو ٹھنڈا کیا کرتا - عورت اور اور صراحیان بلکہ گھڑے بھی منہ پر کپڑا باندھ کے کسی درخت کی ٹہنیون سے بدن ڈھانکے لٹکا دیے جاتے - ہوا کا اندر نفوذ نہ ہونے کی وجہ سے نہ پہونچ گئے تھے اُنھون ٹھنڈا ہو جاتا - برسات مین جب یہ تدبیر بھی کامیاب ہو قریب کے اندرونی علاقون کنوؤن کے اندر لٹکا دیے جاتے جہان اُن مین خوب

اس کے علاوہ سب سے بڑا انتظام یہ تھا کہ - شربت - اور غذا مین پہنچتے موجود رہتین - اور وہ تہ خانون مین شورہ اور با

جاتیں - اس تدبیر سے تھوڑی دیر میں پانی میں برف کی سی خنکی پیدا ہو جاتی - اور اُس کی ٹھنڈک نہایت ہی لطیف و خوشگوار ہوتی - اس تدبیر کو صراحیوں کا جھلنا کہتے تھے -

بعد کے زمانے میں برف کے فراہم کرنے کی بھی ایک معقول اور دیرپا تدبیر نکال لی گئی تھی - جاڑوں کے چاڑوں میں جب سردی خوب شدت پر ہوتی کھیتوں اور کھلے میدانوں میں رات کو گلی رکابیوں اور پیالوں میں گرم گرم پانی بھر کے رکھ دیا جاتا جو صبح کو جما ہوا ملتا - اس برف کو اُسی وقت فوراً زمین کے اندر گہرے کھتوں میں جو پہلے سے کھدے تیار رہتے دفن کر دیتے - اور ان میں وہ برف جب تک دبی رہتی اپنی حالت پر قائم رہتی - بہرحال اس طریقے سے اتنی برف بنا کے کھتوں میں بھر دی جاتی کہ سال بھر کے لیے کافی ہوتی - اور اُسی میں سے ہر روز نکال لی جاتی - مگر یہ برف اس قدر صاف نہ ہوتی کہ پانی میں ملائی جائے - بلکہ شورے کی طرح اُس میں نمک اور شورا ملا کے صراحیاں جھلی جاتیں - یا برف کی قلفیاں جمائی جاتیں -

مگر یہ انتظام خاص بادشاہوں یا اُن کے ہم رتبہ امیروں تک محدود رہتا - غریب لوگ اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکتے - غربا اور متوسط درجے کے لوگ انھیں اولی الذکر تدبیروں سے کام لے کے پانی ٹھنڈا کرتے - اور یہ اہتمام اس قدر ا[illegible] تھا کہ تھوڑا بہت ہر گھر میں رہتا -

لکھنؤ میں پانی کے لیے یہ اہتمام اُن دنوں ہوا کرتا - اور نفاست [illegible] ات پیدا کر دیے تھے کہ مٹی اور جست کی صراحیوں اور ایسے اکثر سرخ شالباف (ڈول) کا کپڑا چڑھا ہوتا - اور ڈول پر [illegible] سے لپیٹ کے اُن میں ایسا لطف پیدا کر دیا جاتا کہ [illegible] کے آنکھوں میں خنکی پیدا ہو جاتی -

[illegible] کا یہ انتظام جو میں نے بیان کیا ہے پورا [illegible] غالباً وہاں ضرور ہوگا - اور وہیں سے پہ[illegible] گر میں نے اس اہتمام اور سامان کو جس تکمیل کے

ساتھ اور جس نعیم سے لکھنؤ کے لوگوں میں دکھایا تھا دہلی میں نہیں دکھایا۔ ممکن ہے کہ وہاں بھی ایسا ہی ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ لکھنؤ میں آکے مٹی کے ظروف آب کی لطافت و نفاست اور نزاکت بہت بڑھ گئی۔ اس لیے کہ یہاں کی مٹی کی عمدگی کی وجہ سے جیسے نازک وخوشنما اور خوش قطع ظروف گلی لکھنؤ میں بن سکتے ہیں اور کہیں نہیں بن سکتے۔ دہلی والوں کے پاس جست کی صراحیاں ایسی ہی ہونگی مگر ایسی مٹی کی صراحیاں وہاں کسی کو نصیب نہیں ہو سکیں۔ ان ظروف گلی کا حال ہم آیندہ مناسب موقع پر بیان کریں گے۔

بادشاہوں کے ساتھ جہاں وہ جائیں باورچی خانہ اور آبدار خانہ بھی جایا کرتا تھا۔ لیکن یہاں آبدار خانے کا انتظام دوسرے امرا کے وہاں بھی اس قدر بڑھ گیا تھا کہ بہت سے امرا تھے جو اپنا آبدار خانہ اپنے ساتھ رکھتے۔ چنانچہ مرزا حیدر صاحب کا آبدارخانہ اور بھنڈی خانہ اس فیاضی کے اصول پر قائم تھا کہ وہ جس شادی کی محفل میں جاتے ساری محفل کو پانی اور حقہ پلانے کا انتظام انھیں کے سپرد ہو جاتا۔ اور اُن کی شرکت محفل بہت سے لوگوں کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ اور رحمت الٰہی بن جاتی۔

(۳۲)

اب ہم اس دربار اور لکھنؤ کے لباس پر بحث کرنا چاہتے ہیں جو دراصل نہایت ہی دلچسپ بحث ہے۔ ہندوستان کے لباس کی تاریخ نہایت تاریکی میں ہے۔ مسلمانوں کے آنے سے پیشتر ہندوستان میں جہاں تک پتہ لگایا جائے اور قدیم مورتوں اور آلوز وغیرہ کی تصویروں پر غور کیا جائے یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے آنے سے پہلے یہاں سیے ہوے کپڑے کا رواج نہ تھا۔ عورت اور مرد دونوں بے سی ہوئی چادروں۔ ساریوں۔ اور دھوتیوں سے بدن ڈھانکتے تھے۔ عرب سیاح جو فاتحان اسلام سے پہلے ہی یہاں پہونچ گئے تھے انھوں نے سندھ سے لے کے بنگالے تک ہر ساحلی شہر اور قریب کے اندرونی علاقوں میں یہاں کے لوگوں کو اسی وضع میں پایا۔

پہلے عرب مسلمان جو یہاں پہونچے وہ اگرچہ کرتے۔ تہمت۔ اور عبا میں پہنتے

تھے مگر لباس و وضع مین اُنھین یہان کے لوگون پر کچھ زیادہ فوقیت نہین حاصل تھی۔ لباس مین ترقی اُسوقت سے شروع ہوئی جب ساسانی معاشرت اختیار کرکے بغداد کے عباسی دربار نے شرفاے عرب کے لیے پائجامے۔ عبا و قبا اور خوش قطع عمامے ایجاد کیے۔ جو لباس کہ کلیۃً یا زیادہ تر ساسانی دربار کے امرا و اعیان کی وضع سے ماخوذ تھا۔ چند ہی روز مین یہی لباس اُن تمام مسلمانون کا ہوگیا جو مصر سے دریاے سندھ کے کنارے تک پھیلے ہوے تھے اور آخر وہ اس لباس کو لیے ہوے ہندوستان مین آئے۔ تصویرون مین جو لباس عہد اولین کے مسلمان تاجداران ہند کا نظر آتا ہے وہ قریب قریب وہی ہے جو کبھی دعباسی امرا و فرمان رواؤن کا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہان کے سلاطین ہند راجاؤن کی تقلید مین جواہرات بہت زیادہ پہنا کرتے تھے۔

دہلی مین دربار مغلیہ کا آخری لباس جو ہمین معلوم ہو سکا یہ تھا کہ سر پر پگڑی۔ بدن مین نیمہ جامہ۔ ٹانگون مین ٹخنون سے اونچا تنگ مُہری کا پائجامہ۔ پانوٗن مین اونچی ایڑی کا کفش نما جوتا۔ اور کمر مین جامے کے اوپر پٹکا۔ بس یہی دہلی کے قدیم شرفا کی وضع تھی۔ جس مین محمد شاہ رنگیلے کے زمانے تک کسی قسم کا رد و بدل نہین ہوا تھا۔ اور اگر ہوا بھی ہو تو اتنا نہ تھا کہ ہم کو نظر آسکے۔

اس لباس مین نیمے سے مراد کہنیون تک کی آدھی آستینون کا شلوکا تھا۔ اور سینے پر سامنے اُس مین گھنڈیان لگائی جاتین۔ اسکو نیچے پہن کے اُسکے اوپر جامہ پہنا جاتا۔ جو کبھی قبا مین ترمیم کرکے بنایا گیا تھا۔ اُس مین گریبان نہ ہوتا۔ بلکہ دونون جانب کے کنارے جو "پردہ" کہلاتے۔ ترچھے ایکدوسرے پر آکے سینے کو ڈھانک لیتے۔ سینے کا بالائی حصہ جو گلے کے نیچے ہوتا ہے اُسی طرح کھلا رہتا جیسے آجکل انگریزی کوٹون مین کھلا رہتا ہے۔ اور جس طرح فی الحال قمیص سینے کے اوپر والے حصے کو چھپاتا ہے اُسی طرح اُن دنون نیمہ اُسکو ڈھانکے رکھتا۔ سینے پر جامے کا وہ پردہ جو بائین طرف سے آتا نیچے رہتا۔ اور

داہنے پہلو پر بندون سے باندھ دیا جاتا۔ اور اس پر داہنی طرف کا پردہ رہتا۔ جو اوپر بائین پہلو مین باندھا جاتا۔ پھر اس مین کمر کے پاس سے دامنون کی جگہ ایک اسکرٹ سی جوڑ دی جاتی جو ٹخنون کے اوپر تک لٹکتی رہتی۔ اس مین بہت سی چُنٹ دی جاتی۔ اور اُس کا گھیر بہت بڑا ہوتا۔ جامے کی آستینین آدھی کلائی تک بے سی اور کھلی رہتین۔ اور دونون جانب لٹکا کرتین۔ اُس کے نیچے سیدھی سادھی تنگ مُہریون کا پائجامہ ہوتا جو اُمرا مین مشروع اور گلبدن کا ہوا کرتا۔ پھر جامے کے اوپر کمر مین پٹکا باندھ لیا جاتا۔

دو تین صدی پیشتر ہمارے بزرگون اور ہندوستان کے امیرون اور تمام شریفون کا یہی لباس تھا۔ ٹوپیون۔ پگڑیون۔ اور پائجامون مین جو ترمیمین ہوئین اُن کا مفصل و مشرح حال ہم بعد بیان کرین گے۔ سردست ہم درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا ذکر کرتے ہین جو سچ پوچھیے تو اصلی لباس ہے اور اسی سے انسان کی وضع قطع مشخص و معین ہوتی ہے۔ یہی اُس دور کا درباری لباس تھا اور یہی لباس پہنے ہوے نواب بُرہان الملک منصور جنگ اور شجاع الدولہ دہلی سے اودھ مین آئے تھے۔ جامہ عموماً باریک ململ کا ہوتا جو ہندوستان کے مختلف شہرون مین نہایت نفیس۔ باریک۔ اور سبک بنا کرتی اور ساری دنیا مین مشہور تھی۔ ڈھاکے کی ململ اور جامدانی عالی مرتبہ امیرون اور بادشاہون کے لیے مخصوص تھی۔

اسکے بعد ایرانی قبا سے ماخوذ کر کے بالابر ایجاد ہوا۔ جس مین گول گریبان بالکل کھلا رہتا۔ اس لیے کہ سینے کے ڈھاکنے کے لیے نیمہ کافی تھا جو اُسکے نیچے بھی پہنا جاتا۔ وہ چُنٹ اور گھیر اس مین سے نکال دیا گیا۔ اور اس ضرورت سے کہ دامن آگے کی طرف نہ کھلین۔ داہنے دامن مین ایک چوڑی کلی لگا دی جاتی یہی کلی اُس کلی کا نقش اولین ہے جو فی الحال شروانیون مین بائین جانب نیچے لیجا کے بند سے باندھی یا ہُک سے اٹکائی جاتی ہے۔ بالابر بھی دہلی ہی کی ایجاد ہے۔

اسی بالابر پر ترقی کر کے دہلی ہی مین انگرکھا ایجاد کیا گیا جس مین دراصل

جامہ اور بالابر دونون کو ملا کے ایک نئی قطع پیدا کی گئی - اس مین سینے پر چولی قبا سے لی گئی - مگر سینہ کھلا رکھنے کی جگہ ایک گول اور لمبوترا گریبان بڑھایا گیا - جس کے اوپر گلے کے نیچے ایک ہلال نما کنٹھا لگایا جاتا اور وہ بائین طرف گردن کے پاس گھنڈی تکمے سے اٹکا دیا جاتا - چولی نیچے رہتی جس مین پہلے داہنی طرف کا پردہ نیچے بغل مین بندون سے باندھا جاتا اور پھر اوپر بند ہوتے - جس سے دونون طرف کے پردے سینے کے نیچے بیچون بیچ مین لاکے باندھ دئے جاتے - اُس مین بائین جانب تھوڑا سا سینہ کھلا رہتا - چولی نیچی رہتی - اور نیچے دامن اگرچہ قبا کے سے ہوتے مگر پرانے جامے کی یادگار مین دونون پہلوون پر بغلون کے نیچے چُنٹ ضرور رکھی جاتی -

یہ پرانا انگرکھا تھا جو دہلی کے آخری دور مین رواج پا چکا تھا اور وہان سے سارے ہندوستان مین پھیل گیا - لکھنؤ مین آنے کے بعد اس انگرکھے مین زیادہ چستی اور قطع داری پیدا کی گئی - چولی خوب گول اونچی اور کھنچی ہوئی چُست ہو گئی - بغلون کی چُنٹ بالکل نکل گئی - دامنون مین بجاے موڑ کے ٹانک دینے کی سنجافی گوٹ لگائی گئی - پھر اُس کے بعد نواب زادون اور شوقین وضعدارون نے ایک کرتوں کے عوض جو چولی کے نیچے بند لگانے کی جگہ پر ہوتی پلیٹون کی وضع سے تین تین کرتیان اٹھائین - جابجا گوٹ اور کرتیون کے پاس کٹاؤ کا کام بنایا -

دہلی مین انگرکھے کے ایجاد ہونے کے بعد نیمہ چھوٹ گیا تھا - اور بائین جانب سینے کا کھلا رہنا معیوب نہ تھا بلکہ وضعداری خیال کیا جاتا - لکھنؤ مین اُس کے نیچے نیمے کے عوض شلوکا ایجاد ہوا جس مین آگے کی طرف بوتام لگائے جاتے - اس لیے کہ اب یورپ کے بوتام یہان پہونچ گئے تھے - شلوکون مین خاص وضعداریان دکھائی جاتین - نازک مزاج لوگ جالی یا باریک کے چست شلوکے پہنتے جن مین بیچ سوت ... نقش و نگار کاڑھے جاتے - بعض لوگ رنگین شلوکے پہنتے اس لیے کہ اُسکے بیل بوٹے اور اُس کا رنگ تنزیب کے سپید انگرکھے کے نیچے سے اپنی جھلک دکھا کے خاص لطافت اور خاص نفاست

پیدا کر سکے۔

دوسری ترمیم بالا برمیں دربار کے لکھنؤ آنے کے بعد یہ ہوئی کہ چپکن کے نام سے ایک چست قبا ایجاد ہوئی۔ اس میں ویسا ہی گول گریبان رکھا گیا۔ اور اس میں انگرکھے کی طرح سینے پر پردہ بھی لگایا گیا مگر وہ پردہ داہنی جانب قوس کا صورت میں بوتاموں سے اٹکایا جاتا۔ اس میں داہنی جانب گلے کے پاس سے بوتاموں کی ایک خوشنما قوس گولائی لیتی ہوئی کوڑی تک آتی اور اسکے مقابل دوسری جانب کی قوس میں اصلی قبا میں سی دیا جاتا۔ اس میں بھی بالابر کی طرح چوڑی کلی اوپر لگائی جاتی جو بغل کے نیچے بائیں طرف بوتام یا گھنڈی سے اٹکا دی جاتی۔ یہ چپکن جو شالی یا کسی اور بھاری کپڑے کی ہوتی اور جاڑوں کے موسم کے لیے زیادہ موزون تھی۔ ایک زمانے میں یہاں اہل دربار اور خاصۃً اہل کار ربار یا بات دربار کا معزز لباس تھی۔ اسے انگریزوں نے بھی بہت پسند کیا۔ اور اپنے ملازموں کو ایک مدت تک وہی پہناتے رہے۔

سب کے بعد لکھنؤ کے بالکل آخری عہد میں چپکن اور انگرکھے دونوں کے ترتیب دینے سے اچکن ایجاد ہوئی۔ اس میں انگرکھے اور چپکن کا سا گریبان قائم رکھا گیا۔ جو بیچ سے سیدھا کاٹ کے آدھا آدھا دونوں جانب [illegible] دیا جاتا۔ اور سلائی کی جگہ پر سنجافی گوٹ کے ذریعہ سے گریبان کی گولائی قطع برقرار رکھی جاتی۔ بیچ کے چاک میں جو گلے سے لے کے سیدھا کوڑی تک آتا بوتام لگا دیے جاتے۔ وہ بالابر کی کلی جو اوپر لگائی جاتی تھی اس میں نیچے کر دی گئی تاکہ دامن بھی نہ کھلیں اور بالابر کی کلی کے اوپر کی طرف لگانے سے جو بدمذاقی ظاہر ہوتی تھی دور ہو جائے۔ اچکن کا نیچے کا حصہ بالکل چپکن اور انگرکھے کا سا ہوتا۔ شوقین لوگ اس میں بھی ویسی ہی دردامن گوٹ اور اسی طرح کی تینوں تین کمر توئیان لگاتے۔ اور [illegible] بناتے۔

یہ آخری ایجاد اچکن لوگوں کو بہت پسند آئی۔ اس کا رواج [illegible] گذر کے دہلی [illegible] کی شہرت ہوا۔ اور [illegible]

یہی اچکن حیدرآباد پہونچ کے تھوڑی سی ترمیم کے بعد شیروانی بن گئی۔ وہان اس کی آستینین انگریزی کوٹ کی سی کر دی گئین۔ گریبان جو گوٹ لگا کے سینے پر نمایان کیا جاتا تھا نکال ڈالا گیا۔ قطع و برید مین انگریزی کوٹ کی وضع دامنون وغیرہ مین بھی اختیار کی گئی اور وہ لباس ایجاد ہوگیا جو آج کل ہندوستان کے ہندو مسلمان تمام لوگون کا قومی لباس کہے جانے کے قابل ہے۔ لکھنؤ والون نے بھی چند روز بعد جب اپنی پُرانی ایجاد مین حیدرآباد کی مناسب اصلاح دیکھی تو اُسے بہت ہی پسند کیا۔ اور تھوڑے ہی زمانے مین شیروانی کا رواج ہر شہر اور قریے کی طرح لکھنؤ مین بھی ہو گیا۔

انگرکھے کے نیچے جو شلوکا پہنا جاتا تھا اُس کے عوض پہلے ڈھیلا اور اُونچا کُرتا اختیار کیا گیا۔ اور چند روز بعد مغربی اثر نے کُرتا چھُڑا کے انگریزی قمیص کو رواج دیا جس مین کف اور کالر ہوتے ہین۔ قمیص اور کالر کے رواج سے شیروانی کے تکلفات اور بڑھ جائے۔ یعنی لازمی ہوگیا کہ سفید کالر اوپر نکلا رہے۔ اور شیروانی کا اوپر کا سرا گلے پر ہُک سے اٹکا کے قمیص کے اُس بالائی بوتام کے نیچے رہے جس مین کالر لگایا جاتا ہے۔ آستینین اتنی رہین کہ کفون کا کسی قدر حصہ نکلا رہے۔ تعلیم یافتہ لوگون اور متوسط طبقے والون کا لباس دوسرے شہرون کی طرح فی الحال لکھنؤ مین بھی یہی شیروانی ہے۔ مگر اسکو لکھنؤ سے خصوصیت نہین۔ لکھنؤ کی ایجاد و اختراع کا خاتمہ اچکن پر ہو گیا۔ جو اب قریب قریب بالکل متروک ہو گئی ہے۔

(۳۴)

درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا حال ہم بیان کر چکے ہین۔ لہذا اب اس جزو لباس کی طرف توجہ کرتے ہین جو سر کے لیے مخصوص ہے۔ اور اسی لباس کی ہندوستان مین زیادہ عزت و حرمت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ جس طرح سر سارے جسم مین ممتاز ہے اُسی طرح اُسکے لباس کو بھی زیادہ ممتاز ہونا چاہیے۔ قدیم الایام سے ہندوستان مین پگڑی باندھنے کا رواج چلا آتا ہے۔ اگرچہ عربی و عجمی بھی عمامے باندھے ہوئے یہان آئے اور اُنکی حکومت قائم ہو جانے کی وجہ سے پگڑی کی

پگڑیون مین بہت کچھ تغیر ہوگیا لیکن یہ نہین کہہ سکتے کہ مسلمانون کے آنے سے پہلے یہان پگڑی ہی نہ تھی۔

ابتدائی دور کے مسلمان فرمان رواؤن کے عمامے بڑے بڑے تھے۔ اور اسی لحاظ سے اُن دنون تمام معززین و اُمرا اور دولتمندون کی پگڑیان بھی غالباً بڑی بڑی ہون گی۔ جن کے نیچے قدیم ترکی وضع کی نوکدار مخروطی ٹوپیان ہوتین جو افغانستان مین آج تک مروج اور موجود ہین۔ اور انھین سے لے کے ہماری ہندوستانی فوج کی وردیون مین شامل کی گئین ہین۔

سلطنت مغلیہ کے عہد مین پگڑیان روز بروز چھوٹی ہونے لگین۔ اور اسکی وجہ یہ ہے کہ سرد ممالک مین جس طرح سردی کی مضرت سے بچنے کے لیے جو جو زمانہ گذرتا ہے لباس وزنی اور گُندہ ہوتا جاتا ہے ویسے ہی گرم ملکون مین سُبک ہلکا اور مختصر ہوتا رہتا ہے۔ اگلے مسلمان فاتح جیسے بھاری اور موٹے کپڑے پہنے ہوے یہان آئے ہون گے اُنکے وزنی ہونے کا اندازہ تو ہم فقط قیاس سے کر سکتے ہین مگر انگریزون کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہین کہ اُن کا اور اُن کی عورتون کا لباس روز بروز کس قدر سُبک۔ ہلکا۔ اور مختصر ہوتا جاتا ہے۔

اسی اصول کے مطابق یہان پگڑیان روز بروز ہلکی اور چھوٹی ہوتی گئین۔ اور ملک کا یہ رجحان دربار کی وضع پر بھی اثر کرتا گیا۔ دربار مغلیہ کے آخر عہد مین اُمرا اور منصبدارون کی پگڑیان بہت ہلکی ہوگئی تھین۔ اور اسی اختصار پسندی نے یہ بات پیدا کی کہ پگڑیون کی صدہا قطعین ہوگئین۔ اور اکثر اُمرا نے اپنے لیے خاص بندشین اور خاص وضع کی چھوٹی چھوٹی پگڑیان ایجاد کرلین۔

پگڑیون کے اختصار نے ترکی کلاہ کو ترک کرا دیا۔ اور یہ حالت ہوگئی کہ کسی کی پگڑی کے نیچے ٹوپی ہوتی ہی نہ تھی۔ اور بعض پہنتے بھی تھے تو کسی بہت ہی باریک کپڑے کی ذرا سی ٹوپی جو پھونک مین اُڑ جائے۔ ان ٹوپیون کی نسبت ہمین وثوق کے ساتھ نہین معلوم ہے کہ کس وضع کی ہوتی تھین۔ غالباً اُن ٹوپیون کی قطع ان ٹوپیون نی نطع سے ملتی ہوئی ہو گی جو اب مشائخ اور فقرا کے سرون پر ہوتی ہین۔ یعنی ایک چھ سات اُنگل کی چوڑی پٹی کا سر کے

برابر ایک حلقہ بنا یا جائے اور اُوپر کی جانب چنٹ وسے کے وہ سمیٹ دیا جائے۔

لیکن چند روز مین ضرورت محسوس ہوئی کہ گھر مین اور بےتکلفی کی صحبتون مین پگڑی اُتار کے رکھدی جایا کرے۔ لیکن ننگے سر رہنا چونکہ معیوب ہے اسلیے کسی قسم کی ٹوپی سر پر ضرور رہے۔ اس ضرورت کے پورا کرنے کےلیے دہلی مین تاج کی وضع سے لے کے ایک کمرخی ٹوپی ایجاد ہوئی۔ جس مین اُس گول حلقے کے اوپر جو سر مین پہنا جاتا تھا چار کونے نکلے رہتے۔ اس وضع کی ٹوپی اب بھی بعض بعض امرا و شاہزادگان دہلی کے سرون پر نظر آجایا کرتی ہے۔ یہ ٹوپی صحیح معنون مین چوگوشیہ کہلاتی تھی۔ چند روز کے اندر اس ٹوپی مین بھی ترمیم و تنسیخ کا عمل شروع ہوا۔ اور دہلی ہی مین وہ کمرخی کونے نکال کے ایک گول قبہ نما ٹوپی ایجاد ہوگئی۔ جس مین چار پان ایسی قطع سے کاٹ کے جوڑے جاتے کہ ایک لمبوترا قبہ سر پر نظر آتا۔ یہی ٹوپی پہنے ہوے لوگ لکھنؤ مین آئے۔ اور اُسوقت سے اُس مین دربار لکھنؤ کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہان پہلی ترمیم یہ ہوئی کہ پانون کے جوڑون پر لمبی صراحیان بنائی گئین۔ اور اُن صراحیون کے درمیان خوشنما چاند قائم کیے گئے۔ یہ چاند اور صراحیان اس طرح بنائی جاتین کہ باریک تنزیب کے پانون مین نین سُکھ کی صراحیان اور چاند کاٹ کے اندر کی طرف ٹانک دیے جاتے جو اوپر نمایان ہو کے ٹوپی مین ایک اچھی نفاست۔ صفائی۔ اور سادگی پیدا کرتے۔ یہ ٹوپی یہان بہت پسند کی گئی۔ عام لوگون نے یکایک پگڑی باندھنا چھوڑ دیا۔ اور ہر مہذب و شائستہ آدمی کے سر پر یہی ٹوپی نظر آنے لگی۔

عام مقبولیت نے اُسکی قطع اور درست کی۔ لمبوترا پن موقوف ہو کے نہایت مناسب گولائی پیدا کی گئی۔ اور لکڑی اور تانبے کے قالب ایجاد ہوے تاکہ اُن پر کھینچ کے یہ چوگوشیہ ٹوپیان (جو دہلی والی پُرانی کمرخی ٹوپیون کا نام اپنے ساتھ لیتی آئی تھین) خوب قبہ دار اور گول کر لی جائین۔

اتنے مین نصیر الدین حیدر کا زمانہ آیا جبکہ لکھنؤ مین مذہب شیعہ کو خوب فروغ تھا۔ اور مذہب۔ سیاست۔ تمدن۔ اور معاشرت ہر چیز مین اپنے مذاق کے مطابق اصلاحین کر رہا تھا۔ خلفاے اربعہ کی مخالفت اور پنجتن کی محبت نے

لکھنؤ کی درباری معاشرت نے چار کے عدد کو بُرا اور پانچ کے عدد کو محبوب بنا دیا تھا۔ جس کا اثر ٹوپی پر یہ پڑا کہ بربنائے بعض مستند روایات خود جہان پناہ کی ہدایت کے مطابق اس چوگوشیہ ٹوپی مین چار کے عوض پانچ پان کر دیے گئے۔ جس کی وجہ سے اُس مین پانچ صراحیان اور پانچ پان ہو گئے۔ اور نام بھی بجائے چوگوشیہ کے پنجگوشیہ قرار دیا گیا۔ لیکن اصل ٹوپی مین جو ترمیم ہوئی تھی وہ تو اس قدر مستقل ہو گئی۔ چار پانون کی ٹوپیان بالکل فنا ہو گئین۔ اور کسی کو یاد بھی نہ رہا کہ کبھی اُن مین فقط چار پان ہوا کرتے تھے۔ مگر چوگوشیہ کا نام نہ مٹ سکا۔ آج تک باقی ہے اور زبانون پر وہی ہے اگرچہ بعض لوگ پنجگوشیہ بھی کہتے ہین مگر زیادہ لوگ ایسے ہی ہین جو اس پانچ پانون والی ٹوپی کو آج تک چوگوشیہ کہتے ہین۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ اودھ نے یہ پانچ پانون والی ٹوپی ابتدائً خاص اپنے لیے ایجاد کی تھی۔ اور اُنکی زندگی مین رعایا مین سے کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس ٹوپی کو پہنے۔ مگر اہل شہر کو یہ وضع اس قدر پسند آگئی تھی کہ اُن کی آنکھ بند ہوتے ہی ہر ادنیٰ و اعلیٰ نے اسی کو اختیار کر لیا۔ اور لکھنؤ کے تمام مہذب و شایستہ لوگون کے سرون پر یہی گول قبہ نما ٹوپی نظر آتی تھی۔

چند روز بعد جاڑون کی ضرورت سے اسی قسم کی نہایت نفیس کامدار ٹوپیان ایجاد ہو گئین۔ جن مین پانچون پانون مین زربفت یا زری بوٹی کی زمین پر دوسرے رنگ کی ریشمی زمین دے کے قیطون سے چاند اور صراحیان بنائی جاتی تھین۔ اور تمام وضعدار لوگون کے سرون پر جاڑون کے موسم مین اُن کے سوا اور کوئی ٹوپی نہ ہوتی۔ اس کے بعد جب چکن کا رواج ہوا تو موسم گرما کے لیے اسی کام کی چوگوشیہ ٹوپیان ایسی اعلیٰ درجے کی نفیس و خوشنما بننے لگین جو سال سال بھر کی محنت مین تیار ہوتین اور دس دس بارہ بارہ روپئے تک اُن کی قیمت پہونچ گئی۔

اُسی زمانے مین دہلی کے ایک شاہزادے وارد لکھنؤ ہوے۔ جن کی دربار اور سوسائٹی نے بڑی عزت کی۔ وہ دوپلڑی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ جس مین سر کے

لمبان کے مناسب دو لمبے پتلے بیضاوی صورت مین کاٹ کے جوڑ دیے جاتے تھے۔ اُن کی یہ سادی ٹوپی اکثر لوگون کو پسند آئی۔ اس لیے کہ وہ نسبتہً زیادہ سادی اور تیاری کے اعتبار سے آسان تھی۔ بہت سے لوگون نے یہ ٹوپی اختیار کر لی۔ اور عوام مین اس کا اس قدر رواج ہوا کہ آج یہی دوپلڑی ہندوستان کی قومی ٹوپی ہے۔ وہ شاہزادے یہان کے لوگون مین "دوپلڑی ٹوپی والے شاہزادے" مشہور ہو گئے۔ اور کروڑون خلقت کے سر اُنکی ایجاد اور تراش کے آج تک زیر بار ہین۔ یہان تک کہ شاہی کے آخری دَور مین اسی دوپلڑی سے لیکے یہان ایک بہت چھوٹی تیلی ٹوپی ایجاد ہوئی جس مین آگے پیچھے دونون طرف دو نوکین نکلی ہوتین۔ یہ نکّے دار ٹوپی کہلاتی تھی۔ اور اس قسم کے بھاری کام کی ٹوپیان خاص شاہزادون۔ صاحب دولت رئیسون اعزائے شاہی اور اعلیٰ درجے کے نواب زادون کے ساتھ مخصوص تھین۔

الحاصل غدر کے زمانے تک اہل لکھنؤ مین دو ہی طرح کی ٹوپیون کا رواج تھا۔ اول چوگوشیہ جو مہذب اور ثقہ لوگون کے ساتھ مخصوص تھی۔ اور دوسری دوپلڑی جو شاہزادون سے لے کے ادنیٰ طبقے والون تک تھوڑے تھوڑے تغیر وضع کے ساتھ مروج تھی۔ اور آج عام لباس ہے۔

غالباً غازی الدین حیدر یا نصیرالدین حیدر کے زمانے ہی سے ایک گول ٹوپی کا بھی خاص خاص لوگون مین رواج ہو گیا جو مندیل کہلاتی۔ اس کی قطع ڈفلی کی سی ہوتی۔ اور اکثر کارچوب کے کام کی پسند کی جاتی۔ دولتمندون اور بعض نواب زادون نے اسکو زیادہ موقر وشئین تصور کر کے اختیار کیا۔ اور اُسے یہ خصوصیت دی گئی کہ بادشاہ اور شاہزادون کے سامنے بغیر پگڑی باندھے یا کارچوب کی مندیل پہنے کوئی شخص نہ جا سکتا تھا۔ غرض مندیل کو دربار مین جگہ دے دی گئی۔ اسی مندیل سے ماخوذ وہ گول ٹوپی تھی جس کے اوپر کے کونے ذرا گولائی لیے ہوتے اور جنرلی ٹوپی کہلاتی۔ یہ عموماً سیاہ مخمل کی ہوتی اور اُس پر سچے سنہرے کلابتون کا سچا کام ہوتا۔ اصل مین یہ ٹوپی سرکار انگریزی کی فوج مین گورون کو دی گئی تھی۔ اور بظاہر اُس مین وردی کی شان بھی تھی

مگر انگریزون کی تقلید کا غالباً پہلا نمونہ یہی تھا کہ یہ فوجی اور جنرلی ٹوپی شاہزادون اور خاندانی امیرون کے لباس مین داخل ہوگئی۔

آخری شاہ اودھ واجد علی شاہ نے اپنے دربار کے خطاب یافتہ معززین کے لیے ایک نئی اور عجیب قسم کی درباری ٹوپی ایجاد کی۔ اس مین کاغذ کا سقوا دیکے ایک گول حلقہ سادے اطلس یا کارچوبی کام کا بنایا جاتا جو پیشانی پر زیادہ اونچا ہوتا۔ اُس مین اوپر کی طرف تنزیب۔ گرنٹ یا جالی کی ایک بڑی سی جھولی بنا کے جوڑ دیجاتی۔ اور پہننے مین وہ جھولی پیچھے گُدّی تک لٹکتی اور سر کے پچھلے حصے پر پڑی رہتی۔ اس درباری ٹوپی کا نام بادشاہ نے "عالم پسند" رکھا تھا۔ اور اکثر عوام اُسے "جھولا" کہتے۔ مگر یہ اس قدر غیر مقبول اور ناپسندیدہ وضع تھی کہ واجد علی شاہ کی زندگی مین بھی اُنکے دربار کے باہر اُن لوگون کے سرون پر بھی نظر نہ آسکتی جن کو وہ عطا ہوئی تھی۔ اور اُنکے بعد تو اس قدر مٹ گئی کہ آج کل کے لوگون نے شاید اُسے کبھی دیکھا بھی نہ ہوگا۔

غدر کے بعد لکھنؤ مین یکایک ٹوپیون کی دنیا مین ایک انقلاب عظیم شروع ہوگیا۔ چند روز تک تو چوگوشیہ۔ دوپلڑی۔ اور مندیلون یا پگڑیون کے سوا سر کا کوئی لباس نہ تھا۔ اسکے بعد یکایک چوگوشیہ ٹوپی کا رواج چھوٹنا شروع ہوا۔ یہان تک کہ اب اس کے لیے صرف چند پُرانے وضعدار سر رہ گئے ہین۔ اِن ٹوپیون سے جو سر خالی ہوگئے اُن مین سے اکثر نے دوپلڑی اختیار کی۔ لیکن بعض جدتین تلاش کرنے لگے۔ چند روز تک میرٹھ کی سوزنی کار مندیل نما ٹوپیون کا دور رہا۔ اسکے بعد انگریزون کی نائٹ کیپ یا کشمیر کی اونی لمبی چندوے دار ٹوپیان مروج ہوئین۔ پھر اُن کی وضع سے ماخوذ کرکے گرنٹ یا سٹین کی پتلی پتلی ٹوپیان اختیار کی گئین جو مختصر ہوتے ہوتے دوپلڑی کے قریب پہونچ گئی تھین۔ اب انگریزی عہد کی وضعداریان شروع ہوئین۔ اور سر کے لیے اُن کے لباس سے ملتا جلتا لباس ڈھونڈھا جانے لگا۔ بعض بزرگون نے تو ہر طرف سے آنکھین بند کرکے بلا تامل ہیٹ یا انگریزون کی نائٹ کیپ پہننا شروع کردی۔ لیکن اب ترکی ٹوپی کا دَور شروع ہوگیا تھا۔ اس ٹوپی کو سید احمد خان

مرحوم نے اختیار کیا تھا۔ اور مسلمان جنٹلمین کے لیے کوٹ پتلون مین اُس کا جوڑ لگایا تھا۔ اس وجہ سے ابتدائً یہ ٹوپی نہایت ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھی گئی۔ نیچریون کی ٹوپی اُس کا نام پڑ گیا۔ اخبارون مین اُس پر ہزارون پھبتیان کہی گئین۔ مگر سرسید کے استقلال نے اُسے مروج کر ہی کے چھوڑا۔ اُنکی زندگی ہی مین لاکھون آدمی اُسے پہننے لگے۔ یہان تک کہ لکھنؤ مین بھی آ پہونچی۔ بہتون نے علی رغم المخالفین یہان بھی اسے پہننا شروع کر دیا۔ لیکن اندر ہی اندر اسکی طرف لوگون کا رجحان اس قدر بڑھا کہ اب سارے ہندوستان مین اکثر تعلیم یافتہ اور مہذب مسلمان اسی ٹوپی کا استعمال کر رہے ہین۔

لکھنؤ مین معزز تعلیم یافتہ اور شایستہ شیعہ ہندوستان کے تمام شہرون سے شاید زیادہ ہین۔ اور اُن مین اس بات کی تحریک بمقابل سنیون کے بڑھی ہوئی ہے کہ ہر بات مین اپنے آپ کو متمائز کرین۔ اور اپنے شعائر و اوضاع جداگانہ قرار دین۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ جس طرح اہل سنت دولت عثمانیہ کے طرفدار ہین شیعہ دولت قاچاریۂ ایران کے پیرو و جانبدار ہین۔ لہذا جب لکھنؤ مین ترکی ٹوپی کا رواج بڑھنا شروع ہوا جو ترکون کی ٹوپی ہے تو متعدد شیعون کو خیال ہوا کہ بجاے ترکی ٹوپی کے دربار عجم کی کلاہ پاپاخ کو اپنے لیے اختیار کرین۔ یہ تحریک پورا کام کر گئی۔ اور اب یہ حالت ہے کہ جو مسلمان اپنی پُرانی ٹوپیون کو چھوڑ کے نئی ٹوپی اختیار کرتے ہین وہ اگر سُنّی ہین تو ترکی ٹوپی پہننے لگتے ہین اور اگر شیعہ ہین تو ایران کی پرشین کیپ کو اختیار کرتے ہین۔ اگرچہ دونون فریقون مین بعض ایسے روشن خیال بھی موجود ہین جو مسلمانون کی اس اندرونی اعتقادی تفریق کو مٹانا چاہتے ہین۔ اور باوجود سُنّی ہونے کے ایرانی یا باوجود شیعہ ہونے کے ترکی ٹوپی پہنتے ہین۔ مگر ایسے لوگ کم ہین۔ مسلمانان شہر کے جدید المذاق لوگون کی عام وضع یہی ہے کہ شیعہ ایرانی اور سنی ترکی ٹوپی پہنتے ہین۔

مسلمانون کی یہ باہمی تفریق دیکھ کے ہندو تعلیم یافتہ لوگون نے علی العموم گول مندیل نما فلٹ کیپ اختیار کر لی۔ جس کو بعض مسلمان بھی پہنتے ہین۔ مگر ہندو انگریزی دانون کی وضع مین بکثرت داخل ہو جانے کی وجہ سے انگریزون نے اُس کا نام

باوزکیپ" رکھ دیا ہے مگر عوام ہندو ہون یا مسلمان شیعہ ہون یا سُنّی دوپلڑی ہی پہنتے ہین -

غدر کے بعد جو زمانہ گذرا یہ لکھنؤ کی سوسائٹی کے لیے عظیم الشان کون و فساد کا زمانہ تھا - معاشرت اور اخلاق و عادات کے ساتھ لوگون کے لباس اور وضع مین بھی تغیر ہونے لگا - اور تعلیم یافتہ جماعت مین کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنھون نے اپنی معاشرت کے ساتھ اپنی وضع بھی بالکل چھوڑ دی - نہ اُن کی ٹانگون مین پائجامہ رہا نہ بدن پر انگرکھا - نہ پانؤن مین چڑھوان جوتا رہا نہ سر پر ٹوپی یا پگڑی - بلکہ ایک ہی جست مین وہ ساتون سمندر پھاند کے ہندوستان سے انگلستان مین کود پڑے - اور کوٹ - پتلون - بوٹ - اور ہیٹ اُن کا لباس ہوگیا - لیکن آبادی کے غالب گروہ نے اپنی وضع برقرار رکھنا چاہی - تاہم بغیر اس کے کہ وہ محسوس کرین اُن مین بھی تغیر ہوا - اور انگرکھے کے عوض شیروانی اُن کا قومی لباس بن گئی - لیکن سر کے لیے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ابھی تک کوئی ایسی ٹوپی نہین منتخب ہو سکی جس کو سب بلا تامل اختیار کر لین -

اس کون و فساد اور ردو بدل کے زمانے مین لکھنؤ مین بیسیون ٹوپیان پیدا ہوئین جو یا خود ہین کی ایجادتھین یا کسی اور قوم یا مقام سے ماخوذ تھین - اُن مین سے جو چند روز تک ٹھہر سکین اُن پر لکھنؤ کے اصلی مذاق نے بہت کچھ تصرف بھی کیا مگر آخر کو ترک ہو گئین - اہل لکھنؤ کا طبعی رجحان اس جانب ہے کہ ہر چیز حتی الامکان نازک - نفیس - چھوٹی - چُست - اور سُبک ہو - ہر وضع و لباس مین ان لوگون نے اسی مذاق کا تصرف کیا - اور اکثر ٹوپیون مین بھی اس قسم کا تصرف ہوا - مگر ترکی ٹوپی - ایرانی ٹوپی - اور ہیٹ مین یہ لوگ مطلق تصرف نہ کر سکے - جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ٹوپیان دوسری قومون سے بنی بنائی لیجاتی ہین اور باہر سے آتی ہین - اور اسی تصرف نہ ہو سکنے کی وجہ سے ہمارا خیال ہے کہ ان ٹوپیون مین سے ایک بھی باوجودیکہ بکثرت مروج ہوگئی ہین لکھنؤ کے مذاق سے جدا ہونے کے باعث یہان کا قومی لباس نہ بن سکے گی - اور ٹوپی کا

مسئلہ تا حال موجدان لباس کی مجلس میں زیر غور و تجویز ہے۔

(۳۴)

اگرچہ ہندوستان خصوصاً لکھنؤ میں سر کا قومی لباس ٹوپی ہے مگر یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہاں کی نزاکت پسندی نے پگڑی کو فنا کر دیا۔ درباروں میں علی العموم پگڑیوں کا رواج تھا۔ وہ دہلی کی باوقعت امیرانہ دستاریں تو بیشک یہاں نہیں باقی رہیں۔ اور امرا اور اعزائے شاہی کے سروں پر فقط ٹوپیاں رہ گئیں۔ مگر دربار کے لیے پگڑیاں آخر عہد تک مخصوص تھیں۔ اور عام ملازمین کا اخلاقی فرض تھا اور اب بھی بڑی وسیع حد تک ہے کہ آقا کے سامنے جائیں تو سر پر پگڑی باندھ کے جائیں۔

خود حکمرانوں کے سروں پر پرانی دستار نواب سعادت علی خان کے زمانے تک رہی۔ نواب برہان الملک۔ نواب شجاع الدولہ اور نواب آصف الدولہ کے سروں پر وہی۔ دہلی کے عہدہ داران سلطنت کی سی سفید دستار ہوا کرتی جس پر بڑے درباروں کے موقعوں پر جواہرات کی کلغیاں۔ مرصع جیغے اور سرپیچ لگا لیے جاتے۔ مگر فی نفسہ وہ دستاریں سادی اور سفید ہوتی تھیں۔ مگر نواب سعادت علی خان کے سر پر ہمیں ایک نئی قسم کی پگڑی نظر آتی ہے جس کو اہل لکھنؤ اپنی زبان میں شملہ کہتے تھے۔ یہ شملہ یہاں اس طرح بنایا جاتا کہ بھراؤ میں کپڑے کا ایک چوڑا اور پتلا گردار حلقہ سر کی ناپ کے برابر بنایا جاتا جو بیچ میں خالی اور کھلا رہتا۔ پھر کسی نفیس ریشمی یا شالی کپڑے کی پتلی پتلی بہت لمبی بتی بنا کے اُس کے سیکڑوں پیچ اُس کپڑے کے حلقے پر نیچے اور اوپر برابر برابر لپیٹ کے ٹانکے دیے جاتے۔ اس حلقے میں اوپر کی جانب ایک چوڑی پٹی ویسے ہی ریشمی یا شالی کپڑے کی جوڑ دی جاتی۔ تاکہ وہ اس حلقے کو نیچے اُترنے سے روکے رہے۔ مگر اُس سے پوری چندیا ڈھک نہ سکتی تھی۔ اس لیے اُس کے نیچے کوئی معمولی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی ضرور رہتی۔ یہ تھا لکھنؤ کا آدی شملہ جس کو پہلے پہل نواب سعادت علی خان نے پہنا۔ اور غالباً وہ وسط ہند کے ہندو اور مسلمان درباروں کی اُن پگڑیوں سے ماخوذ تھا جو کسی باریک رنگین کپڑے

کی صد ہا گز کی تہیون کو خاص خاص ترتیبون سے لپیٹ کے بنائی جاتی تھین۔ نواب سعادت علی خان نے اس شملے کو خود ہی نہین پہنا بلکہ معززین دربار اور عمائد سلطنت اور وزرا کو بھی وہی عطا ہوا۔

غازی الدین حیدر کو دولت انگلشیہ نے بادشاہ بنا کے تاج پہنا دیا۔ جو در اصل ہندوستان اور ایشیا کا تاج شاہی نہ تھا بلکہ ایک قسم کا یورپ کا تاج تھا۔ اُسوقت سے فرمان روایان لکھنؤ نے شملے یا دستار کو بالکل چھوڑ دیا۔ اور اُنکے ساتھ تمام شاہزادون۔ نواب زادون اور عمائد شہر نے بھی پگڑی کو خیرباد کہدی۔ شاہزادے خاص موقعون پر تو تاج مگر علی العموم سالے دار بھاری کام کی کُنگّے دار ٹوپیان پہنتے اور اُنھین کی تقلید شہر کے دیگر معززین بھی کرتے۔

لیکن عہدہ داران سلطنت وزرا اور اہل کارون کو حکم تھا کہ شملہ پہن کے سلاطین و وزرا کے دربار مین آئین۔ غازی الدین حیدر کے زمانے سے امجد علی شاہ کے عہد تک تمام عہدہ دارون کے سر پہ وہی شملہ رہا کرتا تھا جس کی تصویر اپنے ناظرین کو ہم نے لفظون مین دکھا دی ہے۔ واجد علی شاہ نے جب اپنے دربار کی مخصوص ٹوپی عالم پسند (جھبولا) ایجاد کی تو معمول ہوگیا کہ جن لوگون کو زیادہ تقرب حاصل ہوتا اور "دولہ" کے خطاب سے سرفراز ہوتے اُن کو عالم پسند بھی عطا ہوتی۔ اُن کا فرض تھا کہ عالم پسند پہن کے دربار مین آئین۔ اُن سے کم درجے کے باریابان حضور جو کسی کارخانے یا محکمے کے داروغہ ہوتے اُن کو داروغگی کے خطاب کے ساتھ شملہ عطا ہوتا۔ اور وہ وہی پُرانا شملہ پہن کے حاضر ہوتے جو پہلے پہل نواب سعادت علی خان کے سر پر لوگون کو نظر آیا تھا۔ باقی تمام لوگون کو حکم تھا کہ کسی قسم کی پگڑی باندھ کے دربار مین آئین۔ اور پگڑی نہ ہو تو ٹوپی اُتار لین۔ اہلکارون کے جس شملے کا ہم نے ذکر کیا ہے اُسی قسم کا شملہ غالبًا مرشد آباد کے دربار مین بھی تھا۔ اور اُسی کا اثر تھا کہ آج سے پچاس برس پہلے ہم کلکتہ ہائی کورٹ کے بنگالی وکیلون کو اسی طرح کا شملہ پہنتے دیکھتے تھے لیکن وہ شملہ دربار اودھ کے شملون سے

سبک اور ہماری نظر مین ذرا اوچھا ہوتا۔

اب پگڑی کو سوا عہدہ دارون کے تمام خوش باش لوگون اور معززین شہر نے مطلقاً ترک کر دیا تھا لیکن اسپر بھی دربار مین اور نیز عوام مین پگڑی کی جو عزت دلون مین قائم تھی اور ہے اُس کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہوگا کہ شادیون کے موقع پہ ہر ادنیٰ و اعلیٰ طبقے مین دولھا کے سر پہ پگڑی ہی ہوا کرتی ہے۔ اور لکھنؤ کے شرفا مین تو عموماً بھاری کمخواب کے شملے کا رواج ہے۔

یہان کے دربار نے مذکورہ پگڑیون کے علاوہ ملازمین کے مختلف طبقون کے لیے جدا جدا وضعون کی پگڑیان بھی مخصوص کر دی تھین۔ اہل قلم یعنی محررون کے لیے اسی مذکورہ شملے کی سی سفید ململ کی پگڑی مخصوص تھی۔ دربار کے ہرکارے اور چوبدار بھی اسی قطع کی پگڑیان پہنتے۔ (اسلیے کہ وہ پگڑیان باندھی نہین بلکہ ٹوپی کی طرح پہنی جاتی تھین) فرق یہ تھا کہ ہرکارون کی پگڑیان سرخ ہوتین اور چوبدارون کی سفید براق۔ جن پہ آگے داہنی جانب مقیش کا ایک پھول بھی ٹنکا ہوتا۔ ہرکارون کی پگڑیون سے ملتی جُلتی پگڑیان کہارون کی ہوتین۔ اُن کی پگڑیون مین داہنی جانب کی کور پہ چاندی کی مچھلیان ٹنکی ہوتین۔ اور جسم پہ سرخ بانات کے ڈھیلے ڈھالے چغے ہوتے۔

ان کے علاوہ تمام فوجون اور معزز لوگون کے خدمتگارون مین بھی پگڑیون کا رواج تھا جو اپنی وضع پہ جدا اور خودرَو سی ہوتین۔

سب سے زیادہ معزز و محترم عمامے علما کے تھے۔ اور مناسب معلوم ہوتا ہی کہ اس موقع پہ پگڑیون کے سلسلے مین ہم علماے کرام و مقتدایان اُمت کے عمامون کے ساتھ پورے زی علما سے بحث کرین۔ لکھنؤ مین مسلمانون کے دو فرقون کے علما ہین۔ اول علماے اہل سنت۔ دوسرے مجتہدین و افاضل شیعہ۔ ان دونون کی وضع جداگانہ ہے۔ سنیون کو تقدس اور ثقاہت کی شان اہل عرب کے لباس مین نظر آتی ہے اور شیعون کو علماے فارس و عجم کی وضع مین۔ اسی مذاق و رجحان کے مطابق دونون گروہون کے علما کا لباس بھی ہے۔

آنحضرت صلعم کے عہد مبارک مین عربون کا عمامہ صرف اس قدر تھا کہ

کوئی مختصر سا کپڑا سر پر لپیٹ لیا جائے جس کو نہ کسی قطعداری سے علاقہ تھا اور نہ وضعداری سے۔ مگر جب خلفائے عباسیہ کے عہد میں عراق مستقر خلافت قرار پایا تو عجمی وساسانی لباس عمائد و اکابر عرب کی وضع میں داخل ہو گیا۔ بہرحال جو بڑے بڑے شاندار عمامے اور طیلسان وغیرہ عہد خلافت کے علمائے عرب نے اختیار کیے اُن کو عربی لباس مشکل سے کہا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے علمائے اہل سنت نے اگلے دنوں وہ عربی لباس چھوڑ کے دہلی کی درباری وضع اختیار کر لی تھی اور اس وضعداری کے ساتھ اُس لباس کو نباہا کہ آج ہندوستان کی سارے ابنائے وطن نے اُسے چھوڑ دیا مگر وہ ابھی تک اُسپر قائم ہیں۔

چنانچہ آج تک علمائے فرنگی محل کی اصلی وضع یہ ہے کہ ایک سیدھا گول عمامہ باندھتے ہیں جس کی بندش میں بالکل اس کی کوشش نہیں کی جاتی کہ پیشانی پر محراب کی قطع پیدا ہو۔ جسم میں اگلے زمانے کا جامہ ہوتا ہے جو سب جگہ بالکل خواب و خیال ہو گیا۔ پاؤں میں چوڑے اور عرض کے پانچوں کا ٹخنوں سے اونچا پائجامہ ہوتا ہے اور گلے میں ایک پتلا سا دوپٹہ پڑا ہوتا ہے۔ اس وضع میں ہمارے دو ایک بزرگان فرنگی محل آج بھی جمعے کی نماز پڑھانے کو آتے ہیں۔ مگر گھروں میں وہ معمولی سادی دو پلڑی یا چوگوشیہ ٹوپی۔ لمبا کُرتا جس میں گریبان کا چاک بیچ میں ہو یا انگرکھا اور عرض کے پانچوں کا پائجامہ پہنتے ہیں۔ فی الحال حدیث العمر علمائے فرنگی محل نے اب اس وضع کو چھوڑ کے علمائے حرمین اور مقتدایان شام و مصر کی وضع اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ جسے آخر میں مولانا شبلی نعمانی نے بھی قومی اور سرکاری درباروں کے لیے منتخب کیا تھا۔ ان بزرگوں کا جوتا بھی اگلے دنوں گھیتلا تھا مگر اب یا تو زیرپائیاں ہیں اور یا لکھنؤ یا دہلی کا چڑھواں جوتا۔

علمائے شیعہ کی وضع اس سے بالکل جدا ہے۔ وہ اول تو سر پر دو پلڑی ٹوپی پہنتے ہیں مگر عام لوگوں کے خلاف اُس کی سیون بجائے آگے سے پیچھے کی طرف رہنے کے آڑی یعنی ایک کان سے دوسرے کان تک رہتی ہے۔ اسپر لمبے اونچے قُبّے کا عمامہ اہل عجم کے عمامے کی بندش سے ملتا ہوتا ہے۔ بدن میں لمبا

کرتا - مگر اُسکے گریبان کا چاک بجاے اسکے کہ سینے کے بیچ مین ہو بائین شانے کے پاس ہوتا ہے - اگلے دنون علماے شیعہ کے کرتون مین گریبان کی جگہ دونون شانون پر ہوا کرتی تھی - مگر یہ وضع اب متروک ہو گئی ہے - جو علما ایران و کربلا ہو آئے ہین وہ کرتے کے اوپر اگلی طلیسان پہنتے ہین جو یہان قبا کہلاتی ہے - پانون مین چوڑے پانچون کا پائجامہ ہوتا ہے - اور علی العموم کفشین پہنتے ہین جنکا ذکر جوتون کے بیان مین آئے گا -

(۳۵)

سر اور درمیانی حصۂ جسم کے لباس کا حال تفصیل و وضاحت سے ہم بیان کر چکے اب اسفل جسم کے لباس کی طرف توجہ کرتے ہین - پھر اسکے بعد دیگر زوائد لباس اور مختلف گروہون کی خاص خاص وضعون کا اور اُنکے بعد عورتون کے لباس کا تذکرہ کرین گے -

نشیبی حصۂ جسم کے لیے عربون مین سوا تہمت کے کچھ نہ تھا - عربی تہمت اور ہندوون کی دھوتی دونون بے سی ہوئی پتلی چادرین ہوتی ہین - فرق یہ ہے کہ تہمت صرف کمر مین لپیٹ کے اٹکا لیا جاتا ہے - دھوتی ہندوستان کی مختلف قومون مین خاص خاص بندشون سے باندھی جاتی ہے - اُس کا ایک سرا نیچے سے پھیر دے کے پیٹھ کے نیچے گھرس لیا جاتا ہے اور دوسرے کو بعض لوگ کمر مین لپیٹ لیتے ہین - بعض چنٹ دے کے اور اوپر سے ناف کے پاس گھرس کے آگے لٹکا لیتے ہین - عربون کے تہمت نے اب کے زمانے مین یہ ترقی کی کہ اُس کے دونون سرے سی کے ایک حلقہ بنا لیا جاتا ہے - اور اُس مین دونون پانون ڈال کے اور کمر کے پاس اُسے سمیٹ کے بندش کر دیجاتی ہے -

ظہور اسلام کے وقت اور اُس سے مدتون پیشتر عربون کا قومی لباس زیرین یہی تھا - امیر و غریب بادشاہ و وزیر سب تہمت باندھتے - فرق اس قدر تھا کہ امرا و متکبرین عرب اپنی نخوت اور اپنے غرور کا اظہار اس طرح کرتے کہ یہ تہمت بہت نیچا اور زمین سے ملا ہوا ہوتا - جس مین سارے پانون چھپ جاتے - اور اُسکے دونون سرے زمین پر لوٹتے اور رگڑتے ہوے چلتے - چونکہ

اس وضع مین کبر و نخوت کی بو آتی اور جو شخص ایسا نیچا تہمت باندھ کے نکلتا
دوسرون کو اپنے سامنے ذلیل و حقیر خیال کرتا۔ اس وجہ سے اسلام نے اس
وضع کی سخت ممانعت کی۔ حکم دے دیا کہ اِزار (تہمت) ٹخنون سے نیچی نہ ہے
علما نے اسی حکم کی بنا پر فی الحال یہ فتوے دے رکھا ہے کہ پائجامہ یا ٹانگون
کا کوئی لباس ٹخنون سے نیچا نہ ہو۔ حالانکہ پائجامہ نہ اُن دنون تھا اور نہ
اس حکم مین شامل ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ نیچی اور زمین پر لوٹتی ہوئی ازار
باندھنے سے جو کبر و نخوت کا خیال اہل عرب مین پیدا ہوتا تھا ہندوستان
کے نیچے پائجامہ پہننے والون مین ہرگز نہین ہوتا۔

حضرت رسول خدا صلعم کے زمانے ہی مین پائجامہ دیگر ممالک و اقوام سے
عرب مین پہونچ گیا تھا۔ اور بعد کے زمانے مین بغداد کے دربار کا اور اُن عربون
کا جو عرب سے نکل کے دیگر ممالک مین متوطن ہو گئے تھے قومی لباس بن گیا۔
ہندوستان مین مسلمانون سے پہلے دھوتی کے سوا پائجامہ نہ تھا مسلمان فاتح
اسے اپنے ساتھ ہندوستان مین لائے۔ جن مین ملے ہوے چند ایسے عابد و
زاہد اور مقتدایان دین تھے جو سنت نبوی کی پیروی مین تہمت ہی باندھے
ہوے اس سرزمین پر آ گئے۔ تہمت چونکہ سنت ہونے کی وجہ سے ایک
خالص دینی لباس تھا۔ اس لیے بے نفس اور دیندار مسلمانون یا طالب علمون
ہی کے ساتھ مخصوص رہا مگر پائجامہ یہان کی سوسائٹی مین اس قدر عام ہو گیا
کہ مسلمان درکنار ہندوون اور یہان کی دوسری قومون مین اُس کا رواج ہو گیا۔

لیکن غور طلب یہ امر ہے کہ مسلمانون کا پہلا اور اصلی پائجامہ کس وضع کا
تھا؟ غالباً وہ تنگ مُہری کا اُٹنگا پائجامہ جو شرعی پائجامہ کہلاتا ہے اور اتقیاء
اہل سنت مین مروج ہے مسلمانون کا پہلا پائجامہ ہے۔ یہی بغداد مین مروج تھا۔
اسی کا رواج ایران و ترکستان مین ہوا۔ اور اسی کو پہنے ہوے مسلمان ہندوستان
مین آئے۔

ہندوستان کے آخر عہد مین اُس کی قطع مین اتنا تغیر ہوا کہ پائنچے یا مُہری
پنڈلی سے لپٹی رہتی۔ مگر اوپر کا گھیر قریب قریب اُتنا ہی ہوتا جتنا کہ پُرانے

شرعی پائجامے کا تھا - چند روز بعد مُہری کسی قدر لمبی اونچی ہوگئی مگر ٹخنون سے آگے نہین بڑھی - دہلی کے آخر عہد تک وہان اور سارے ہندوستان مین مسلمانون کا یہی پائجامہ تھا - اگرچہ ادنیٰ طبقے کے مسلمان ہندو عوام کی آمیزش سے دھوتیان باندھتے تھے - اور معزز درجے کے ہندو اپنے گھرون مین چاہے دھوتیان باندھے رہین مگر مہذب صحبتون مین آتے تو پائجامہ پہن کے آتے -

انھین دنون کابل و قندھار مین دو متضاد قسمون کے پائجامے مروج تھے کابل والون کا پائجامہ نیچے مُہری کے پاس تنگ اور اُوپر گھیر کے پاس اتنا ڈھیلا ہوتا کہ نیچے کا جسم ایک بہت بڑے جھولدار غبارے مین غائب ہو جاتا - اور ایک ایک پائجامے مین ایک ایک اور دو دو تھان خرچ ہو جاتے - یہ آج بھی افغانیون کی ٹانگون مین نظر آ سکتا ہے - بخلاف اسکے قندھار والے ایسا پائجامہ پہنتے جس کا اوپر کا گھیر تو زیادہ نہ ہوتا مگر دونون پائنچے کلیان جوڑ جوڑ کے اتنے بڑے اور اتنے گھیر کے بنا دیے جاتے کہ جب تک انسان اُس کو گھرس نہ لے یا ہاتھ سے سنبھالے نہ رہے چلنا دشوار تھا -

دربار دہلی مین بکثرت قندھاری آ آکے فوج مین نوکر ہوے - وہ لوگ چونکہ بڑے بہادر سمجھے جاتے اس لیے یہان کے عام سپہگرون مین اُنکے وضع ولباس اور عادات و خصائل رواج پانے لگے - اور یہ اُنھین کی برکت اور اُنھین کی صحبت کا اثر تھا کہ دہلی مین بانکے بڑے بڑے کلیون دار پائنچون کے پائجامے پہنتے - دہلی کے آخر عہد مین بانکون کی وضعداری و شجاعت اس قدر پسندیدہ ہوگئی کہ صدہا شریف زادون نے بانکون مین داخل ہوکے اُن کی وضع اختیار کر لی - اور شرفا جن مین اکثر اپنی اصلی وضع پر تھے - اور بہت سے بانکے بنے ہوے تھے لکھنؤ مین آئے -

لکھنؤ مین آکے یک بیک ایک ڈھیلا عرض کے پائنچون کا پائجامہ پیدا ہوگیا - شجاع الدولہ - آصف الدولہ اور سعادت علی خان کے زمانے تک تو اُس کا پتہ نہین چلتا - مگر معلوم ہوتا ہے غازی الدین حیدر یا اُنکے فرزند نصیر الدین حیدر کے زمانون مین جب کہ یہان لباس و معاشرت مین تغیر ہو رہا تھا اُسی بانکون کے

کلیون دار پائجامے سے مختصر کرکے یہ پائجامہ بنا لیا گیا - جو نہ اتنا ڈھیلا تھا کہ
ایک ایک پائجامے مین ایک ایک تھان صرف ہو جائے اور نہ تنگ و چست
مُہری والے پُرانے پائجامے کی طرح اتنا تنگ کہ پائنچے اوپر چڑھانا غیر ممکن ہو -
یہ نیا پائجامہ ہلکا پھلکا اور ہندوستان کی گرمیون مین نہایت آرام دہ تھا - چند
ہی روز مین امرا و مہذب لوگون مین اس قدر مقبول ہو گیا کہ سوا اُن لوگون کے
جو بانکپن کا دعوے رکھتے تھے تمام اہل فضل و علم زہاد و اتقیا اور سارے
شرفا و امرا کی وضع مین یہی پائجامہ داخل تھا -
اب لکھنؤ مین صرف دو پائجامے تھے - ایک تو وہی بانکون کا کلیون دار
پائجامہ - دوسرا عرض کے پائنچون کا پائجامہ جو سارے شہر کے مہذب لوگون کی
وضع مین داخل ہو گیا تھا - اور اس شان کے ساتھ کہ اکثر مہذب و تعلیم یافتہ
لوگ بھی کلیدن اور شروع کا سلواتے - اور اُسکے پائنچون مین چوڑی گوٹ
لگائی جاتی - بانکون والے اول الذکر پائجامے کو خود نصیر الدین حیدر نے
اپنی وضع مین داخل کر لیا - اُنکو انگریزی لباس کا بھی شوق تھا - اس لیے یا
کوٹ پتلون پہنتے یا کلیون دار پائجامہ - جس کو فی الحال پنجاب والے غرارے
دار پائجامہ کہتے ہین - نصیر الدین حیدر کو یہ پائجامہ اس قدر عزیز تھا کہ انگریزون
کی گون کے مشابہ دیکھ کے اُنھون نے اُسے اپنے محل کی بیگمون کو بھی پہنانا شروع
کیا - اور محل کی وضع مین داخل ہو جانے کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی تمام عورتین
اسی کو پہننے لگین جس کا ذکر عورتون کے لباس کے بیان مین آئے گا -
شاہی مین اودھ کی فوج فتح پنجاب کے موقع پر انگریزون کے ساتھ جا کے
سکھون سے لڑی تھی - سکھ لوگ ایک نئی قسم کا اونچی میانی ترچھی کاٹ کا
تنگ اور چست پائجامہ پہنتے تھے جو گھٹنا کہلاتا ہے - بہت سے پنجاب جانے
والون نے اس وضع کو بہت پسند کیا - اور گھرون مین واپس آئے تو وہی
آڑی کاٹ کے گھٹنے پہنے تھے - یہان کے اکثر لوگون نے یہ پائجامہ بہت
پسند کیا - اور یکایک ایسا رواج ہوا کہ لکھنؤ کے تمام بانکے ترچھے شوقین
اور امیرزادے گھٹنا پہننے لگے جو خوب چست اور خوب کھنچا ہوتا - اور گٹے

پر اُس کی شکنوں کی بہت سی چوڑیاں رکھی جاتین۔

لکھنؤ مین یہی تین پائجامے تھے کہ انگریزی ہوگئی۔ بڑے پائنچوں کا کلیوں دار پائجامہ تو بانکوں اور اسلحہ کے ساتھ سارے مردوں مین سے فنا ہوگیا۔ نصیر الدین حیدر کی عنایت سے فقط عورتوں مین باقی ہے۔ مردوں مین فقط دو پائجامے تھے۔ یعنی عرض کا پائجامہ اور گھٹنا۔ یا سُنی اہل اتقا مین سے بعض بعض پرانا شرعی پائجامہ پہن لیا کرتے۔ انگریزی دور نے پہلا اثر یہ کیا کہ پائجاموں کی وضع قطع تو وہی رہی مگر اطلس گلبدن۔ اور مشروع کے یا رنگین سوتی پائجامے مردوں سے بالکل چھوٹ گئے۔ چند روز بعد علی گڑھ کالج کے سوشل اسکول سے انگریزی پتلون کی نقل کے پائجامے ایجاد ہوے جو نہ اتنے تنگ ہوتے ہین کہ پنڈلی سے لپٹے رہین اور نہ اتنے ڈھیلے کہ پائنچہ اوپر تک چڑھا لیا جاسکے انگریزی تعلیم پانے والوں اور سارے ہندوستان کے اکثر شریف زادوں مین اب اسی پائجامے کا رواج بڑھتا جاتا ہے۔ اگرچہ اکثر تعلیم یافتہ جو تہذیب جدید کے ملاء اعلیٰ تک پہونچ گئے مین اپنا سارا لباس چھوڑ کے کوٹ پتلون پہننے لگے ہین۔ لیکن لکھنؤ مین آج بھی بعض گنتی کے ایسے ثقہ لوگ نظر آسکتے ہین جو پرانی قطع کے عرض کے پائجامے پہنتے ہین اور اپنی وضع نہین چھوڑتے۔

(۳۶)

انگرکھے یا چکن وغیرہ کے اوپر اگلے دنوں دوشالے کا رواج زیادہ نظر آتا ہے۔ اور یہی شاہی درباروں سے خلعت مین عطا ہوا کرتا تھا۔ اسکے ساتھ شالی رومال اوڑھنے کا بھی ایک معمولی حد تک رواج تھا۔ یہی دونوں چیزین دہلی سے لکھنؤ مین آئین۔ مگر لکھنؤ مین زیادہ رواج رومال اوڑھنے کا تھا۔ جاڑوں مین اکثر شالی رومال اور سردی کے اوقات مین دوشالہ اوڑھا جاتا۔ لکھنؤ مین دربار قائم ہونے کے بعد جب گرمیوں کے لیے لباس مین نفاست و لطافت اور سُبکی کو ترقی ہونے لگی تو آبرلیٹ اور چکن کے رومال ایجاد ہوے۔ اور تمام سفید پوش شریفوں کا یہ لباس ہوگیا کہ سر پہ قالب چڑھی چکن کی چوگوشیہ ٹوپی۔ بدن مین انگرکھا۔ پانوُن مین عرض کے پائنچوں کا پائجامہ اور کندھے پر ہلکا چکن یا

جانی کا رومال۔ شرفائے لکھنؤ کی یہ پہلی عام وضع تھی جس کو میر انیس مرحوم کا خاندان اُنھین اگلے تکلفات کے ساتھ آج تک نباہ رہا ہے۔

لباس مین سب سے آخری اور بڑی اہم چیز جوتا ہے۔ مسلمانون کے آنے سے پہلے ہندوستان مین جوتے کا مطلق رواج نہ تھا۔ اس لیے کہ چمڑے کے استعمال سے ہندو لوگ مذہبًا احتراز کرتے تھے۔ بلکہ جوتے کے عوض یہان لکڑی کے کھڑاؤن پہنی جاتین جو آج کل کے بعض فقیرون اور مرتاض رشیون کے علاوہ قدیم راجاؤن مین بھی مروج تھین۔ مسلمان اپنے ساتھ یہان محیط لباس کے ساتھ چمڑے کے جوتے بھی لائے۔

مسلمانون کا پہلا جوتا عربون مین فقط ایک چمڑے کا تلا تھا جو پٹّے یا بندھنون کے ذریعے سے پاؤن مین اٹکا لیا جاتا۔ عجمیون اور رومیون کا چمڑے کا موزہ جوتے سے پہلے عرب مین پہونچ گیا تھا۔ پھر جب عربی دربار شام و عراق یعنے روم کے آغوش مین قائم ہوے تو چمڑے کے جوتون کا رواج شروع ہوا۔ مگر وہ پہلے جوتے بظاہر سیدھی سادی زیرپائیان تھے۔ انھین کو پہنے ہوے مسلمان ہندوستان مین آئے۔

دہلی کے امرا اور بادشاہ اگلے دنون اپنی تصویرون مین اُونچی ایڑی کی کفش نما جوتیان پہنے نظر آتے ہین۔ دہلی کے آخر عہد مین چڑھوان جوتا ایجاد ہوا۔ جس کی ابتدائی وضع یہ تھی کہ آدھا پنجہ اور سِگّے سے نیچے تک پاؤن اُس مین چھپ جاتا۔ اُسکے سرے پر چوڑی نوک پنجے پر جھکا کے بٹھا دی جاتی۔ یہ پہلا دلّی وال جوتا تھا۔ جس کا پچاس سال پیشتر زیادہ رواج تھا۔ اس کے بعد سلیم شاہی جوتا نکلا۔ جو غالبًا جہانگیر کے زمانے مین ایجاد ہوا۔ اسکی نوک آگے نکلی اور اُٹھی ہوئی ہوتی۔ اور نوک کا تھوڑا سا باریک سرا اوپر موڑ دیا جاتا۔ ایجاد کے بعد اُس پر کلابتون کا مضبوط کام بننے لگا۔ جو بالکل سچا اور قیمتی ہوتا۔ اگرچہ یہ کام دلّی وال اور سلیم شاہی دونون وضع کے جوتون پر بنایا جاتا مگر سلیم شاہی جوتے کا بہت زیادہ رواج ہوا۔ اور اُس نے چند روز مین پُرانے دلّی وال کو مٹا دیا۔ اور اُس کی سب سے

بڑی خوبی یہ ہے کہ اب جبکہ انگریزی وضع و قطع نے ہمارے سارے لباس اور ہماری تمام چیزون کو مٹا دیا وہ آج تک باقی اور مقبول عام ہے۔ اور اکثر ہندوستانی وضع پسند کرنے والے وضعدار بیعاری سے بھاری لباس پر اُسی کو پہنتے ہین اور فی الحال لکھنؤ مین بھی بہت سے لوگ اُس کو پہنتے ہین۔

مگر لکھنؤ مین بعہد شاہی ایک نئی قطع کا خورد نوک کا جوتا ایجاد ہوا جس کو یہان کے وضعدارون نے ابتداءً بہت پسند کیا تھا۔ اُس مین نوک بالکل نہ ہوتی۔ بلکہ جو نوک دلی والی اور سلیم شاہی مین اوپر نکالی جاتی۔ اُس مین سینے کے بعد اُلٹ کے اندر کر دی جاتی۔ نوک کے پاس فقط ایک ذرا سا اُبھار رہتا۔ یہ جوتے لال نری کے نہایت ہی سُبک اور صاف بنائے جاتے اور نفاست و سبکباری کے اگلے مذاق نے اس کو یہان تک سبک کیا کہ بعض موچیون کے ہاتھ کا جوڑا چار پانچ پیسون بھر سے زیادہ نہ ہوتا۔ اگرچہ عوام اور دیہاتیون کے لیے اُسی وضع کے چرڑودھے جوتے اتنے بھاری ہوتے کہ سیر سیر ڈیڑھ ڈیڑھ سیر سے کم نہ ہوتے اور پھر کڑوا تیل پلا پلا کے اور بھاری کر لیے جاتے۔

تھوڑے دنون بعد لکھنؤ مین اس خورد نوکے جوتے کی آرایش و زیبائی کی طرف توجہ ہوئی پہلے جاڑے گرمیون کے خشک موسم کے لیے کاشانی مخمل کے اور برسات کے لیے کیمخت کے بننا شروع ہوے۔ اور اس مین کوئی شک نہین کہ بانات کا جوتا نہایت ہی نفیس۔ سادہ۔ سبک۔ اور خوشنما ہوتا۔ کیمخت سبز زنگاری رنگ کا ہوتا جو گھوڑے یا گدھے کی کھال سے بنتا اور اُس مین کٹھل کے خارون کی طرح دانے اُبھار کے پیدا کیے جاتے۔ اور تعریف یہ تھی کہ برسات مین چاہے کتنا ہی بھیگے اُسکے رنگ و روپ مین فرق نہ آتا۔ خود کیمخت کے بنانے کا فن اگرچہ باہر سے آیا تھا مگر لکھنؤ مین اُس کے بہت سے کارخانے جاری ہوگئے۔ اور سب جگہ سے اچھا بننے لگا۔

چند روز بعد جوتون کی آرایش مین اور ترقی ہوئی۔ اور سلمے ستارے کے کارچوبی کام کے جوتے بننے شروع ہوے۔ جن مین نقش کے پھُندنے لگا کے عجب چمک دمک اور آب و تاب پیدا کر دی جاتی۔ اس کے بعد جب جھوٹا سلمہ اور کلابتون آیا تو

چھوٹے کام کے چڑھوین جوتے بننے لگے جو بہت سستے داموں مین عجب بہار دکھا دیا کرتے۔

لیکن چڑھوین کے ساتھ ہی ساتھ یہان ایک گھیتلا جوتا مروج تھا۔ جو در اصل پرانے کفش نما جوتون سے ماخوذ تھا۔ اور عالی مرتبہ امیرون اور اکثر اعلیٰ طبقے کے شریفون مین علی العموم پہنا جاتا تھا۔ در اصل یہی ہندوستان کا پرانا قومی جوتا تھا۔ اور اُسی کی یادگار حیدرآباد کی چپّل اور دیگر مقامات کے دیسی جوتے ہین۔ اور یہی اگلے اہل دربار اور وطنی بزرگان سلطنت کے پانؤن مین نظر آتا ہے۔ گھیتلے مین اتنی ترقی ہوئی کہ اُس کی نوک بجاے مختصر رہنے کے ہاتھی کی سونڈ کی طرح بہت بڑھائے اور پھیلا کے پنجے کے اوپر ایک بڑے حلقے کی صورت مین لپیٹ دی گئی۔ یہ جوتا اودھ کے اگلے بادشاہون اور وزرا و امرا سب کے پانؤن کی زینت ہوا کرتا۔ چڑھوین جوتے نے ایجاد ہونے کے بعد اُس کی جگہ لینا شروع کی۔ یہان تک کہ عذر ہوتے ہوتے گھیتلا فقط عورتون کے پانؤن مین رہ گیا۔ جن کے نازک پانؤن کا وہ عام لباس تھا۔ اور مردون کی پوشاک سے وہ بالکل خارج ہو گیا۔ لیکن کفشین اپنی اصلی صورت پر آج تک باقی ہین جو شیعیان علی کے اتقیا و صلحا خصوصاً مجتہدین کے ساتھ مخصوص ہین۔

گھیتلے جوتون کفشون اور اُن پر جو کارچوبی کام بنایا جاتا ہے اُس نے مسلمانان لکھنؤ مین دو خاص پیشے پیدا کر دیے جن پر بہت سے لوگون کی معاش کا دارومدار ہو گیا۔ پہلے تو مسلمان موچی جن کی یہان ایک مستقل قوم اور برادری ہے۔ یہ لوگ سوا گھیتلے جوتے بنانے کے اور کسی قسم کا جوتا بنانا اپنی شرافت کے خلاف جانتے ہین۔ لکھنؤ مین ان لوگون کے بہت سے گھر تھے اور سب سچے مسلمان۔ سفید پوش۔ اور بمقابل دوسرے ادنیٰ طبقے والون کے ممتاز تھے۔ اور اگلے دنون نہایت فارغ البالی سے بسر کرتے تھے۔ لیکن اب قدیم وضع و لباس کے بدلنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ مردون کے بعد عورتون نے بھی گھیتلا جوتا بالکل چھوڑ دیا۔ اور بازار جو اعلیٰ درجے کے گھیتلے جوتون سے بھرا رہتا تھا اُس مین اب اگر کسی دوکان پر اُس وضع کا ایک آدھ جوڑا مل بھی جاتا ہے تو بہت ہی ذلیل و

و حقیر پرانا - ماند - اور میلا ہوتا ہے - نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان موچیون کا گروہ بالکل تباہ ہو گیا - اُن کے بیسیون گھر اُجڑ گئے - اور جو باقی ہین قعر فنا کے بالکل کنارے ہین - لیکن ان لوگون کی وضعداری کی داد دینا چاہیے کہ لٹ گئے اور تباہ ہو گئے مگر یہ نہ گوارا کیا کہ گھیتلے جوتون کے عوض سلیپرین یا بوٹ بنائین - اور رفتار زمانہ کا ساتھ دے کے پہلے سے زیادہ ترقی کرین -

دوسرا گروہ اہل حرفہ جو اُنکی جوتیون کے صدقے مین پیدا ہوا جوتون کی جھوٹی آوگھیان بنانے والون کا ہے - آوگھی کارچوبی کام کے اُن مختلف قطع کے ٹکڑون کو کہتے ہین جو زنانے یا مردانے جوتون پر لگائے جاتے ہین - آوگھیان یہان بہت ہی نفیس زرق برق اعلیٰ درجے کی ایسی نفیس بنتی تھین جیسی کہین نہ بن سکتی تھین - اور اُنکی مانگ اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ آبادی کا ایک معتدبہ حصہ اُنھین کی تیاری پر زندگی بسر کر رہا تھا -

بہرحال گھیتلے جوتون کے فنا ہونے سے ان دونون گروہون کو نقصان پہونچا - اب گھیتلے کے عوض عورتون مین عموماً سلیپرون کا اور خاص گھرانون یا خاص موقعون کے لیے تمام شریف بیبیون مین اعلیٰ درجے کے پمپ شوز کا رواج ہے - دولتمند گھرانون مین گھیتلا جوتا چھوڑ کے ٹاٹ بانی (یعنی کارچوبی کام کے) بوٹ پہننا شروع لیے تھے - اُن کے چند ہی روز بعد چمڑے کے بوٹ جو بغیر کھولے پاؤن سے اُتر سکین پہنے جانے لگے - اور اب تو علی العموم پمپ شوز اور جن لوگون نے پوری انگریزی وضع اختیار کر لی ہے اُن کی بیگمین تو ہر قسم کے لیڈیز شوز پہننے لگی ہین -

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسی سلسلے مین عورتون کے عام لباس کو بھی بیان کر کے ہم وضع و لباس کی بحث کو ختم کر دین -

ہندوستان مین عورتون کا قدیم لباس صرف ایک بے سی ہوئی لمبی چادر تھی جو آدھی کمر سے لپیٹ کے باندھ لی جاتی - اور آدھی کندھے یا سر پر ڈال کے اوڑھ لی جاتی - اسکے ساتھ سینے کا ایک لباس بھی ہندوؤن کے پرانے زمانے سے چلا آتا ہے جو ملبندی ہند مین "انگیا" اور جنوبی ہند مین "چولی" کہلاتا ہے

یہ لباس سری کرشن جی کے زمانے میں بھی معلوم ہوتا ہے کہ موجود تھا۔ آخر زمانے میں چولی اور انگیا کی تفریق یوں ہوئی کہ دکھن میں ایک جھول دار پٹی سے پیچھے سے آگے کی طرف لاکے دونوں چھاتیوں کے درمیان میں گرہ دے کے یا بوتام لگا کے کس دی جاتی ہے۔ اور دونوں چھاتیاں اُس جھول میں کسی قدر اُبھار کے ساتھ دبی اور کسی رہتی ہیں۔ یہی دکھن کی چولی ہے۔ بخلاف اس کے شمالی ہند میں انگیا یوں بنتی ہے کہ پستانوں کے مناسب ناپ کے کپڑے کی دو کٹوریاں بنائی جاتی ہیں جو دو تین اُنگل تک باہم سی کے جوڑ دی جاتی ہیں اور اُن کے بالائی کونوں پر جالی کی دو چھوٹی چھوٹی آستینیں لگا دی جاتی ہیں۔ اور اُن آستینوں کے نیچے دونوں پہلوؤں پر دو دو بند لگا دیے جاتے ہیں۔ اس طرح طیار کر کے اور دونوں ہاتھوں کو آستینوں میں ڈال کے یہ انگیا پہن لی جاتی ہے۔ آستینیں بہت ہی چھوٹی آدھے بازووں سے بھی کم رہتی ہیں۔ اور چھاتیوں کی کٹوریوں میں ڈال کے پیٹھ پر بند کھینچ کے نیچے اوپر دو بندشیں دے دی جاتی ہیں۔ بخلاف چولی کے انگیا چھاتیوں کو اصل سے زیادہ اُبھار کے نمایاں کر دیتی ہے۔

بہرحال یہ پُرانا ہندو لباس ہے۔ اور ہم نہیں جانتے کہ مرور زمانہ سے اُس میں کیا اصلاحیں یا ترقیاں ہوئیں۔ بادی النظر میں انگیا زیادہ ترقی یافتہ اور بعد کی اصلاح معلوم ہوتی ہے۔

اِسکے سوا ہندو زمانے میں عورتوں کا اور کوئی لباس نہیں معلوم ہوتا۔ سیے ہوے کپڑے اور کُرتا پائجامہ مسلمان اپنے ساتھ لائے۔ مسلمانوں کی عورتیں بلاد عجم سے عرض کے ڈھیلے پائنچوں کے پائجامے پہنے ہوے یہاں آئیں۔ جو ٹخنوں پر چنٹ دے کے باندھ دیے جاتے تھے۔ چند روز بعد وہ پائجامے تنگ مُہری کے گھٹنے ہو گئے۔ جن کا گھیر اوپر سے ڈھیلا ڈھالا ہوتا۔ رفتہ رفتہ اُن میں کھنچاؤ کا شوق بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اوپر کا گھیر بھی کم ہو گیا۔ اور پائنچوں کی مہریاں تو اس قدر تنگ ہو گئیں کہ پہننے کے بعد کس کے سی لی جائیں۔ اور اُتارتے وقت مہری کے ٹانکے توڑنے کی ضرورت لاحق ہوتی۔ جیسے پائجامے آج بھی بہت سے شہروں میں مروج ہیں۔

لکھنؤ مین مسلمان بیگمون کی وضع ابتداءً تو یہی تنگ مُہری کا کھنچا ہوا پائجامہ۔ سینے پر چھوٹی اور تنگ آستینون کی کھنچی ہوئی انگیا۔ اور پیٹ اور پیٹھ چھپانے کے لیے ایک عجیب وغریب کُرتی جو آگے کی طرف اُس حد تک کاٹ دی جاتی جہان تک جسم پر انگیا کا تصرف رہتا۔ اُس مین نہ آستینین ہوتین اور نہ سینے پر اُس کا کوئی حصہ رہتا۔ دو لمبے بندون کے ذریعے سے جو شانون پر سے ہوکے آتے پیٹ اور پیٹھ پر معلق ہوتی۔ اُس کے اوپر تین گز کا چُنا ہوا باریک دوپٹہ جو سر سے اوڑھا جاتا۔ لیکن آخر مین فقط شانون پر پڑا رہنے لگا۔

ہندوستان کے موسم اور مزاجون کی نزاکت نے محرم کُرتی اور دوپٹے سب کو روز بروز سبک کرنا شروع کیا یہان تک کہ لاہی کی انگیا اور کریپ کے دوپٹے وضعدار امیرزادیون کے فلیشن مین داخل ہوگئے۔ نصیرالدین حیدر بادشاہ کے زمانے سے گھٹنّے رخصت ہوگئے اور اُن کی جگہ بڑے بڑے گھیردار پائنچون کے کلیون دار پائجامے جو کمر کے پاس بہت ہی تنگ ہوتے اور چور کلی یعنی میانی خوب کھنچی رہتی۔ علی العموم رواج پاکے عورتون کی خاص وضع قرار پاگئے۔ یہ پائنچے آگے کی طرف ایک نفاست وخوشنمائی کے انداز سے ناف کے نیچے گھرس لیے جاتے تاکہ چلنے پھرنے مین زمین پر لوٹ کے خراب اور میلے نہ ہون۔ غدر کے قریب زمانے یا شاہی کے عہد آخر مین باریک کپڑون اور آدھی آستینون کے تنگ شلوکون کا رواج ہوگیا جو کُرتی کے عوض پہلے تو محرم کے اوپر پہنے جانے لگے۔ اور چند روز بعد اُنھون نے محرم کی ضرورت بھی اُڑا دی۔ مگر اب بھی بہت ہی باریک کپڑون کے استعمال کیے جانے کی وجہ سے یہ لباس ننگا معلوم ہوتا۔ خصوصاً اس لیے کہ باہین بالکل ننگی رہتین۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شلوکون کے عوض کسی قدر ڈھیلے کُرتون کا رواج ہونے لگا۔ لیکن اب یک بیک کرتون کی جگہ انگریزی جاکٹ اور باڈس پہنے جانے لگے۔

اب ہر صوبے اور ہر شہر کی وضعون کا مقابلہ اور اسکے ساتھ باہمی اختلاط سے ہونے لگا ہے۔ اور بعض مسلمانون یا خود خاتونون کو ساری زیادہ خوشنما نظر آنے لگی۔ جس کی وجہ سے لکھنؤ کی عورتین آدھے کے قریب پُرانی وضع چھوڑ کے ساریان

باندھنے لگی ہین - اور کہا جاتا ہے کہ اُس مین زیادہ سادگی ہے - مین اگرچہ اسکے خلاف نہین ہون کہ عورتین اپنے حسن مین جدت اور تازگی پیدا کرنے کے لیے مختلف لباسون کو چنین اور مصداق ع ہر لحظہ بوضع دگر آن یار برآمد؛ نئی نئی دھجون سے اپنے شوہرون کی دلداری کرین - لیکن مین اسکے سخت خلاف ہون کہ اپنی قومی وضع بالکل چھوڑ دی جائے - اور اپنے معاشرتی خصائص بالکل فنا کر دیے جائین - ساری ایک غیر مخیط کپڑا اور تمدن انسانی کے بالکل ابتدائی اور غیر متمدن زمانے کی یادگار ہے - سادگی بیشک دلکش چیز ہے - مگر بہت سی قیدون اور خصوصیتون کے ساتھ - ورنہ پوری سادگی تو عریانی مین ہے - خود لباس فطرت انسانی کو اپنے تفنن کا جامہ پہنانا ہے - اس لیے میری سمجھ مین نہین آتا کہ ساری مین کیا خاص خوبی وخوبصورتی ہے -

جس طرح مرد کی طبیعت کا خاصہ ہے کہ اپنی حسین ترین منکوحہ سے اُکتا کے دوسری جوان عورتون کی طرف مائل ہوتا ہے اُسی طرح ہمارے نوجوان اپنی بیبیون کی وضع سے سیر ہو کے دوسری قومون کی عورتون کے لباس پر فریفتہ ہو جاتے ہین - مگر خوب یاد رکھیے کہ جس طرح آپ اُن کے لباس پر فریفتہ ہین اُسی طرح دوسری قومون کے مرد آپ کی عورتون کے ترقی یافتہ لباس مین زیادہ دلکشی ورعنائی پاتے ہین - نفسانی خواہشات کا ایک مغالطہ ہے جو فی الحال آپ کی نظر مین اپنی عورتون کے لباس کو معیوب ثابت کر کے بار بار ملک مین یہ بحث پیدا کراتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانون کی بیبیون کے لیے مناسب کیا ہے -

ہم اس مسئلے پر اچھی طرح بحث کرتے اگر ہمین یقین ہوتا کہ خالص عورتون کی اخلاقی ومعاشرتی اصلاح کی غرض سے یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے - دراصل یہ مسئلہ اُسی تقاضائے طبع سے پیدا ہوا ہے جس نے نوجوانون کو کوٹ پتلون پہنایا - ہیٹ سے اُن کے سرون کو زینت دی - اور سوا رنگت کے اُن مین کوئی چیز اپنی نہین باقی رکھی - لہذا ہم کو یقین ہے کہ یہ مسئلہ فقط اس جوش مین پیدا ہوا ہے کہ مردون کی طرح عورتین بھی انگریزی لباس اختیار کرین - ہم خوب جانتے ہین کہ اس بارے مین لکھنا پڑھنا اور کہنا سننا سب بیکار ہے - اس لیے

کہ جب تک انگریزی سائے اورسکرٹ اور بانٹ (انگریزون کی ٹوپی) پہننے کا فیصلہ نہ کردیا جائے گا ہمارے مصلحان معاشرت اور نقال موجدان فاین کو چین نہ آئے گا۔ اسکے سوا چاہے اور کیسی ہی اچھی اصلاح و ترمیم کی جائے گی انکا اطمینان نہ ہوگا۔

غرض اس انجام کو سونچ کے اس بارے مین اخبارون اور رسالون کے صفحے سیاہ کرنے کا کوئی نتیجہ نہین۔

(۳۷)

لباس کے متعلق لکھنؤ مین تراش وخراش اور کپڑون کی نوعیت مین روز بروز ترقی ہوتی رہی۔ گرم ملک ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے ادنیٰ طبقے والے سوا ستر پوشی کے اپنا سارا پنڈا برہنہ رکھتے ہین یہ صرف اُنکے افلاس اور اہل ملک کی کم مائگی کے باعث نہین بلکہ موسم اور آب ہوا کے تقاضنے سے ہے۔ اس کا اثر دہلی مین بھی یہ تھا کہ بجائے گندہ اور گران کپڑون کے ٹیک اور نازک کپڑے اختیار کیے گئے۔ یہان اُس سے بھی زیادہ ترقی ہوئی۔ اور چونکہ اب سپہگری و جنگجوئی کی بہت ہی کم ضرورت باقی تھی۔ عیش پرستی اور عورتون کی صحبت بہت بڑھتی جاتی تھی۔ اس لیے مردون پر عورتون کی وضع کا اثر پڑنے لگا۔ جو اعتدال سے باہر ہوگیا۔ اور جس قسم کی زینت و آرایش عورتون کے لیے موزون ہے مردون نے اپنی وضع اور اپنے لباس مین اختیار کرنا شروع کردی۔

خصوصاً اُس زمانے سے جبکہ یہان کے حکمرانون نے اپنے لیے نواب کا لفظ چھوڑکے بادشاہ کا لفظ اختیار کیا۔ نیشاپوری اور سالارجنگی خاندان کے لوگ جو معتدبہ وثیقے اور پنشنین پاتے تھے بالکل خانہ نشین کر دیے گئے تو اُنکو سوا عورتون کے کسی کی صحبت ہی نہ نصیب ہوتی تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ اُنکے وضع ولباس ہی مین زنانہ پن نہین پیدا ہوا بلکہ اُن کی زبان بھی عورتون کی سی ہوگئی۔ اور چونکہ وہی شہر کے رئیس اور وضعدار تصور کیے جاتے۔ لہذا اکثر عوام نے بھی اُنھین کی پیروی شروع کردی۔ اور بجائے دیگر مقامات کے رئیسون کے یہان لکھنؤ مین یہ عام وضع ہوگئی کہ سر پر مانگ۔ اُسپر مسالے کی

کامدار ٹوپی - کانون تک بال جن کی کنگھی کرنے مین ماتھے پر دونون جانب پٹیان جمائی جاتین - منہ مین پان - ہونٹون پر لاکھا - بنڈے مین تمن تین کمرتیون کا چست انگرکھا - اُسکے نیچے گلبدن کا ریشمی کھنچا ہوا گھٹنا - ہاتھون مین مہندی - پانون مین ٹاٹ بافی یعنی کامدار بوٹ - جاڑون مین انگرکھے کی جگہ نیلے - زرد یا سبز و سرخ اطلس یا گرنٹ کا روئی دار دگلا -

جاڑون مین یہان کے بعض معزز لوگ عموماً شال کی قبائین پہنتے مگر دوشالے اور شالی رومال کو سب پسند کرتے - اُسی کا نتیجہ تھا کہ جیسا شال لکھنؤ والون مین اب بھی کہین کہین نکل آتا ہے ویسا شال ہندوستان کیا معنی شاید خود کشمیر مین بھی اب نصیب نہ ہوسکے گا -

شال کا شوق یہان تک بڑھا کہ بہت سے شال بننے والے اور ہزارون رفوگر اور شال کے دھونے والے کشمیری اپنا وطن چھوڑ چھوڑ کے لکھنؤ مین آبسے جن کا گذشتہ پچاس سال مین اب نام و نشان بھی نہ باقی رہا - اُن مین سے کوئی بچا بھی تو اُس نے کوئی اور پیشہ اختیار کرلیا -

محرم چونکہ لکھنؤ مین ایک بڑی اہم چیز اور عزاداری کا زمانہ تھا اس لیے سوگواری اور نفاست و نزاکت کا لحاظ رکھ کے یہان محرم کے لیے خاص لباس اور خاص زیور ایجاد ہوگیا - سیاہ اور نیلے رنگ غم و سوگواری کے رنگ سمجھے گئے - اور سبز رنگ اس لیے کہ بنی عباس کے عہد مین اُن کے سیاہ رنگ کے مقابل بنی فاطمہ کا رنگ سبز تھا - چنانچہ آج بھی ایران و ہند کے بعض فاطمی اپنے سبز عمامون سے سیدون کی اس قدیم وضع کا ثبوت دے دیا کرتے ہین - بہر تقدیر محرم مین سرخ رنگ ممنوع قرار پایا - سبز - نیلا - اور سیاہ رنگ اور اُنکے ساتھ زرد رنگ بھی اُس موسم کے لیے مناسب سمجھے گئے - چنانچہ یہان محرم مین تمام عورتون کا لباس انھین مذکورہ رنگون سے مناسب جوڑ لگا کے منتخب کیا جاتا - سارا زیور بڑھا دیا جاتا حتیٰ کہ چوڑیان تک اُتار ڈالی جاتین - جن کے عوض کلائیون کے لیے ریشم کی سیاہ و سبز پہونچیان اور کانون کے لیے سیاہ و زرد ریشم کے کرن پھول ایجاد ہوے جو سونے چاندی کے زیورت

بھی زیادہ نفاست کے ساتھ اُن کی زیبائی و رعنائی بڑھا دیا کرتے ہین۔

محرم تو نہایت ہی اہم مہینہ تھا۔ یہان ہر موسم اور ہر زمانے کے مناسب ایسی ایسی ایجادین عورتون کے لباس مین روز ہوتی رہتی تھین جن کو سارا مندوستان حیرت کی نگاہون سے دیکھتا تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ آج سے پچاس سال پیشتر لکھنؤ مین عورتون کے لباس کی تراش خراش اور روز روز کی تازہ جدتون کو جو دیکھتا وہ فرانس اور لندن کے فیشن بدلنے کو بھول جاتا۔ اور اسی بنا پر اکثر زبانون پر جاری ہوگیا کہ لکھنؤ مشرق کا پیرس ہے۔ آج بہت سے سادگی پسند اور ترقی یافتہ معاشرت سے محروم رہنے والے ان تکلفات پر اعتراض کرتے ہین اور یہ نہین دیکھتے کہ جن دربارون اور شہرون مین تمدن ترقی کرتا ہے وہان معاشرت و صحبت کے ہر شعبے مین ایسی ہی باتین پیدا ہو جایا کرتی ہین۔ جو ایک فلسفی کی نظر مین چاہے لغو و فضول ہون مگر وضعدارون کی صحبتین اور شایستہ لوگون کی محفلین اُنکو نہایت ہی اہم اور ضروری تصور کرتی ہین۔

مردون پر عورتون کی وضع کے غالب آنے کا اثر اگر کپڑون کی نزاکت اور تیز اور بھڑکیلے رنگون تک محدود رہتا تو بہت غنیمت ہوتا یہان تو بہت سے لوگون کی یہ حالت ہوگئی کہ میان بیوی کے دگلون۔ دوپٹون۔ دولائیون۔ رضائیون اور پائجامون مین کسی قسم کا فرق ہی نہین رہا۔ بجز اس کے کہ گوٹا پٹھا اور زیور عورتون کے ساتھ مخصوص تھا۔ مرد شوخ رنگون کے نازک ریشمی کپڑے بغیر گوٹے پٹھے کے پہنتے۔ مگر یہ مذاق غدر کے بعد انگریزی اثر سے گھٹنے لگا۔ اور اب صرف چند گنتی کے لوگون کے سوا کسی مین نہین باقی رہا۔

مرد خدمتگارون اور اُنکے مختلف طبقات کی طرح یہان عورتون کے مختلف طبقون کی بھی خاص خاص وضعین قرار پا گئین۔ انگریزون کے خانسامان کوچبان اور سائیس مختلف وردیون مین رہتے ہین۔ مگر وہ وردیان اُن کا اصلی لباس نہین قرار پا سکین کہ اپنے گھرون مین بھی وہ انکو پہنا کرتے ہون۔ بخلاف اسکے لکھنؤ مین زنانے اور مردانے نوکرون اور اندر باہر کے تمام ملازمون کے لیے جو خاص خاص لباس مقرر ہوگئے تھے وہی اُنکی اصلی وضع قرار پا گئے۔ مثلاً جیسے

ڈیوڑھیون کے پہرے والے سپاہیون - اور چوبدارون - ہرکارون وغیرہ کی خاص اور جدا جدا وضعین تھین ویسے ہی زنانی محلسراؤن مین محلدارون - مغلانیون اور کہاریون کی وضعین اس قدر ممتاز تھین کہ دُور سے دیکھتے ہی انسان سمجھ جائے گا کہ یہ عورت محلدار ہے - یہ خواص ہے - یہ مغلانی ہے - اور یہ کہاری ہے - اور پھر لطف یہ کہ اُن کے لباس مین وردی کی شان نہین پیدا ہونے پائی -

خدمتگارون اور اُنھین کی طرح پیش خدمتون کا البتہ وہی لباس تھا جو خود میان بیویون کا لباس تھا - جس کی وجہ یہ تھی کہ یہ دونون گروہ اپنے مالک یا مالکہ کا اُتارن یعنی اُنکے اُترے ہوے کپڑے پہنا کرتے ہین -

لباس کے بعد عورتون کے لیے سب سے اہم چیز زیور ہے - اور عورتین اکثر اپنی مخصوص دولت و جائداد اپنے زیور کو سمجھتی ہین - جس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ اکثر صوبجات ہند مین بھدّے اور بھاری زیور کا زیادہ رواج ہے - تاکہ وہ قیمت مین زیادہ ہون - زیور کے بھاری ہونے کا شوق اودھ کے دیہات مین اور عموماً ہندوستان کے تمام شہرون مین روز بروز بڑھتا جاتا ہے - مگر لکھنؤ مین دہلی کے شریف خاندانون کی معزز خاتونین آئین تو ابتداءً وہی زیور جس کا سارے ہندوستان اور خود دہلی مین رواج تھا پہنے ہوے تھین - مگر یہان آنے کے چند روز بعد جب یہان کی ترمیم شدہ مخصوص معاشرت قائم ہوئی تو زیور مین فقط زینت و آرائش کا خیال باقی رہ گیا اور ہر قسم کا زیور روز بروز سُبک - ہلکا - نازک - اور خوشنما ہوتا گیا - یہان تک کہ آخر عہد مین اُمرا اور دولتمند گھرانون کی بیویون کی یہ وضع ہو گئی کہ سادے بغیر مسالے اور گوٹے پٹھے کے کپڑے پہنتین اور زیور کی قسم کی دو ہی ایک چیزون پر جو بہت ہی نازک - سبک - اور قیمتی ہوتین کفایت کرتین - اور اگر گلے اور ناک کان مین متعدد چیزین پہنتین بھی تو وہ بہت ہی ہلکی ہوتین - اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیسا سبک اور ہلکا زیور لکھنؤ مین بننے لگا کہین نہ بن سکتا تھا -

ناک مین نتھ ہندوون کے عہد سے نہایت ہی ضروری زیور اور سہاگ

کی نشانی سمجھی جاتی تھی جو خیال باہمی میل جول سے مسلمانوں میں بھی پیدا ہو گیا چنانچہ دیہات والیاں آج بھی اُس کے بھاری کرنے میں یہاں تک مبالغہ کرتی ہیں کہ چار چار، پانچ پانچ تولے کی نتھیں پہن لیتی ہیں جن سے اکثر نتھنے پھٹ جاتے ہیں مگر دوبارہ ناک چھدوائی جاتی ہے تاکہ ناک نتھ سے خالی نہ رہے۔ لکھنؤ کی بیویوں نے نتھ کو اُڑا ہی دیا۔ اور اُس کی جگہ سونے کی مرصع کیل پہننے لگیں جو بہت ہی نفیس اور خوبصورت زیور ثابت ہوئی۔ اور نزاکت پسندی سے ان کیلوں کو بھی اتنا مختصر اور سبک کر دیا کہ سبک ناک کی کیلیں لکھنؤ کے سناروں اور سادہ کاروں کے سوا اور کہیں کے کاریگر نہیں بنا سکتے۔

اب ادھر پچیس تیس سال سے بلاق کا رواج بہت زیادہ بڑھ گیا ہے اگرچہ یہ کوئی پسندیدہ مذاق نہیں مگر زیور کے اختصار اور عام پسندی نے اسے اس قدر ترقی دی ہے کہ اب بہت کم عورتیں ہیں جو بلاق نہ پہنتی ہوں۔

فی الحال مختلف شہروں کے باہمی میل جول سے زیور بنانے کے فن میں ہر جگہ ترقی ہو رہی ہے۔ اور خاص خاص زیوروں کے لیے خاص خاص شہر مشہور ہو گئے ہیں۔ گر غدر سے پیشتر جب ریلوے نے بلاد ہند میں یہ باہمی موانست و یکرنگی نہیں پیدا کی تھی لکھنؤ سے اچھے سنار اور کاریگر کہیں نہ مل سکتے تھے۔ لیکن اب بہت سے شہر اس فن میں لکھنؤ سے بڑھتے جاتے ہیں۔ خصوصاً شہر دہلی منقوش چاندی کے سبک زیور بنانے میں ہندوستان کے تمام شہروں سے سبقت لے گیا ہے۔ گر پھر بھی اکثر مقامات کے نفیس مزاج گھرانے لکھنؤ ہی کے بنے ہوئے زیور اور یہاں کے چاندی کے ظروف کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ یہ بحث لکھنؤ کی صنعتوں میں ہمیں بار بار چھیڑنا پڑے گی۔ اس لیے یہاں اتنے ہی پر قناعت کرتے ہیں۔

(۳۸)

کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کی بحث ختم کر کے اب ہم اُن چیزوں کی طرف توجہ کرتے ہیں جن کو سوسائٹی اور میل جول سے خصوصیت ہے۔ اور جن پر مناسب اور اپنے مذاق کا تصرف کر کے لکھنؤ نے اُنھیں اپنا بنا لیا۔

دنیا کے ہر ملک میں میل جول اور معاشرت کا ایک تمدن قائم ہو جاتا ہے۔ جس میں زیادہ تر تعلق وضع قطع۔ اخلاق و عادات۔ نشست برخاست۔ طرزکلام طریقۂ مذاق۔ مکان اور فرنیچر وغیرہ کو ہوتا ہے۔ اور ان باتوں کے بعد اُس سامان زندگی کو جس کی اس سوسائٹی کو ضرورت ہو۔ فطری طور پہ یہ چیزیں ہر گروہ ہر طبقے اور ہر شہر و قریے میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور آج بھی دنیا میں پھر کے دیکھیے تو ہر جگہ سوسائٹی کی خاص نوعیت اور اُسکے خصوصیات نظر آ جائیں گے۔ مگر جن مقاموں میں کوئی معزز دربار قائم ہو جاتا ہے اور علم و ادب کو ترقی ہوتی ہے وہاں کی سوسائٹی ایک بڑے حصۂ ملک کو اپنا تابع بنا کے اُسکے ہر شہر و قریے کی معاشرت کا مرجع اور اصول تہذیب کا مرکز بن جاتی ہے۔

ہندوستان میں تہذیب و تمدن اور آداب سوسائٹی کا اصلی مرکز یقینی طور پہ دہلی تھی۔ اس لیے کہ بہت سی صدیوں تک وہ ہندوستان میں حکومت کا مرکز اور علم و فضل کا منشا و مستقر رہ چکی ہے۔ سارا ہندوستان اُسکے زیر نگین تھا۔ اور وہاں کی صحبت کے تربیت یافتہ تمام صوبوں کے حاکم اور ادب آموز ہوا کرتے تھے۔ لکھنؤ کے لیے اُس کے مقابل میں نہ کوئی خصوصیت ہے اور نہ اُسے کوئی امتیاز حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر اس محل پہ لکھنؤ کا نام لیا جانے کی اگر کوئی وجہ ہو سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ زمانے کے اتفاق سے پچھلی صدی میں وہی دہلی کی معاشرت پوری پوری لکھنؤ میں منتقل ہو آئی۔ اور وہیں کے اُمرا و شرفا۔ علما و شعرا۔ اتقیا و صلحا۔ سب کے سب لکھنؤ میں چلے آئے۔ اور جو دربار دہلی میں اُجڑتا تھا لکھنؤ میں آ کے جمع ہوتا۔ اس لیے کہ وہاں کے تمام وضعدار لوگ ایک ایک کر کے سب یہیں چلے آئے۔ اور یہاں اطمینان حاصل ہو جانے کی وجہ سے اپنی ترقی یافتہ معاشرت پر اور ترقیاں کرنے لگے۔ اور پھر لطف یہ کہ دہلی والوں کی جو معاشرت اودھ میں آ کے قائم ہوئی تھی اُس میں سوا دہلی والوں کے کوئی غیر شخص نہ تھا۔ حتیٰ کہ لکھنؤ کے پُرانے معزز باشندوں کو بھی اُس میں بالکل جگہ نہیں ملی۔

لہذا لکھنؤ کی معاشرت دراصل دہلی کی معاشرت اور وہین کی ترقی یافتہ سوسائٹی کا آخری نمونہ ہے۔ اس پچھلی صدی مین دہلی کے پُرانے تمدن کے دو اسکول ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو خاص دہلی مین موجود تھا اور دوسرا وہ جو لکھنؤ مین منتقل ہو آیا۔ لیکن اس مین شک نہین کہ زوال سے پیشتر کی آخری صدی مین اُس اسکول کے لیے جو دہلی مین تھا دربار مغلیہ کے کمزور پڑ جانے اور دولتمندی کے مٹ جانے کی وجہ سے میدان ترقی مین آگے قدم بڑھانے کا ویسا موقع نہین نصیب تھا جیسا لکھنؤ والے دہلی کے اسکول کو حاصل تھا اور یہی وجہ ہوئی کہ اس زمانے مین لکھنؤ کا تمدن ترقی کر رہا تھا۔ اور دہلی کے قدیم تمدن کی ترقی رُک گئی تھی۔ الغرض یہی ترقیات لکھنؤ کی سوسائٹی کے خصوصیات ہین۔ بلکہ غور کرنے سے یہ نظر آتا ہے کہ دہلی مین تمدن و معاشرت کو قدیم شہنشاہی دربار کی برکتون سے جو ترقی حاصل ہوئی تھی پچھلے دور مین تجارت پیشہ جاہل قومون کے غلبے اور قدیم خاندانی شرفا کے دیگر بلاد مین منتشر ہونے۔ یا خانہ نشین ہو جانے کے باعث وہ بھی تشریف لے گئی۔ اور سچ یہ ہے کہ اودھ کے شاہی دربار کے ٹوٹ جانے کے بعد سے بیرونی لوگون کے میل جول اور پُرانے مہذب خاندانون اور اُنکے اثر کے مٹ جانے کی وجہ سے جو تہذیب لکھنؤ مین پیدا ہوئی تھی وہ بھی روز بروز رخصت ہوتی جاتی ہے۔

مگر ہمین اُس بدتمیزی کی سوسائٹی اور اُن متمردانہ اخلاق و آداب سے بحث نہین جو غدر کے بعد سے لکھنؤ مین پیدا ہونا شروع ہوئے اور ترقی کرتے جاتے ہین۔ ہماری غرض محض اُس تہذیب کو بتانا ہے جو لکھنؤ کے شاہی دربار کے آغوش مین پرورش پا کے یہان کی صحبتون مین پیدا ہو گئی تھی:۔

یہان کی معاشرت کے متعلق اپنے اس مضمون کے سلسلے مین ہم مندرجۂ ذیل امور کو بیان کرنا چاہتے ہین۔ (۱) مکان (۲) فرنیچر (۳) وضع قطع (۴) اخلاق و عادات (۵) نشست برخاست (۶) صاحب سلامت و مزاج پرسی (۷) طرز کلام (۸) طریقۂ مذاق (۹) شادی و غمی کی محفلین (۱۰) مجلسین (۱۱) مولد شریف کی محفلین۔ پھر اُن کے بعد ہم اُن چیزون کو بیان کرین گے جو لوازم صحبت اور

سامان معاشرت ہین۔

(۱) مکان۔ دہلی اور لکھنؤ مین مکانون کے متعلق پُرانا مذاق یہ تھا کہ ظاہری نمایش اور شاندار ی صرف شاہی قصرون اور ایوانون کے لیے مخصوص تھی۔ امرا و تجار اپنے رہنے کے لیے جو مکان تعمیر کراتے وہ اندر اندر سے چاہے کیسے ہی وسیع اور نفیس ہون مگر اُن کی ظاہری حالت بالکل معمولی مکان کی سی ہوتی۔ اور اس مین مصلحت یہ تھی کہ جو مکان ظاہر مین شاندار ہوتے اکثر بادشاہون کو پسند آجاتے۔ اور بنوانے والون کو اُن مین رہنا بہت کم نصیب ہوتا۔ ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ رعایا مین سے کسی کا تعمیر مکان مین شاہانہ اُلوالعزمی دکھانا تمرد و سرکشی پر محمول کیا جاتا۔ اور اُسے سلامتی کے ساتھ زندگی بسر کرنا دشوار ہو جاتا۔

اسی وجہ سے آپ کو دہلی مین مقبرون کے سوا قدیم الایام کی ایک بھی ایسی عمارت نہ نظر آئے گی جو عالیشان ہو اور رعایا مین سے کسی عالی مرتبہ امیر یا دولت مند تاجر کی بنوائی ہوئی ہو۔ لکھنؤ مین بھی ابتداءً یہی حال تھا۔ نواب آصف الدولہ اور نواب سعادت علی خان کے زمانون مین دولتمند فرانسیسی تاجر مسیو مارٹن نے دو ایک عالیشان عمارتین تعمیر کین مگر اُن کی تعمیر مین اصلی منشا یہ تھا کہ فرمان رواے شہر کو پسند آئین اور اُسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی جائین۔ اُنھین عمارتون مین لا مارٹنیز کالج ہے جس پر نواب سعادت علی خان کی جُزرسی کی وجہ سے اسٹیٹ کا قبضہ نہ ہو سکا۔ یہ وہی کوٹھی ہے جو فی الحال عوام مین "آرکین صاحب کی کوٹھی" کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد یہان کے ایک وزیر روشن الدولہ نے اپنے رہنے کے لیے ایک عمدہ عمارت بنوائی تھی جس کا انجام یہ ہوا کہ سلطنت کے حکم سے ضبط کر لی گئی۔ اور انتزاع سلطنت کے وقت اُس کا شمار مقبوضات شاہی مین تھا چنانچہ انگریزی دور مین وہ سرکاری جائداد ہونے کے باعث گورنمنٹ کے قبضے مین آگئی اور روشن الدولہ کے ورثا کو نہین دی گئی۔ مگر آج تک وہ روشن الدولہ ہی کی کوٹھی کہلاتی ہے گو کہ اُس مین صاحب ڈپٹی کمشنر بہادر اور اُنکے اسسٹنٹ

اجلاس کرتے ہین۔

رعایا کے عام مکانون کی وضع یہان یورپ کے کوٹھی نما مکانون سے بالکل جداگانہ ہوتی ہے۔ یورپ مین مکان کے اندر صحن کی ضرورت نہین ہے۔ اسلیے کہ مردون کی طرح عورتین بھی پردہ نہ کرنے کی وجہ سے باہر جا کے کھُلی فضا مین ہوا کھا لیتی ہین۔ لہذا وہان کے خلاف یہان ضرورت ہے کہ مکان کے اندر صحن ہوا کرے۔ تاکہ عورتین گھر کے اندر ہی کھُلی فضا کا لطف اُٹھا سکین۔

اس ضرورت اور یہان کی معاشرت کے دیگر تقاضون نے یہان کے مکانون کی عام قطع یہ کر دی ہے کہ بیچ مین صحن اُسکے گرد عمارت۔ اس عمارت مین ایک رُخ صدر قرار دے دیا جاتا ہے۔ اور اُدھر اینٹ چونے کے ستونون پر کم از کم تین اور کبھی اس سے زیادہ محراب دار در قائم کیے جاتے ہین۔ محرابین عموماً شاہجہانی محرابون کے نمونے کی ہوتی ہین۔ یعنی اُن مین چھوٹی چھوٹی قوسون کو خوشنمائی سے جوڑ کے بڑی محراب بنائی جاتی ہے۔ صدر مین اکثر ایسی محرابون کے دوہرے تہرے ہال ہوا کرتے ہین۔ پچھلا ہال کبھی دروازے لگا کے ایک بڑا کمرہ بنا دیا جاتا ہے۔ اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ تقریباً کمر کمر تک اُس کی کرسی بلند کر کے وہ شہ نشین بنا دیا جاتا ہے۔

ان بڑے ہالون کے دونون پہلوؤن پر کمرے ہوتے ہین۔ اور ہال کی چھت اتنی اونچی ہوتی ہے کہ پہلو مین تلے اوپر دو کمرے ہال کی ایک چھت کے اندر آ جاتے ہین۔

اب صحن کے دونون پہلوؤن پر اُسکے طول کے مناسب دالان۔ کمرے اور کوٹھریان بنا دی جاتی ہین۔ جن مین باورچی خانہ۔ پائخانہ۔ مودی خانہ۔ زینہ۔ کنوان۔ اور ماما اصیلون کے رہنے کے مقامات ہوتے ہین۔ صدر دالان کے مقابل جانب بھی اگر ضرورت معلوم ہوئی یا استطاعت ہوئی تو ویسے ہی عالیشان دالان اُدھر بھی بنا دیے جاتے ہین جیسے کہ صدر جانب ہوتے ہین۔ دروازہ اکثر پہلو مین یعنی ان سمتون مین ہوتا ہے جدھر باورچی خانہ اور شاگرد پیشہ کے رہنے کے کمرے ہوتے ہین۔ جس کے سامنے اندر کے رخ پر مقابل دو۔ ایک پہلو مین قد آدم

سے ذرا بلند ایک دیوار قائم کر دی جاتی ہے تاکہ دروازے سے اندر کا سامنا نہ ہو۔
غریبون اور اوسط درجے والون کے مکانون مین اکثر پختہ محرابون کے عوض اُسی وضع کے چوبی سہ درے قائم کر کے دالان بنا دیے جاتے ہین جن مین صدر مین اور کبھی اُس کے مقابل جانب بھی دالان در دالان ہوتے ہین۔ اِس قسم کے جو مکان زیادہ مکمل ہوتے ہین اُن مین چارون طرف سہ درے اور دالان ہوتے ہین۔ اور اُنکے پہلوون مین ایک ایک دروازے کی کوٹھریان نکلتی ہین جو مختلف ضروریات کا کام دیتی ہین۔ اور اُنھین مین سے کسی مین باہر کا دروازہ ہوتا ہے۔

یہ یہان کے مکانون کا ایک عام خاکہ تھا۔ مگر اسی چھوٹی وضع کو قائم رکھ کے اکثر مکانون مین نیچے اور ہر جگہ ایسی حکمت اور خوش اسلوبی سے کیدرے، کمرے اور کوٹھریان نکالی جاتی ہین کہ تعجب معلوم ہوتا ہے اتنی تھوڑی سی جگہ مین اتنی مکانیت کیونکر آ گئی۔

فن عمارت کی تاریخ پر نظر ڈالیے تو نظر آنے گا کہ ابتداءً پست عمارتین بنتی تھین۔ پھر بلند اور مضبوط مگر سادی عمارتین بننے لگین۔ اسکے بعد زیب و زینت کے لیے اُن پر نقش و نگار بننے لگے۔ پچی کاری کی ایجاد ہوئی۔ اور عجیب و غریب طریقے سے رنگ آمیزیان کی جانے لگین۔ لیکن باوجود ان سب کمالون کے اب تک بڑے بڑے پو ڑے آثارون کی دیوارین ہوتین۔ اور اُن مین بڑے بڑے ہال۔ اور دیوان خانے بنا دیے جاتے۔

سب سے بعد کا کمال ہندوستانی عمارت مین یہ تھا کہ درزی کی سی کتر بیونت کر کے تھوڑی سی زمین مین بہت زیادہ مکانیت نکال دی جائے۔ عمارت کا یہ کمال خاص دہلی سے شروع ہوا۔ وہین اُس نے بڑے اعلیٰ درجے تک ترقی کر لی۔ وہان سے سب جگہ پھیلا۔ اور لکھنؤ مین اُس نے سب مقامات سے زیادہ ترقی کی۔

آج کل بڑے بڑے اُستاد انجنیئر موجود ہین۔ جنھون نے بڑی بڑی عالیشان عمارتین بنوائی ہین۔ وہ نمائشی طور پر عمارت کی ایک نہایت ہی خوبصورت

اور شاندار شکل قائم کردین گے - لیکن یہ کام فقط پُرانے کاریگرون کا حصہ ہے - کہ زمین کے ایک چھوٹے ٹکڑے پر عالیشان عمارت بنا کے کھڑی کردین - اور اُس مین ہندسانہ کمال سے اتنے دالان کمرے کوٹھریان اور صحنچیان نکالدین کہ دیکھنے والے کی عقل چکر مین آجائے - اندرونی پردے کی دیوارین اتنی پتلی نازک سبک اور اُسکے ساتھ مضبوط ہون کہ معلوم ہو اینٹ چونے کی دیوارین نہین لکڑی کی اسکرینین ہین -

عمارت مین لکھنؤ کی یہی خصوصیت تھی جس کو اگلے دربار نے نشو ونما دیا - مگر اب انگریزی عہد مین یہ کمال ناقدری کی وجہ سے مٹتا جاتا ہے - پُرانے کاریگر فنا ہوگئے اور جو دو ایک باقی ہین اُن کی قدر نہین

مگر پُرانے ہی زمانے سے ہندو مسلمانون کے مکانون مین ایک بیّن فرق چلا آتا ہے جو آج تک موجود ہے - ہندو اپنے مکانون مین صحن بہت چھوٹا اور تنگ رکھتے ہین - اور بلا لحاظ اسکے کہ ہوا اور روشنی کا گذر ہوگا یا نہین مکانیت بڑھاتے چلے جاتے ہین - بخلاف اس کے مسلمان کُھلے ہوادار مکان چاہتے ہین - اور مکانیت اُسی درجے تک بڑھاتے ہین جہان تک کہ ہواداری اور روشن رہنے مین فرق نہ آئے - لیکن باوجود مسلمانون کے اس مذاق کے اگلے کاریگرون نے اُنکے ہوادار مکانون مین بھی اس قدر مکانیت نکالی ہے کہ دیکھنے والے عش عش کرجاتے ہین -

اسکے علاوہ اُس زمانے کے باکمال معمار دروازون کمرون کی محرابون اور دالانون اور کمرون کی دیوارون پر مختلف رنگون سے ایسے نفیس اور اعلیٰ درجے کے نقش و نگار بناتے تھے جیسے اب مشکل سے بن سکتے ہین - اور آج کل مصوری کا فن بیشک ترقی کرگیا ہے - مگر معمار جیسی نقاشی در و دیوار پر کیا کرتے تھے وہ مٹ گئی اور عہد جدید کی سادگی پسندی کی وجہ سے روز بروز مٹتی جاتی ہے - تاہم اب بھی یہان اس کام کے بعض اُستاد معمار ایسے پڑے ہین کہ اُنکی سی نقاشی شاید کسی شہر کے معمار نہ کرسکین گے - نقش و نگار ہی نہین وہ چھتون اور دیوارون پر اعلیٰ درجے کی تصویرین بھی بنا سکتے ہین -

معماروں ہی پر منحصر نہیں اُس وقت کے بڑھئیوں کو بھی یہی کمال حاصل تھا۔ وہ چاہے اعلیٰ درجے کی میزیں کرسیاں اور الماریاں یا ریلوے ٹرین کی گاڑیاں نہ بنا سکیں۔ مگر ستونوں محرابوں اور دروازوں کے چوکھٹ بازووں پر ایسے نفیس و نازک نقش و نگار کھود کے بنا دیا کرتے تھے جیسے آج مشکل سے بن سکیں گے۔

(۳۹)

معاشرت میں دوسری چیز مکانوں کا فرنیچر یعنی وہ سامان ہے جس سے مکان آراستہ کیے جاتے ہیں۔ اُن دنوں آج کل کی سی میز کرسیاں نہ تھیں بلکہ خاص ہندوستانی اور اسلامی مذاق کا سامان تھا۔ مکانوں میں تختوں کے چوکے ہوتے۔ پلنگ ہوتے۔ یا تختوں کے اوپر بچھانے کے لیے نازک اور خوشنما پلنگڑیاں ہوتیں۔ غریبوں اور متوسط حیثیت والوں کے یہاں بانوں کے پلنگ ہوتے اور امرا کے گھروں میں علی العموم نواڑ کے پلنگ ہوا کرتے۔

نفیس طبع لوگوں کے گھروں کی یہ شان ہوتی کہ جھاڑو دی ہوئی ہے۔ دیواروں پر سفیدی پھری ہے۔ چھت پر اُجلی سفید چھت گیری کھنچی ہوئی ہے جسکے چاروں طرف چھینٹ دی ہوئی جھالر لٹک رہی ہے۔ دالان کمرے یا صحن میں تختوں کا چوکا ہے اُسپر دری ہے اور دری پر سفید براق چاندنی۔ جو اس نفاست سے کھینچ کے بچھائی گئی ہے کہ شکن کا کہیں نام نہیں۔ چاروں کونوں پر سنگ مرمر کے گنبد نما میر فرش کے کونوں کو دبائے ہوئے ہیں تاکہ ہوا میں چاندنی اُڑنے نہ پائے یا اُس میں شکنیں نہ پڑیں۔

اوپر اُجلا فرشی پنکھا ہے۔ اُس کا بھی بعد کے زمانے میں رواج ہوا ورنہ دراصل ان مکانوں کی زینت دستی پنکھوں سے ہوتی جو حسب مرتبہ اور درجۂ رتبہ بڑے تکلف و اہتمام سے بنائے جاتے۔ اور اُن کا حال ہم آئندہ کسی موقع پر بیان کریں گے۔ اُس چوکے اور فرش پر خواہ کمرے کے اندر ہو یا باہر ایک جانب جو صدر مقام قرار پاتا نواڑ کا نفیس اور خوبصورت پلنگ بچھا ہوتا۔ پلنگ کے اوپر گرمیوں میں دری اور جاڑوں میں توشک ہوتی۔ اور اُس کے اوپر

ایک اُجلی چادر بچھی رہتی۔ پلنگ کی چادر مین شاہی محلون یا اُنکے ہم رتبہ محلسراؤن مین ایک نیچی زمین کے قریب تک کی چینٹ وار جھالر چارون طرف لٹکی ہوتی جو پلنگ مین ایک خاص شان پیدا کردیتی۔ چارون پاؤن پر بچھونے کے چارون کونے ریشم کی رنگین ڈوریون سے ایک خوشنما بندش سے باندھ دیے جاتے تاکہ لیٹنے اور کروٹین بدلنے مین بچھونا کھنچنے اور اپنی جگہ سے سرکنے اور ہٹنے نہ پائے۔

سرہانے پلنگ کے عرض کے برابر مربع مستطیل قطع کے پتلے پتلے چار نہایت ہی نرم تکیے ہوتے۔ یہ تکیے اکثر شاپاف (ڈول) کے ہوتے اور اُن پر تنزیب یا تپیل نین سُکھ کے سفید غلاف چڑھے ہوتے۔ جن مین توَل کی سرخی اپنی جھلک دکھاتی اور وہ پراٹھے کی پرتون کی طرح تلے اوپر رکھے جاتے۔ پھر اُنکے اوپر ادھر اُدھر اُسی کپڑے کے دو ننھے ننھے نرم گل تکیے ہوتے تاکہ کروٹ سے لیٹنے مین گالون کے نیچے رہین۔ یہ گل تکیے ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ بڑے نہ ہوتے۔ اسکے بعد بچھونے پر دونون جانب دونون پٹیون کی جانب دو گول تکیئیان رہتین جن کو کروٹ لیٹتے وقت رانون کے نیچے دبا لینے مین آرام ملتا۔ پائنتی دولائی رضائی یا لحاف موسم کے مناسب لگا دیے جاتے۔ اور دن کو جب کوئی لیٹنے والا نہ ہوتا سارے پلنگ پر ایک پلنگ پوش پڑا رہتا۔

چوکے پر پلنگ کے آگے صدر نشینی کے لیے فرش کے اوپر ایک قالین سند کی وضع مین کچھا دیا جاتا۔ اور قالین پر پلنگ سے ملا ہوا گاؤ ہوتا جس پر روز کے استعمال کے لیے تو سفید غلاف رہتا مگر اعلیٰ تقریبون کے موقعون پر نہایت قیمتی ریشمی اور اکثر کارچوبی کام کے غلاف چڑھا دیے جاتے۔

اور اگر چوکے پر پلنگ نہ ہوتا تو اُس کے کسی ایک رُخ پر جو مناسب معلوم ہو مسند تکیہ ہوتا اور اُسپر نشست ہوتی۔

دیوارون پر اگرچہ کبھی کبھی تصویرین ہوتین مگر تصویرون کا جس قدر اب مرواج ہے اُن دنون نہ تھا۔ بلکہ تصویرون کے عوض عمدہ قطعات جن پر بڑی نفاست سے نقش و نگار بنائے جاتے فریم مین جڑ کے دیوارون پر لگا دیے جاتے

ان قطعات کا اُس زمانے مین رؤسا کو اس قدر شوق تھا کہ اُنھین کے لکھنے اور تیار کرنے پر خوشنویسون کی زندگی بسر ہوتی - اور سچ یہ ہے کہ اسی شوق نے اُس زمانے مین وہ نامور و باکمال خوشنویس پیدا کر دیے جو سوا قطعات لکھنے کے کتابت کو اپنے لیے ننگ اور اپنے معمولی شاگردون کا کام سمجھتے -

تختون کے علاوہ صحن ڈیوڑھی اور دروازے کی باہر کی نشست کے لیے مونڈھے ہوتے جو اگرچہ اب بھی کہین کہین نظر آ جاتے ہین - مگر ان دنون شریفون کا کوئی گھر اُن سے خالی نہ تھا - یہ سینٹھے اور بانسون سے بنائے جاتے اور جن گھرون مین اُن کا زیادہ اہتمام ہوتا اُن مین ان مونڈھون پر بکری کی خشک کھال جس مین بال موجود ہوتے چڑھا دی جاتی - یا مضبوطی کے لیے وہی بالدار چمڑا فقط اُنکے کنارون پر چڑھا ہوتا - یہ مونڈھے اُن دنون بڑی بکار آمد چیز تھے -

امرا کے سوا جو زنانے اور مردانے دو مکان رکھتے تھے - عوام اور اکثر متوسط طبقے والے فقط ایک ہی مکان پر زندگی بسر کرتے - اب علی العموم کوشش کی جاتی ہے کہ ہر مکان مین دروازے کے پاس کوئی بیرونی کمرہ ضرور موجود ہو اُن دنون اس کا چندان خیال نہ تھا - بلکہ ڈیوڑھی مین اور اُس مین گنجایش نہ ہوتی تو دروازے کے باہر ہی مونڈھے ڈال کے لوگ احباب سے ملتے - اور اُس مین کوئی مضائقہ نہ سمجھا جاتا -

کمرون اور دالانون کے اندر اکثر طاقون پر خوشنمائی و زیبایش کے لیے کاغذ کے گلدستے رکھ دیے جاتے -

دالانون کی محرابون کے لیے عموماً پردے ضروری سمجھے جاتے مگر آج کل سینٹھون سرکیون یا ٹاٹ کے پردون کا جو رواج ہے اُن دنون نہ تھا بلکہ اس قسم کے پردے معیوب سمجھے جاتے - اور اُن کی جگہ قول یا جاجم کے روئی دار پردے تیار کرائے جاتے - جو اکثر بندھے رہتے - فقط ضرورت کے اوقات مین کھول کے لٹکا دیے جاتے - زنانی محلسراؤن کے بیرونی دروازون پر بھی اسی قسم کے پردے ہوتے - جس کے پاس کوئی ماما یا کہاری اکثر کھڑی نظر آتی -

(۳) وضع قطع - اس کا ذکر لباس کے سلسلے مین آچکا ہے - مگر اس موقع پر ہمین یہ بتانا ہے کہ اُن دنون شرفا کے مذاق مین اپنے گھر پر اندر یا باہر پورے کپڑے پہننے کی ضرورت نہین سمجھی جاتی - بلکہ سر سے پانون تک برہنہ رہنا اور فقط ایک توال کی غرقی یعنی مختصر سی لنگی باندھے رہنا معیوب نہ تھا - یہ غرقی اس قطع کی ہوتی کہ جانگھیا کی طرح بجز ستر پوشی کے ٹانگین بھی ننگی رہتین - فی الحال ہمارے شرفا اپنے گھر پر بھی اندر یا باہر بنیائن - کرتا - اور پائجامہ پہنے رہنا لازمی سمجھتے ہین - مگر جس عہد کا ہم ذکر کر رہے ہین اُن دنون بظاہر گھر مین اتنے کپڑے پہنے رہنا وضعداری کے خلاف تھا - اُسوقت بہت سے ایسے لوگ تھے جو فقط گھر سے نکلتے وقت انگرکھا پائجامہ پہن لیتے - اور اس طریقے سے ایک شوب کو مہینون تک نباہ لے جاتے - اور کپڑون کی یہ حالت ہوتی کہ معلوم ہوتا کہ آج ہی دھو کے آئے ہین - معمول تھا کہ دھوبی کے وہان سے آیا ہوا انگرکھا پہنا جاتا تو اُس کی دامن - گوٹ - اور آستینین چُنی جاتین - اس چُناوٹ کے نشان مہینون اُسی طرح برقرار رہتے -

ہان عورتون کے لباس مین البتہ کوئی فرق نہ آتا - وہ اپنے گھر مین اُتنے ہی کپڑے پہنے رہتین جتنے کہین مہمان جانے مین پہنتین - یہ اور بات ہے کہ آنے جانے کا جوڑا بھاری اور قیمتی ہوتا - اور گھر مین پہننے کا معمولی - کسی کے وہان مہمان جانے کی صورت مین مرد اور عورت دونون عمدہ نفیس اور بھاری پوشاکین پہن کے جاتے - اور لباس کی عمدگی کی وجہ سے مردانی و زنانی دونون صحبتین بہت صاف ستھری اور بارونق رہتین -

(۴۰)

مردون کی وضع مسلمانون مین قدیم الایام سے یہ چلی آتی تھی کہ سر پر بال - کتری ہوئی مونچھین - اور ڈاڑھی گول اور مقطع - مذہبی لوگ علما و زہاد ڈاڑھی کو حسب سنت نبوی بالکل چھوڑ دیا کرتے تھے - اور مونچھون کے قصر مین کبھی اتنا مبالغہ کرتے کہ منڈا ڈالتے - لیکن امرا و شرفا کی وضع یہ تھی کہ ڈاڑھی کے لیے نیچے گلے کے پاس اور اوپر گالون پر حدین قائم کی جاتین - اور جو بال زیادہ

بڑھ جاتے اُن کو کاٹ کے ڈاڑھی میں گولائی پیدا کر کے اُسکی درازی کی ایک حد مقرر کر دی جاتی - سب سے پہلے شہنشاہ اکبر نے ڈاڑھی کو خیرباد کہی - اور اُسکے بعد جہانگیر کے منہ پر بھی ڈاڑھی نہ تھی - اکبر و جہانگیر کے درباریوں پر اس کا چاہے کسی حد تک اثر پڑ گیا ہو مگر امرائے اسلام کی عام وضع وہی رہی جو پہلے سے چلی آتی تھی -

لکھنؤ میں دربار قائم ہونے کے بعد ڈاڑھی میں قصر شروع ہوا - اور ہوتے ہوتے اکثر کے مُنہوں پر سے ڈاڑھیاں غائب ہو گئیں - غالباً اس کا یہ اثر ہو کہ ہم مذہبی کی وجہ سے یہاں کے دربار پر ایرانیوں کا اثر پڑ رہا تھا - اور وہاں شاہان صفویہ کے عہد سے بادشاہوں اور امیروں میں ڈاڑھی کی وہ اہمیت نہیں باقی رہی تھی جو آغاز اسلام سے چلی آتی تھی - یا تو مسلمانوں میں کسی کی ڈاڑھی مونڈ دینا سزا دینے یا اُسکی تذلیل و تحقیر کرنے کے لیے تھا یا ایران میں ڈاڑھی نہ رکھنا شان امارت و حکومت میں داخل ہو گیا - لکھنؤ کے خاندان نیشاپوری کے پہلے بانی نواب بُرہان الملک کے منہ پر مقطع ڈاڑھی تھی - شجاع الدولہ نے ڈاڑھی مُنڈائی - اور اُسکے بعد سے یہاں کے تمام اُمرا اور بادشاہ ڈاڑھیاں مُنڈاتے رہے - اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ عام شیعوں سے ڈاڑھی کا رواج اُٹھ گیا - پھر بعد کے زمانے میں بہت سے سُنیوں نے بھی ڈاڑھیاں کتروائیں یا مُنڈا ڈالیں - ڈاڑھی مُنڈانے کا شوق پیدا ہونے کے بعد طرح طرح کی وضعیں نکلنے لگیں - کسی نے کانوں کے نیچے چھوٹی چھوٹی قلمیں نکالیں - کسی نے ٹھیکے رکھوائے - کسی نے بڑے بڑے گلپھڑے رکھے - اطراف و جوانب لکھنؤ کے قصباتیوں اور بعض شہر کے سنّیوں نے بھی یہ وضع اختیار کی کہ ڈاڑھی رکھتے مگر راجپوتوں اور ہندی پٹھانوں کے مذاق کے مطابق ڈاڑھی کے بیچ میں ٹھڈی کے پاس مانگ نکال کے دونوں طرف کے بالوں کو کانوں کی طرف چڑھاتے - اور اس وضع پر ڈاڑھی کے قائم رکھنے کے لیے گھنٹوں ڈھاٹہ باندھے رہتے - پھر اُس چڑھی ہوئی ڈاڑھی کے ساتھ مونچھیں بھی کنگھی کر کے اور باندھ باندھ کے اوپر کے رُخ پر چڑھائی جاتیں -

چنانچہ یہی وضع یہان اور سارے ہندوستان مین سپہگری اور شجاعت کی علامت تصور کی جاتی۔

سر کے متعلق حضرت سرور کائنات صلعم کے مبارک عہد مین عام مذاق تھا کہ سر پر بڑے بڑے بال ہوتے جو حج کے زمانے مین منڈا یا کٹوا دیے جاتے۔ مگر عرب ہی مین ظہور اسلام کے چند روز بعد سر منڈانے کا عام رواج ہوگیا اور یہی رواج ایران مین معلوم ہوتا ہے۔ اور مسلمان ابتداءً جب ہندوستان مین آئے ہین تو اسوقت اُن کی وضع عموماً یہی تھی کہ منڈے ہوے سر اور اُن پر عمامے۔ ہندوون مین مسلمانون کے آنے کے وقت سر پر بال رکھنے کا رواج تھا۔ یہی وضع یہان کے مسلمانون کو پسند آئی۔ چنانچہ آخر عہد مین علما و اتقیا اور مشائخ و صوفیہ کے سوا دہلی کے شریف و وضیع کی عام وضع یہ تھی کہ سر پر بال ہوتے جو کانون تک رہا کرتے۔ سوا بانکون کے جو نئی نئی دھجین نکالا کرتے۔

اسی وضع مین شرفاے دہلی لکھنؤ مین آئے۔ یہان آ کے نازک مزاجیان بڑھین۔ خود آرائی کے شوق مین ترقی ہوئی۔ اور نہایت نزاکت اور صفائی سے کنگھی کر کے ماتھے پر عورتون کی طرح پٹیان جمائی جانے لگین۔ اور ایسی وضع پیدا ہوگئی کہ نوخیز لڑکون مین عورتون کی سی دلکشی پیدا ہوگئی۔ پھر چند روز کے بعد جب انگریزون سے سیکھ کے عورتون نے ماتھا خوب کھول کے بال اُلٹنا شروع کیے تو یہ وضع بھی بعض بعض مردون نے اختیار کر لی۔

اب غدر کے بعد جب انگریزی وضع قطع اختیار کی جانے لگی تو سارے ہندوستان کے لوگون کی طرح یہان بھی بال کٹ کے انگریزی فیشنون کے ہوگئے۔ اور جتنے منھون پر داڑھیان باقی رہ گئی تھین وہ بھی تشریف لے گئین۔

عورتون کے بالون کی وضع غالباً لکھنؤ مین وہی ہوگی جو دہلی مین تھی۔ لیکن یہان شاہی مین دولھنون اور بناؤ چناؤ کرنے والی عورتون کی چوٹیون مین بڑے بڑے رنگین دو پٹون کے موباف ہوتے جو خوب پیچ دے کے مؤخر دماغ سے کمر تک بٹ کے لٹکا دیے جاتے۔ اور زیادہ تکلف کے وقت اُن مین چوڑا لچکا

پلیٹ دیا جاتا اور معلوم ہوتا کہ بڑی بھاری موٹی چوٹی سرتاپا چاندی کی ہے۔ ماتھے پر محراب دار پٹیاں جمائی جاتین۔ اور اُنکے بیچ مین چاند ٹیکی کے گرد سنہری یا روپہلی افشان اور ستارون سے نقش ونگار بنائے جاتے۔

ہاتھون پاؤن مین مہندی عورتون کے لیے لازمی تھی۔ گر اُن کے ساتھ رنگین مزاج مَردون نے بھی کثرت سے مہندی لگانا شروع کر دی تھی۔ جسکو دیکھ کے باہر والے لکھنؤ کے مَردون مین زنانہ پن پاتے اور اُن کا نام رکھتے۔

(۴) معاشرت مین چوتھی چیز اخلاق و عادات ہین۔ اس بات مین لکھنؤ والون نے خصوصیت کے ساتھ نمود حاصل کی۔ یہی چیز لکھنؤ مین خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ اور اسپر بحث کرنا سب سے زیادہ اہم ہے۔ دراصل لکھنؤ مین ایشیائی تہذیب کو انتہائی ترقی ہوگئی۔ اور کسی مقام کے لوگون مین معاشرت کے وہ قواعد نہین ملحوظ خاطر رہتے جن کے اہل لکھنؤ عادی ہو گئے ہین۔

تہذیب دراصل اُن اخلاقی تکلفات کا نام ہے جن کو کوئی قوم تقاضائے شرافت سمجھنے لگے۔ آج کل ہم اکثر لوگون کو یہ کہتے دیکھتے ہین کہ ملنے جلنے مین چنان وچنین اور معاشرت کے تکلفات ایک قسم کی فضول ریاکاری ہین۔ مگر یہ اُن کی غلطی ہے۔ یون تو فضول ریاکاری لباس اور بود وباش کا انتظام بھی ہے اور بہیمیت کی زندگی کو چھوڑکے انسانیت کی زندگی اختیار کرنے کے تمام امور فضول ریاکاری کہے جا سکتے ہین۔ اصل یہ ہے کہ جن لوگون کو انسانی تہذیب نہین آتی اور مہذب لوگون سے ملنے کا سلیقہ نہین ہوتا اُنھون نے اپنے لیے عذرداری کا بہانہ اس بات کو قرار دے لیا ہے کہ ہمین شہر والون یا مہذب لوگون کی ایسی دکھاوے کی باتین نہین آتین۔ مگر غور کرو تو انسانیت ہی دکھاوا ہے۔ اچھا پہننا۔ اچھا سامان معیشت رکھنا۔ اچھا کھانا۔ اور ہر کام مین صفائی کا خیال کرنا۔ سب دکھاوا ہے۔

تہذیب اخلاق کا پہلا اصول یہ ہے کہ میل جول مین دوسرے کو ہر لطف اور نفع کی بات مین اپنے اوپر فوقیت دی جائے۔ اور آپ کو اُس کے پیچھے اور اُس سے ادنیٰ درجے پر رکھا جائے۔ کسی کی تعظیم کے لیے

اُٹھ کھڑا ہونا۔ اُس کے لیے صدر کی جگہ کو خالی کرنا۔ اور اُسے صدر مین بٹھانا۔ اُسکے سامنے ادب سے دوزانو بیٹھنا۔ اُس کی باتون کو توجہ سے سننا اور عاجزی کے لہجے مین جواب دینا۔ یہ سب باتین دوسرے کو اپنے اوپر فوقیت دینے کی ہین۔ اور یہ جس درجے تک وضعدار شرفاے لکھنؤ مین مروج تھین لکھنؤ کے عہد شباب کے زمانے مین اور کہین نہ تھین۔

یہ تو وہ باتین ہین جن کو ملنے جلنے کے طرز عمل سے تعلق ہے۔ مگر یہی چیزین جب اخلاق و عادات مین پوری طرح پیدا ہو جاتی ہین تو انسان مین ایثار نفس کا مادّہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہ آمادہ ہو جاتا ہے کہ دوستون کے ساتھ ہر طرح کی رفاقت اور ہر بات مین اُن کی اعانت کرے۔ عہد شاہی مین یہ چیز اہل لکھنؤ مین پورے کمال کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہان کثرت سے ایسے لوگ پیدا ہو گئے تھے جن کا بظاہر کوئی ذریعۂ معیشت نہ تھا۔ اُن کے احباب ایسے مخفی طریقون سے اُن کی کفالت کرتے کہ کسی کو کبھی پتہ بھی نہ چل سکتا۔ اور ذرائع معاش کے مخفی رہنے کے باعث وہ سفید پوشی اور امیرانہ وضع کے ساتھ بڑے بڑے امیرون کی صحبتون مین شریک ہوتے اور کسی کے سامنے اُن کی آنکھ نیچی نہ ہوتی۔ لکھنؤ ایسے لوگون سے بھرا ہوا تھا کہ انقلاب سلطنت ہو گیا۔ اور یک بیک اُنکے بسر کرنے کے ذریعے مفقود ہو گئے۔

امرا کے ایثار کی اس شان نے یہان شرافت کا یہی معیار قرار دے دیا تھا کہ دوسرون کے ساتھ ایسے اخلاق سے پیش آئین اور اُنکی خاطر داشت مین ایسی فیاضی دکھائین جس مین احسان رکھنے کا نام کو بھی شائبہ نہ ہو۔ دنیا کے تمام بڑے شہرون مین بڑے بڑے تاجر اور دولتمند موجود ہین۔ جو لاکھون روپیہ مستحقون کو دے ڈالتے ہین۔ مگر اُنکے طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک پیسہ بھی اُنھون نے بے غرضی سے نہین صرف کیا۔ بخلاف اسکے لکھنؤ والون کی دوست پروری اور شریف نوازی ایسی تھی کہ دُنیا کو دینے اور لینے والے مین کوئی فرق نہ نظر آتا۔

اس مین شک نہین کہ جب بعد انقلاب سلطنت بڑے بڑے اُمرا مفلس

نادار ہو گئے۔ اور وہ گروہ جو مخفی ذرائع معاش پر بسر کر رہا تھا فاقے کرنے لگا تو امرا فیاضی و ایثار نفس کا جوہر دکھانے سے معذور ہو گئے۔ مگر ظاہری اخلاق جو سرشت میں داخل ہو گیا تھا ویسا ہی باقی رہا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں کی یہ حالت ہو گئی کہ اپنی باتوں سے تو اعلیٰ درجے کی مہمان نوازی کی امید دلاتے ہیں۔ مگر ان کے مہمان ہو جیے تو اسکے خلاف ظاہر ہوتا ہے۔ اسی کو اکثر لوگوں نے ریاکاری و لفاظی سمجھ رکھا ہے۔ مگر افسوس یہ ریاکاری نہیں بلکہ حوصلہ مندی ہے جس کی استطاعت نہیں۔ ایسے لوگوں پر اعتراض نہ کیجیے بلکہ ان کی حالت پر ترس کھائیے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دولتمندی کے زمانے میں چونکہ شہر کی آبادی کا زیادہ حصہ امرا و شرفا اور احباب کی مخفی دستگیری پر بسر کر رہا تھا اس کی وجہ سے محنت۔ جفاکشی۔ اور وقت کی قدر و قیمت جاننے کا مادہ علی العموم اہل لکھنؤ میں فنا ہو گیا۔ اور جو مشاغل انھوں نے اختیار کیے وہ ان کو ترقی قومی کی شاہراہ سے روز بروز دور کرتے گئے۔ انکے مشغلے لہو و لعب کے سوا کچھ نہ تھے۔ بیفکری اور فکر معاش سے سبکدوش ہونے نے انھیں کبوتر بازی۔ بٹیر بازی۔ مرغ بازی۔ چوسر۔ گنجفے۔ اور شطرنج کا شایق بنایا۔ جن کاموں پر وہ آدمی کا زیادہ تر حصہ صرف کرنے لگے۔ اور "اندیشۂ فردا" کے لفظ سے ساری آبادی ناآشنا تھی۔ کوئی امیر نہ تھا جو ان مزخرفات کاموں میں سے کسی ایک کا دلدادہ نہ ہو۔ اور اسکے شوق نے اور بہتوں کو بھی اس کام میں نہ لگایا ہو۔

عیاشی اور تماشبینی سے دنیا کا کوئی شہر خالی نہیں۔ خصوصاً یورپ کی سی بدتمیزی اور بدسلیقگی کی عیاشی خدا نہ کرے کہ ہمارے شہروں میں پیدا ہو۔ لیکن لکھنؤ میں شجاع الدولہ کے زمانے میں رنڈیوں سے تعلقات پیدا کرنے کی جو بنیاد پڑی تو روز بروز اسے ترقی ہی ہوتی گئی۔ امیروں کی وضع میں داخل ہو گیا کہ اپنا شوق پورا کرنے یا اپنی شان دکھانے کے لیے کسی نہ کسی بازاری حسن فروش سے ضرور تعلق رکھتے۔ حکیم مہدی کا سا قابل ہوشیار اور مہذب

و شائستہ شخص جو وزیر اعظم کے رتبے تک پہونچ گیا تھا اُس کی ترقی کی بنیاد پیارو نام ایک رنڈی سے پڑی۔ جس نے دھڑوت کی رقم اپنے پاس سے ادا کر کے اُسے ایک صوبے کی نظامت کا عہدہ دلوایا تھا۔ ان بے اعتدالیون کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ لکھنؤ مین مشہور تھا کہ "جب تک انسان کو رنڈیون کی صحبت نہ نصیب ہو آدمی نہین بنتا"۔ آخر لوگون کی اخلاقی حالت بگڑ گئی۔ اور ہمارے زمانے تک لکھنؤ مین بعض ایسی رنڈیان موجود تھین جن کے گھر مین علانیہ اور بیباکی سے چلا جانا۔ اور اُن کی صحبت مین رہنا معیوب نہ سمجھا جاتا۔ ہر تقدیر اس چیز نے ایک بڑی حد تک اُنکے عادات و خصائل بگاڑ دیے۔ گو کہ اسکے نتیجے مین اُنھین نشست و برخاست کا سلیقہ بھی آ گیا۔

رہے عورتون کے اخلاق و عادات۔ اس بارے مین ہمارا عام دعویٰ ہے کہ جن لوگون مین زناکاری کا شوق ہو اُن کی عورتین پارسا نہین ہو سکتین۔ تاہم اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ لکھنؤ مین عورتون کے اخلاق اتنے خراب نہین ہوے جتنے کہ مردون کے خراب ہوے تھے ملنساری اور اپنی ملنے والیون کے ساتھ ادب و تعظیم سے ملنا عورتون مین بھی ویسا ہی تھا جیسا کہ مردون مین تھا۔ کسی زمانے مین چرخہ کاتنا شریف عورتون کا شریفانہ مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ اب اگرچہ سوت کی کلون نے اس مشغلے کو بالکل بیکار اور بے نتیجہ کر دیا۔ مگر شوقینی و امارت نے اس سے پہلے ہی یہ مشغلہ یہان کی عورتون سے چھڑا دیا تھا۔ یہان اُس کے عوض عورتون کو سینے پرونے۔ کاڑھنے۔ گھرون کی صفائی کا انتظام کرنے ماماؤن لونڈیون اور پیش خدمتون سے کام لینے اور بننے سنورنے کا زیادہ شوق تھا۔ اور بیویون کو گھر کے کامون اور شوہر اور بچون کے کپڑون سے اتنی فرصت نہ ملتی تھی کہ جن لہو و لعب کے کامون مین مرد مبتلا ہو گئے تھے اُن مین وہ بھی مبتلا ہون۔ درحقیقت اُس دور مین مرد گھرون مین بیٹھے کھیلا کرتے تھے۔ گھر بار اور دنیا کا سارا کارخانہ فقط عورتون کے دم سے چل رہا تھا۔

مگر امیرون کے محلون مین جب سارا کاروبار ماماؤن۔ مغلانیون پیش خدمتون

اور اناؤن کے ہاتھ مین ہوگیا تو عالی مرتبہ بیگمون کے سامنے مجرا کرنے کے لیے ڈومنیون کے طائفے ملازم ہوے - اور جن محلون مین مستقل طور پر ڈومنیان نوکر نہ تھین وہان شہر کی عام ڈومنیون کی جلد جلد آمدورفت رہتی اور آئے دن وہ طبلہ سارنگی لیے ڈیوڑھی پر کھڑی ہی رہتین - اس لیے اُن کے سیکڑون طائفے شہر مین موجود تھے - ڈومنیون کا مذاق جہان تک مجھے معلوم ہے نہایت فحش اور بیہودہ ہوا کرتا ہے - اور اُن کی صحبت عورتون پر کوئی اچھا اثر نہین ڈال سکتی ہے چنانچہ جس طرح مردون کی بداخلاقی کی باعث رنڈیان تھین عورتون کا اخلاق بگاڑنے کی باعث ڈومنیان ہوگئین -

لیکن شرفا کے خاندان ڈومنیون کی صحبت سے بچے ہوے تھے اور اسلیے اُن کی عورتین اس مضرت سے بچی رہین جو عمدہ خصائل و اخلاق کا بہترین نمونہ ہین - لکھنؤ کی عورتون کا کیرکٹر ہے کہ وہ شوہر پر اپنی ہر چیز کو قربان کرنے کو تیار رہتی ہین - اپنی ہستی کو شوہر کی ہستی کا ایک ضمیمہ تصور کرتی ہین - اور بعض اور شہرون کی عورتون کی طرح جو خانہ داری کے سلیقے مین لکھنؤ والیون سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہین یہان کی عورتون کو کبھی یہ خیال نہین پیدا ہوا کہ اپنا روپیہ شوہر سے چھپا کے الگ جمع کرین اور شوہر کی بیماری مین بھی اپنی دولت صرف کرنے مین تامل کرین - لکھنؤ کی عورتین وہان کی عورتون کی سی ہنرمند نہین اور گھر گرستی کے کام مین اُن کے مقابل پھوہڑ ہین - حد درجے کی مُسرف ہین چٹوری ہین - مگر شوہر کا ساتھ دینے اور اُسپر اپنی جان قربان کردینے مین سب سے اول ہین -

(۴۱)

(۵) معاشرت مین پانچوین چیز نشست و برخاست ہے - ہر متمدن قوم مین نشست و برخاست کے مختلف قوانین اور اصول موضوعہ ہوا کرتے ہین - اور اُنھین سے اُس قوم کی ترقی و تہذیب کا درجہ قائم ہوا کرتا ہے - اگر آپ عیسائیون کے متمدن شہرون پیرس - لندن اور برلن مین یا مسلمانون کے مہذب بلاد قسطنطنیہ - طہران اور شیراز مین جائیے اور وہان کے مہذب لوگون کی

صحبت مین شریک ہوجیے تو نظر آئے گا کہ اُن مین نشست و برخاست کے اخلاقی قوانین کس قدر سخت ہین ۔ مگر ہندوستان کے بڑے تاجرانہ شہرون مین آپ جائین اور وہان کے امرا و معززین سے ملین تو آپ کو اخلاقی قوانین تہذیب کا بالکل پتہ نہ چلے گا ۔ مگر اُن شہرون مین جہان کوئی خاص دربار قائم ہے یا رہ چکا ہے ۔ مثلاً حیدرآباد دکن بھوپال اور رام پور وغیرہ معزز وطنی دربارون کے قائم ہونے کی برکت سے عوام و خواص سب مین حفظ مراتب کے قواعد نظر آئین گے ۔ بخلاف تاجرانہ شہرون کے جہان تمیزداری ادب اور حفظ مراتب کا نام و نشان بھی نہ ہوگا ۔

دہلی مین اگلے دنون یہ اخلاقی اصول یقیناً سب جگہ سے زیادہ بڑھے ہوے ہون گے ۔ اس لیے کہ وہان کا دربار سب سے بڑا تھا اور صدیون سے قائم چلا آتا تھا ۔ مگر وہان تجارت پیشہ اقوام کے سوسائٹی پہ غالب آنے کی وجہ سے اگلی ساری تہذیب خاک مین مل گئی ۔ نشست و برخاست کی بنیاد امارت ریاست اور حکومت سے پڑتی ہے ۔ حکومت و ریاست بتاتی ہے کہ چھوٹون کو بڑون سے اور بڑون کو چھوٹون سے کیونکر ملنا چاہیے ۔ اور برابر والون سے کیا برتاو کرنا چاہیے ۔ مگر تجارت کو ان امارت کے چوچلون اور اخلاقی تکلیفون سے دشمنی ہے ۔ وہ معاملت اور خودغرضی کے آغوش مین پلتی ہے ۔ اور سلف سیکری فائس یعنی اپنے وقت اور اپنے روپئے اپنے ہنر اور اپنی دولت کو بے وجہ کسی پر قربان کر دینے کو حماقت اور لغویت بتاتی ہے بخلاف اس کے ریاست کا جوہر یہ ہے کہ بے غرضی کے ساتھ اپنے طرفدارون یا قابل لوگون سے مراعات کیجائے اور اس کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ جہان تجارت کو فروغ ہوگا اور تاجرون کی معاشرت خوش باش امیرون اور شریفون کی معاشرت پر غالب آجائے گی وہان کوئی اخلاقی قانون نہین باقی رہ سکتا ۔ چنانچہ اس چیز نے دہلی کے اگلے عظیم الشان دربارون کی ساری آن بان مٹا کے رکھ دی ۔ اور وہ بات نہین باقی رہی جو اس کی ناموری کی تاریخ کے شایان تھی ۔

دہلی کی تہذیب کو جب تاجرون کا ہجوم تباہ کرنے لگا تو اُس نے اپنے قدیم

وطن سے بھاگ کے لکھنؤ کے چھوٹے دربار میں پناہ لی جو اگرچہ چھوٹا تھا مگر اسکی سواد میں داخل ہوکے پھر کسی کو نہ نظر آسکتا تھا کہ دنیا میں یہاں سے بڑا کوئی اور دربار بھی ہے۔ پھر یہاں آزادی سے بیٹھ کے شرفائے دہلی سنے اپنے قوانین نشست و برخاست کو برتنا شروع کیا تو چند ہی روز میں یہ حالت ہوگئی کہ اکیلا لکھنؤ ہی سارے ہندوستان میں تہذیب و شائستگی اور آداب نشست و برخاست کا مرکز تھا۔ اور تمام شہروں کے مہذب لوگ اہل لکھنؤ کی تقلید اور پیروی کر رہے تھے۔ ان مراتب کا قائم کرنا کہ کس شخص کا استقبال دروازے تک آکے کرنا چاہیے۔ کس کے لیے فقط کھڑے ہو جانے کی ضرورت ہے۔ کس کے لیے نیم خیز ہو کے اور کس کے لیے اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے "آئیے تشریف لائیے" کہدینا کافی ہے۔ زیادہ تر اپنے دلی فیصلے اور اجتہاد پر موقوف ہے اور اس اجتہاد کا جیسا ملکہ لکھنؤ کے مہذب شرفا کو حاصل ہے کسی کو نہیں۔

یہاں کوئی برابر والا آئے گا تو کھڑے ہو کے تعظیم دیں گے۔ اُس کے لیے بہترین جگہ خالی کریں گے۔ اور جب تک وہ بیٹھ نہ جائے گا خود نہ بیٹھیں گے۔ اُس کے سامنے ادب اور تمیزداری سے بیٹھیں گے۔ چہرہ بشاش رکھیں گے۔ تاکہ اُسکو کسی قسم کا تنغص نہ ہو۔ جب وہ کوئی چیز دے گا تو ادب سے تسلیم کر کے لیں گے۔ اس کا پورا خیال رکھیں گے کہ ہماری کوئی حرکت اُسے ناگوار نہ ہو۔ اور اُس کی صحبت میں کسی اور ضروری کام کی طرف توجہ کریں گے تو اُس سے معذرت خواہ ہو کے اور معافی مانگ کے توجہ کریں گے۔ کہیں اُٹھ کے جانے کی ضرورت پیش آئے گی تو اُس سے اجازت لے کے جائیں گے۔ اگر اُس کے ساتھ جانے کی نوبت آئے تو راستے میں اُس کے پیچھے رہیں گے۔ اور اُسے آگے بڑھائیں گے۔ اصول تہذیب کی پابندی میں وہ بھی اصرار کریگا کہ "پہلے آپ تشریف لے چلیں"۔ لیکن اِدھر سے بار بار یہی کہا جائیگا کہ "جناب، آگے تشریف لے چلیں۔ میں کس قابل ہوں" اور اگر وہ کسی طرح نہ مانے اور مجبور ہی کردے تو شکرگذاری میں آداب بجا کے آگے قدم بڑھائیں گے بھی تو اس انداز سے کہ اُس کی طرف پیٹھ نہ ہو۔

اکثر لوگ ان آداب کا مضحکہ اُڑاتے ہین اور ضرب المثل ہوگیا ہے کہ چند لکھنؤ والے "پہلے آپ" "پہلے آپ" کہتے رہے اور ریل چھوٹ گئی۔ چنانچہ دونون اسٹیشن پر پڑے رہ گئے۔ اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ ہر چیز کا اعتدال سے گذر جانا بدنما اور مضر ہو جاتا ہے۔ مگر کیا اس سے یہ ثابت نہین ہوتا کہ آداب معاشرت کی نگہداشت اہل لکھنؤ کے اخلاق مین اس حد کو پہونچ گئی ہے کہ اُنکے برتنے مین اُنھین ضرر پہونچ جانے کا بھی خیال نہین رہتا؟ جو لوگ تہذیب و شائستگی سے معری ہین جو اعتراض چاہین لیکن ایک مہذب و شائستہ آدمی ان باتون کو بجائے عیب کے اخلاقی جوہر تسلیم کرے گا۔

اب تو سب شہرون کی طرح یہان بھی میز کرسیون اور انگریزی فرنیچر کا رواج ہوگیا ہے مگر پہلے نشست فرش کی تھی جو حسب حیثیت و دولت قیمتی اور پُر تکلف ہوا کرتا۔ اگر کوئی ہمرتبہ غیر یا بزرگ اور واجب التعظیم شخص آجاتا تو اُسے گاؤ کے آگے بٹھا کے سب لوگ حاضرین صحبت کی تعداد کے مطابق چھوٹا یا بڑا حلقہ باندھ کے مؤدب اور دو زانو بیٹھ جاتے۔ جس کسی سے وہ بات کرتا وہ شخص ہاتھ جوڑ کے نہایت ہی فروتنی سے جواب دیتا۔ اور اُسکے سامنے زیادہ باتین کرنا یا اپنی آواز کو اُس کی آواز پر بلند کرنا اخلاقی جرم خیال کرتا۔

لیکن اگر سب برابر والے حریفان صحبت اور یاران ہم مذاق ہوتے تو نشست مین بے تکلفی رہتی۔ اور باوجود ہمرتبہ و ہم سن ہونے کے بے تکلفی پر بھی سب ایک دوسرے کا ادب کرتے۔ اس کا خیال رہتا کہ کسی کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے جس سے کسی کی سُبکی یا اُس کی عزت کرنے سے بے پروائی ثابت ہو۔ نوکر اور خدمتگار پاس یا اُس فرش پر نہ بیٹھ سکتے جس پر یاران صحبت بیٹھے ہوتے۔ وہ تعمیل احکام کے لیے سامنے ادب سے کھڑے ہوتے یا نظر سے غائب کسی قریب ہی ایسے مقام پر ٹھہرتے جہان تک آواز پہونچ جائے اور اُن کا ہر وقت کھڑا رہنا یا زیادہ باتین کرنا بے تمیزی سمجھا جاتا۔

وہ خاصدان یا حقہ لا کے لگاتے تو صاحب خانہ اپنے ہاتھ سے دوستون کے سامنے بڑھاتا اور وہ اُٹھ کے اور تسلیم کر کے لیتے۔ بے تکلفی کی صحبتون مین

خُردون کا بے ضرورت آنا نامناسب تھا۔ اگر کبھی ضرورت سے وہ آ جاتے تو باپ کے آگے دوستون کو نہایت ہی ادب سے جھک کے آداب بجا لاتے۔ اور اُنکے آتے ہی بزرگون کی صحبت بے تکلف سے مہذب بن جاتی۔ اور جس طرح وہ خُرد سب کی بزرگی کا ادب کرتا اُسی طرح بزرگ اُس کی خُردی کا پاس کرکے اپنی بے تکلفیان چھوڑ دیتے۔

یہان کی صحبت مین روز کے ملنے والون سے مصافحے یا معانقے کا رواج نہ تھا۔ مصافحہ مقتدایان قوم کی دست بوسی تک محدود تھا۔ اور معانقہ صرف اُن دوستون کے لیے تھا جو کسی سفر سے واپس آئین یا مدت کے بعد ملین۔

زنانے مین مرد جاتے تو عورتون کا احترام کرتے۔ اُنکے سامنے ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ بے تکلفی برتین یا اُن مین زیادہ نشست رکھین۔ میان بیوی مین بے تکلفی لازمی تھی۔ لیکن گھر کی بزرگ عورتون کے سامنے وہ بھی ہرگز بے تکلف نہ ہوتے۔ وہان کے شرفا مین معمول تھا کہ نئی دُلھن جب تک چار پانچ بچون کی مان نہ ہو جائے گھر کی تمام عورتون کے سامنے شوہر سے پردہ کرتی۔ اور مجال نہ تھی کہ کوئی عزیز مرد یا عورت اُسے شوہر کے پاس یا شوہر کو اُس کے پاس جاتے دیکھ لے۔ یہ سختی شہر کے شرفا مین نہ تھی۔ شہر کے خاندانون مین میان بیوی ابتدا ہی سے ایک دسترخوان پہ کھانا کھاتے۔ مگر یہ معیوب تھا کہ ماماؤن اور پیش خدمتون کے سامنے بھی باہم بے تکلفی اختیار کرین۔

عورتون کی باہمی صحبت سوا بڑے بڑے امیرون کے گھرانے کے نسبتہً بے تکلف رہتی۔ اُن مین مہمان آنے والی بیویون کے ساتھ ایک معتدل درجے تک تکلف رہتا۔ مگر اُس تکلف کے ساتھ خلوص اور یکجہتی کا اظہار زیادہ ہوتا۔

(۴۲)

نشست برخاست ہی کے سلسلے مین ہمین یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ یورپ یا عرب و عجم کی طرح ہندوستان مین باہم ملنے جُلنے اور لطف صحبت اُٹھانے کے لیے کلبون اور سوسائٹیون کا رواج نہ تھا۔ یورپ مین ہر جگہ ایسے کلب یا ایسی سوسائٹیان قائم ہین جن مین جاکے لوگ احباب اور ہم مذاق لوگون سے

ملتے اور اُن کی صحبت سے لطف اُٹھاتے ہین - عربون - ایرانیون اور ترکون مین چاء خانے یا قہوہ خانے میل جول اور مبادلۂ خیالات کا ذریعہ بن گئے ہین جس طرح آپ دیکھتے ہین کہ جس جگہ دو چار انگریز ہوتے ہین وہان اپنا ایک کلب قائم کر لیتے ہین اور فرصت کے اوقات ہین وہان جا کے اخبار پڑھتے اور احباب سے ملتے ہین - اُسی طرح جس شہر مین ایرانیون اور عربون کی کافی تعداد ہوتی ہے وہان اُنکا کوئی چاء خانہ یا قہوہ خانہ کھل جاتا ہے - اور اُس مین جس وقت دیکھیے اُن کا کوئی نہ کوئی گروہ ضرور موجود ہوتا ہے جو وہان چاء اور حقے پیتے - کھانے کھاتے اور ساتھ بیٹھ کے گپین اُڑاتے ہین -

بخلاف اسکے ہندوستان مین کبھی اس قسم کے کلبون یا چاء خانون کا رواج نہ تھا اور نہ آج تک ہے - سرکار انگریزی نے جابجا شہرون مین اس مذاق کے پیدا کرنے کی کوشش کی - بڑے بڑے مصارف کا بار اُٹھا کے چاء خانے کھلوائے - مگر کامیابی نہ ہوئی - آج سے تیس پینتیس سال پیشتر خاص لکھنؤ کے چوک مین میر محمد حسین صاحب مرحوم ڈائرکٹر زراعت و تجارت ریاست نظام نے حیدرآباد جانے سے پہلے گورنمنٹ کی اعانت سے ایک چاء خانہ کھلوایا تھا جس مین فرنیچر بھی اچھا تھا - اور سوا نا جائز چیزون کے ہر قسم کے مشروبات تیار رہتے تھے - مگر کسی نے توجہ نہ کی - اور آخر میر صاحب کو نقصان اُٹھا کے اُسے بند کر دینا پڑا -

یہان کا پُرانا مذاق صحبت یہ ہے کہ ہر محلے مین یا آبادی کے ہر حلقے مین کوئی خوشحال یا دولتمند شخص اپنے گھر مین لوگون کے آنے اور اُٹھنے بیٹھنے کا سامان کرتا ہے - احباب کی تواضع و خاطر داشت کے لیے حقّے پان وغیرہ ضروری چیزون کو وہ اپنے ذاتی صرف سے مہیا کرتا ہے - اور اُس کے ہم مذاق بلاناغہ اور پابندی سے آتے ہین - دیر تک صحبت رہتی ہے - بذلہ سنجیان اور لطیفہ گوئیان ہوتی ہین - اور جب تک صحبت قائم رہے حقے پان سے تواضع ہوتی رہتی ہے - اور پھر ندیمانِ صحبت کے مذاق کے اعتبار سے اُن کی محفلون کا رنگ بھی بدلتا جاتا ہے - ارکانِ محفل اگر ادب اور شعر و سخن کا مذاق رکھتے ہین تو شاعری - شارِی - اور سخن آفرینی و سخن سنجی کا چرچا رہتا ہے - اگر وہ علما و فضلا ہین تو عالمانہ مذاق کے ساتھ علمی

مباحث چھڑتے ہیں - اگر مہذب امرا کی صحبت ہے تو وضع و لباس - سامان عیش کھانے پینے - اور ہر چیز کے برتنے اور ہر مذاق کے اختیار کرنے میں انتہا درجے کی نفاست و شائستگی اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ تمیزداری ظاہر کی جاتی ہے - اگر رنگین مزاج عیاشوں کی صحبت ہے تو اُس میں بازاری معشوقائیں بھی شریک ہوتی ہیں اور ناز آفرینی و ناز برداری کی ادائیں نظر آتی ہیں - یہ خیال رکھنا چاہیے کہ یورپ کی طرح یہاں مردوں کی کسی صحبت میں شریف و پاکدامن عورتیں نہیں شریک ہو سکتیں - اور احباب کی محفل میں جب کوئی عورت نظر آ جائے تو یقین جان لیجیے کہ وہ عصمت فروش بازاری رنڈی ہے - اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یورپ کی صحبتوں میں شریف و شائستہ عورتوں کے شریک ہونے کی وجہ سے بازاری عورتوں کا درجہ اور مرتبہ سوسائٹی میں اس قدر گر گیا کہ کسی شریف خاندان کا دروازہ ان کے لیے نہیں کھل سکتا - اور نہ شرفا کے کلبوں اور سوسائٹیوں میں وہ قدم رکھ سکتی ہیں - بخلاف اسکے ایک حد تک سارے ہندوستان میں اور اسی طرح لکھنؤ میں بازاری عورتوں کو یہ رُتبہ حاصل ہو گیا کہ مہذب و شائستہ امرا کی محفلوں میں اُن کے پہلو بہ پہلو بیٹھیں - اور یہاں اس مذاق میں یہاں تک ترقی ہوئی کہ بعض معزز رنڈیوں نے بھی اپنے گھروں میں ایسی ہی نشست و برخاست کی صحبتیں قائم کر دیں - جن میں جاتے ہوئے بہت سے مہذب لوگوں کو بھی شرم نہیں آتی - لکھنؤ میں چوددھرائن - بی حیدر جان اور اسی پائے کی چند اور رنڈیوں کے مکان اچھے خاصے شرفا کے کلب تھے - جن میں صاحب محفل یعنی اُن بی صاحب کی طرف سے حقے پان کی بخوبی خاطر کیجاتی - انگریزی مذاق نے اب اتنی اصلاح ضرور کی ہے کہ اگرچہ طرح طرح کی نئی بداخلاقیاں پیدا ہو گئی ہیں مگر رنڈیوں کے گھروں میں علانیہ بیٹھ کے لطف صحبت اُٹھانا ذرا معیوب سمجھا جانے لگا ہے -

بہرحال لکھنؤ کے کلب خوش باش لوگوں اور امیروں کے گھر تھے - یہاں یہ طریقہ نہایت ہی معیوب تھا اور اب تک ہے کہ ساجھے کی ہانڈی پکائی جائے - یا حاضرین محفل چندہ دے کے اور اپنے اپنے داموں کا حقہ پان یا کھانا پانی ایک ساتھ بیٹھ کے کھائیں پییں - یہاں چندے کے ذکر قوم کے لیے مایۂ شرم اور خلاف

شرافت تھے۔ اور یہاں کی تمام دعوتیں عام اس سے کہ خوشی کی تقریب میں ہوں یا محض دوستانہ ہم صحبتی کے لیے فقط ایک شخص کی طرف سے ہوا کرتیں۔ دوسرا اگر استطاعت رکھتا ہو تو اپنی طرف سے پوری دعوت دے سکتا ہے۔ یہ نہیں کر سکتا کہ اپنی دعوت میں مجھ سے کھلانے کے پانچ روپے لے کے مجھے بھی شریک کر لیجیے۔

دہلی کے تاجروں میں پتی پڑنے کا رواج ہے۔ یعنی بہت سے تاجر ل کے چندہ جمع کرتے ہیں اور اس رقم سے کوئی دعوت یا رقص و سرود کی صحبت کسی گھر میں یا باہر کی تفرج گاہوں میں کی جاتی ہے۔ مگر ہمیں یقین ہے کہ یہ طریقہ وہاں کی تجارت نے زوال سلطنت کے بعد نکال لیا ہے۔ شرفائے دہلی کا یہ مذاق ہرگز نہ تھا۔ اس لیے کہ وہاں کے شرفا میں ہوتا تو لکھنؤ میں بھی ہوتا۔ جو معاشرت میں دہلی کا شاگرد اور اُسی کے اگلے نکھرے مذاق کا نام لیوا ہے۔

(۷) صاحب سلامت اور مزاج پُرسی۔ آداب معاشرت میں چھوٹی چیز جو سب باتوں سے زیادہ اہم اور ضروری ہے سلام کرنا اور جس سے ملیں اُس کا مزاج پوچھنا ہے۔ اسلام کا قدیم مذہبی اور سیدھا سادہ سلام السلام علیک۔ اور بہت سے لوگ بولیں تو "السّلام علیکم" ہے۔ اسکے ساتھ ہی وہ لوگ اس سلام کے بعد ہر ملنے والے سے صبح کو ملیں تو "صبحکم اللہ بالخیر" یعنی اللہ تمھاری صبح خیریت سے گذرانے۔ اور شام کو ملیں تو "مساکم اللہ بالخیر" کہا کرتے تھے۔ یہی سلام اور مزاج پُرسی عربوں کی تھی جسے تعلیم دیتے ہوئے وہ مغرب میں اُندلس تک چلے گئے۔ اور مشرق میں ہندوستان تک چلے آئے۔ یورپ میں یہی طریقۂ صاحب سلامت اُن سے اہل فرنگ نے سیکھا۔ اور مشرق میں ایرانیوں۔ تورانیوں۔ اور ہندوستانیوں نے سیکھا۔ چنانچہ یورپ میں اصلی سلام جو اسلام کا خصیصہ تھا وہ تو غائب ہو گیا۔ فقط سلام کے بعد والی دعائیں "صبحکم اللہ بالخیر" اور "مساکم اللہ بالخیر" باقی رہ گئیں۔ اُنھیں کا ترجمہ "گڈ مارننگ" اور "گڈ ایوننگ" آج تک ہم صاحب سلامت میں انگریزوں کی زبان سے سنتے ہیں۔ فرانسیسی میں "بون میتین" "بون ژور" اور "بون سُوار" یعنی تمھاری صبح۔ دن۔ اور شام اچھی ہو۔ کہا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان مغربی قوموں کو صاحب سلامت کا یہ

سبق اندلس کے عرب فاتحون سے ملا ہے۔

ہندوستان اور ایران مین چونکہ بزرگون کی پرستش کا رواج تھا اور یہ چیز ان مشرقی لوگون کے رگ و پے مین سمائی ہوئی تھی اس لیے خالی خولی "السلام علیکم" کے الفاظ جو افراد قوم کی مساوات کو قائم کرتے تھے دولتمندون کو اپنے تکبر اور اپنی نخوت کے جوش مین بہت پھیکے اور اپنی شان سے کم نظر آئے۔ خصوصاً جب یہان شاہنشاہی دربار قائم ہوا اور تاجدارون نے اپنی تعظیم و تکریم کرانے مین سارے اسلامی آداب کو مٹا دیا۔ درباریون کو اپنے سامنے اُسی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہونے اور اپنی تعظیم مین جھکنے کا حکم دیا جس طرح کہ بندے خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہوتے اور رکوع و سجود کرتے ہین تو شاہی درباریون کی پیروی مین عام امرا اور دولتمندون نے بھی بجائے "السلام علیکم" کے دیگر تعظیمی الفاظ سلام کے لیے مقرر کیے۔ مثلاً "تسلیم" "کورنش" "آداب" "بندگی"۔ اور خود پرست و خدا فراموش امرائے اسلام کی برکت سے فی الحال یہ سب الفاظ ہمارے سلام ہین۔ عرب مین "السلام علیکم" کہنے کے ساتھ سوا خندہ جبینی کے اور کوئی حرکت نہین کی جاتی تھی۔ فقط سلام کے بعد ایک ہاتھ سے مصافحہ کیا جاتا۔ مصافحے مین ہاتھ کو حرکت دی جاتی اور اُسی کے ساتھ "صبحکم اللہ بالخیر" یا "مساکم اللہ بالخیر" کہا جاتا۔ اس عربی طرز صاحب سلامت کی یادگار مین اب یورپ مین سر کی ایک خفیف حرکت کے ساتھ "گڈ مارننگ" وغیرہ کہتے اور ہاتھ کو ملا کے جھٹکا دیتے ہین۔ بخلاف اسکے ہندوستان مین اب پورا سلام یہ ہے کہ مذکورۂ بالا الفاظ کہنے کے ساتھ ہاتھ کو سر یا پیشانی پر رکھتے اور رکوع کے درجے تک یا اس سے کسی قدر کم جھکتے ہین یہ جھکنا اور پیشانی پر ہاتھ رکھنا خالص ہندوانہ اثر اور مشرکانہ جذبات کی یادگار ہے ان دونون باتون مین اشارہ ہے کہ ہم آپ کے قدمون پر سر جھکاتے اور آپکے سامنے زمین بوس ہوتے ہین۔

اسی قدر نہین بادشاہون اور امیرون کے دربارون مین سلامون کی تعداد مقرر تھی۔ کہین سات سلام کیے جاتے اور کہین تین۔ عام بزرگون اور دوستون

سے ملنے میں ایک سلام کافی تھا۔ لکھنؤ میں چونکہ آداب و حفظ مراتب کا زیادہ خیال تھا اس لیے کہ خُردوں کا سلام بزرگوں سے اور نیز متوسط درجے والوں کا معزز لوگوں سے یہ ہے کہ الفاظ مذکورہ میں سے کسی ایک کو زبان سے ادا کرنے کے ساتھ داہنے ہاتھ کو سینے یا چہرے کے سامنے تک اُٹھا کے کئی بار حرکت دیجائے۔ خُردوں کے لیے آج تک یہ نہایت ہی پسندیدہ اور سعادتمندانہ سلام ہے۔ یہ ہاتھ کو کئی بار حرکت دینا متعدد سلاموں کا اشارہ ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اکثر لوگ تسلیم اور کورنش کو جمع کے صیغوں میں استعمال کرکے کہتے ہیں "تسلیمات" اور "کورنشات" یہ بھی سلام کے تعدد کی یادگار ہے۔

اب ہم مذکورۂ بالا مروجہ الفاظ سلام کے معنی اور اُنکی شان و اصلیت جدا جدا بیان کرتے ہیں۔ تسلیم کے معنی عربی میں سلام کرنا ہیں۔ بظاہر "السلام علیکم" کو چھوڑ کے فعل کا صیغہ استعمال کرنا لغو سا معلوم ہوتا ہے مگر یہاں کی سوسائٹی میں یہ سمجھا گیا کہ بجائے سلام کرنے کے "میں سلام کر رہا ہوں" کہنے میں زیادہ اظہار تعظیم ہوتا ہے۔ کورنش ترکی زبان کا لفظ ہے جو ترکی فاتحان ہند کے ساتھ یہاں آیا۔ اس کے معنی سلام کے لیے جھکنے کے ہیں۔ لہٰذا اس میں بھی جھک کے زمین بوس اور قدمبوس ہونے کا خیال موجود ہے۔ آداب فقط ادب کی جمع ہے سلام کے محل پر اُسکے زبان پر لانے کا منشا یہ ہے کہ ادب و تعظیم کے جتنے طریقے ہیں اُن سب کو بجا لاتا ہوں۔ بندگی۔ یہ تمام الفاظ سلام سے زیادہ ذلیل اور مشرکانہ لفظ ہے۔ بندگی کے معنی پوجنے اور عبادت کرنے کے ہیں۔ سلام میں اس کا ... کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ میں حق عبودیت بجا لاتا ہوں۔ جو مسلمانوں کے عقائد کی رُو سے خدا کے سوا اور کسی کے مقابل نہیں کہا جا سکتا۔

بخلاف ان ہندوستانی مسلمانوں کے عرب میں جو الفاظ "السلام علیکم" کہے جاتے ہیں اُن کا لغوی ترجمہ یہ ہے کہ "تم پر سلامتی" یا صاف اُردو میں یوں کہیے کہ "تم سلامت رہو" یعنی سلام کرنا دراصل ہر ملنے والے کو سلامتی کی دعا دینا ہے۔ اسلام نے اس پر ترقی یہ کی کہ "سلام" خدا کا پیام ہے جو رسول خدا صلعم نے مسلمانوں کو پہونچایا۔ اور قیامت تک آپ کا یہ پیام ہر مسلمان دوسرے مسلمان

کو پہونچاتا رہے گا۔ السلام علیکم مین سلام پر جو الف لام لگا ہوا ہے اُس مین صاف اسی جانب اشارہ ہے کہ وہی سلام جو حضرت رسالت کا پیام ہے تم کو پہونچے۔

اسلام کی اصلی سلام کے اِن معنون اور اسکے مقصد کو سمجھ کے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ سلام قومی مساوات کا خیال دلانے اور تمام پیروان رسالتِ محمدی مین قومیت و اخوت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر افسوس مسلمانون نے اُسکو چھوڑ دیا۔ اور ہمارا فضول تبختر اب ہمین یہ خیال دلاتا ہے کہ کسی معمولی مسلمان کا ہم سے ملتے وقت السلام علیکم کہنا ہماری توہین کرنا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ شیعہ سُنّی کے اختلاف نے چونکہ یہ شان پیدا کر دی ہے کہ دونون بجاے ایک قوم بننے اور ایک جماعت ثابت ہونے کے ایک دوسرے سے جدا اور ممتاز رہنا چاہتے ہین۔ عوام ہی نہین دونون فریقون کے متاخر علما و مصنفین تک نے اپنے اپنے فریق کو دوسرے کے عادات و اطوار سے نفرت کرنے کا سبق دیا ہے۔ اس رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب و عجم تک مین تو شیعہ و سُنّی دونون کا سلام "اَلسَّلام علیکم" تھا مگر ہندوستان خصوصاً لکھنؤ کے شیعون نے اَلسَّلام علیکم کو سُنّیون کے سر مار کے اپنے لیے "سلامٌ علیکم" کے الفاظ مخصوص کر لیے ہین۔ وہ زیارتِ ائمہ پڑھنے مین تو وہی پُرانے الفاظ مثلاً "السلام علیک یا ابا عبداللہ علیہ السلام" کہتے ہین مگر ملنے جلنے والون سے جب صاحب سلامت کرتے ہین تو کہتے ہین "سلامٌ علیکم"۔ اس لیے کہ "السلام علیکم" سنّیون کا سلام ہے۔

تاہم زیادہ تر یہ اگلا عربی سلام سُنّی اور شیعہ دونون مین مذہبی لوگون کے لیے مخصوص ہو گیا ہے یا مذہبی شان و وضع مین داخل ہے۔ ورنہ اُمرا کی سوسائٹی مین "آداب" و "تسلیم" کا عام رواج ہے۔ بندگی بھی اکثر لوگ کہتے ہین مگر یہ لفظ عورتون مین زیادہ مروج ہے۔

لکھنؤ مین پُرانا تہذیب اور شائستہ لوگون کا سلام یہ تھا کہ چھوٹا بڑے سے یا غریب امیر سے نہایت جُھک کے تسلیم یا آداب کہے۔ جواب مین بزرگ خُردون سے کہین "جیتے رہو" "بڑے ہو" "صاحب اقبال ہو"۔ امرا غریبون کے لیے

بغیر جھکے فقط ہاتھ اُٹھا دین یا ہاتھ اُٹھانے کے ساتھ اُنھین الفاظ تسلیم وآداب و تسلیم کا اعادہ کر دین یا بندگی کہدین۔ مگر ابرو والون کا طریقہ جواب دینے مین یہ تھا کہ راہ چلتے مین صاحب سلامت ہو تو اُسی طرح جھک کے تسلیم یا آداب کہین۔ اور اگر کسی محفل مین بیٹھے ہون تو پوری طرح اُٹھ کھڑے ہون اور جھک کے جواب دین۔

سلام کے بعد ایک دوسرے سے کہے "مزاج شریف" یا "مزاج اقدس" یا "مزاج عالی" "یا مزاج مبارک" یا "مزاج معلےٰ" اور دوسرا ہاتھ جوڑ کے کہے "دعا کرتا ہون"۔ تقریباً سارے ہندوستان مین مہذب وشایستہ لوگون کا طریقہ سلام ومزاج پُرسی یہی ہے۔ مگر لکھنؤ مین اور چند شہرون مین جہان ہندوستانی ریاست قائم ہے اور کوئی دربار موجود ہے اُن طریقون کے ادا کرنے مین زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور اس مین کمی ہونا بدتمیزی خیال کی جاتی ہے۔

مگر اب چند روز سے خصوصاً لکھنؤ مین عوام اہل حرفہ اور ادنےٰ طبقے والون مین اگلے دربار اور اُسکے آداب کے مٹ جانے سے "السلام علیکم" کہنے کا بہت رواج ہو گیا ہے۔ خدا کرتا اُمرا بھی اسکی پیروی کرتے اور ادنےٰ واعلےٰ کا امتیاز بالکل اُٹھ جاتا۔

(۴۳)

(۷) طرز کلام۔ آداب معاشرت مین ساتوین اہم چیز گفتگو اور طرز کلام ہے۔ دُنیا مین ہر شخص کی شایستگی اور ادبی قابلیت کا پہلا اندازہ اُسکے الفاظ اور اُسکے انداز گفتگو سے ہوتا ہے۔ دنیا کی ہر اقبالمند قوم سب سے پہلے اپنی زبان کی اصلاح کرتی اور اُسے ترقی دیتی ہے۔

تہذیب وشایستگی کا تقاضا یہ ہے کہ زبان پر کردہ وحش الفاظ نہ آئین۔ جو الفاظ وخیالات مخاطب کو ناگوار گذرین اُس کے سامنے زبان سے نہ نکلین اور اگر کبھی ناگوار مضامین کے ظاہر کرنے کی ضرورت پیش بھی آئے تو وہ ایسے الفاظ اور ایسے عنوان سے ادا کیے جائین کہ مخاطب کو گران نہ گذرین اور اگر گران گذرین بھی تو اُن کی گرانی مین ایک گونہ گوارائی و لطف پیدا ہو جائے

س بارۂ خاص مین اہل زبان لکھنؤ اور یہان کے شایستہ لوگون کو جو کمال حاصل ہے ہندوستان کے اور کسی شہر والون مین نہ نظر آئے گا۔ اگرچہ موجودہ تعلیم و تہذیب نے ایک حد تک یہ خوبی ہر جگہ انداز گفتگو مین پیدا کر دی ہے مگر انگریزی اثر سے معرّا کر کے دیکھیے تو بالذات یہ شایستگی و شستگی زبان اہل لکھنؤ ہی کا حصہ نظر آئے گی۔

باہر کے لوگ اس کا یہان تک لوہا مانے ہوے ہین کہ لکھنؤ والون کے سامنے گفتگو کرتے جھینپتے اور جس قدر شایستگی اُن مین ہے اُسکو بھی بھول جاتے ہین۔ اور اسکے بعد جب اپنی صحبتون مین بیٹھتے ہین تو یہ کہکے اپنی کمزوری کا الزام دُور کرتے ہین کہ "ہم سادگی سے صاف صاف باتین کرتے ہین اور ہمین لکھنؤ والون کی سی چناں چنین نہین آتی" مگر دراصل یہ عذر بدتر از گناہ ہے مین نے ایرانیون کو دیکھا کہ اُن کے سامنے ہندوستانی بات کرنا بھول جاتے ہین۔ انگلستان مین دیکھا کہ فرانسیسیون کے سامنے انگریزون کی زبان سے ایک لفظ نکلنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح عربون کی طلاقت لسانی کی کبھی یہ حالت تھی کہ اُنکے سامنے غیر ملک والون کی زبان نہ کھُل سکتی تھی۔ اور عرب لوگون کا خیال ہو گیا تھا کہ "زبان خدا نے فقط ہم کو دی ہے۔ اور ساری دُنیا ہمارے مقابل گونگی ہے" اسی خیال کا نتیجہ تھا کہ ماسوا عرب کے تمام دُنیا کے لوگون کو وہ "عجم" کہتے۔ جس کے لغوی معنی گونگے کے ہین۔ بعینہ یہی حال ہندوستان مین ہر شہر کے لوگون کے مقابل لکھنؤ والون کا ہے کہ وہ فصاحت و بذلہ سنجی مین سب کو دبا کے صحبت پر چھا جاتے ہین۔ اور اپنے سامنے کسی اور کو زبان نہین کھولنے دیتے۔

شایستگی زبان مین سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ مخاطب کو کن ضمائر سے یاد کیا جائے۔ اور سب زبانون مین مخاطب کے لیے دو ضمیرین ہین۔ ایک واحد کی اور ایک جمع کی۔ اور معزز مخاطب کے لیے واحد کی جگہ ہر زبان مین تعظیماً جمع کی ضمیر استعمال کی جاتی ہے۔ فارسی مین واحد مخاطب کی ضمیر "تُو" ہے اور جمع کی "شما" عربی مین واحد کی "ک" اور "اَنت" اور جمع کی "کُم" اور "انتم"۔ انگریزی

ہین "یو" کے لفظ سے معزز شخص مخاطب کیا جاتا ہے۔ بخلاف ان سب زبانون کے اُردو مین مخاطب کے لیے واحد کی تو ایک ہی ضمیر "تو" ہے مگر جمع کی دو ضمیرین ہین "تم" اور "آپ"۔ اور ان تینون ضمیرون کے لیے مخاطب کا درجہ اور مرتبہ مقرر ہے۔ ایک جہت ادنیٰ شخص کو "تو" کہین گے۔ اوسط درجے کے لوگون مین جو ذرا امتیاز رکھتا ہو اُسے اور اپنے خُردون کو "تُم" کہین گے۔ اور جو ہمرتبہ معزز و تعلیم یافتہ شریف ہو اُسے "آپ" کہین گے۔ اگرچہ معزز درجے کے لوگ کبھی بے تکلفی مین اپنے اقران و امثال اور اپنے ہم سِنون کو بھی "تُم" کہنے لگتے ہین مگر جن لوگون سے بے تکلفی نہ ہو اُن کو تم کہنا اُردو مین خصوصاً اہل لکھنؤ مین اخلاقی و ادبی جُرم ہے ؎

اُردو زبان مین اور خاص لکھنؤ والون مین مخاطب کے اتنے ہی درجے نہین بلکہ ان سے بھی بڑھ کے بہت سے الفاظ ہین جن کا شرفا و معززین کے مقابلہ مین استعمال کرنا لازمی ہے۔ جناب۔ جناب والا۔ جناب عالی۔ حضرت۔ حضرت والا۔ حضور۔ حضور والا۔ حضور عالی۔ قبلہ۔ قبلۂ و کعبہ۔ سرکار۔ اور اسی قسم کے چند اور الفاظ اُردو مین معزز مخاطب کی نسبت حسب درجہ استعمال کیے جاتے ہین۔ جو لکھنؤ والون کی زبان پر چڑھے ہوے ہین اور اُن کا صحیح استعمال جس قدر اہل لکھنؤ جانتے ہین اور کسی دوسرے شہر کے لوگ نہین جانتے۔

ہمارا دعوےٰ ہے کہ اتنے تعظیمی الفاظ خطاب دُنیا کی کسی زبان مین نہین ہین۔ ہندوستان مین وہ زمانہ گذر گیا جب اُردو یہان کی تمام زبانون کی ادب آموز تھی۔ اور اب ادب اُردو کی شاگردی سے آزاد ہو کے سب زبانین کوس لمن الملکی بجا رہی ہین۔ بنگالی۔ پنجابی۔ گجراتی۔ سندھی۔ مرہٹی۔ کنڑی۔ تلنگی وغیرہ سب کو اپنی ادبی ترقی و فصاحت کا دعویٰ ہے۔ مگر ہم مذکورہ ہندوستانی زبانون کو اور اُنکے ساتھ ساری دنیا کی مشہور زبانون فارسی۔ عربی۔ انگریزی اور فرانسیسی کو بھی چیلنج دیتے ہین کہ اگر ان کو اُردو سے زیادہ ادبی وسعت و فصاحت کا دعوےٰ ہے تو مخاطب کے لیے اپنی لغتون مین

اتنے لفظ نکال دین جتنے کہ اُردو مین موجود ہین - سچ یہ ہے کہ باوجود اپنی کم عمری اور اپنے محدود رقبۂ تصرف کے اُردو چند ہی روز مین شائستگی - لطافت - اور مناسبات علم مجلس کے اعتبار سے اس درجۂ کمال کو پہونچ گئی تھی جو دنیا کی کسی زبان کو نہین حاصل ہے - اصل حقیقت یہ ہے کہ اُردو کسی ملک کسی صوبے کسی گروہ کسی مذہب کی زبان نہ تھی - بلکہ یہ وہ زبان تھی جو شاہی دربار سے شروع ہو کے ہندوستان کے ہر شہر مین مہذب و شائستہ لوگون - نکھری صحبت والون - صاحبان علم وفضل - شاعرون اور ادب و اخلاق کے شیداؤن کی زبانون پر جاری ہوگئی تھی - لہذا اس کی بنیاد ہی تہذیب و شائستگی کے ہاتھون سے پڑی - اور آخر تک نکھرے مذاق والون اور شیدایان سخن کے ساتھ مخصوص رہی - اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو بولنے والون کی مجارٹی کسی صوبے مین نہین - مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ہر جگہ کے مہذب و شائستہ لوگ اُس کے بولنے والے ہین - یہ پیدا اسی لیے ہوئی تھی کہ ہندوستان مین ایک اعلیٰ درجے کی اور ساری دنیا سے زیادہ شائستہ سوسائٹی پیدا کردے - مگر بدنصیبی سے انگریزی دَور مین جب مغربی معاشرت و ادب نے جگہ پکڑی تو ہندوستانیون کے باہمی اور قدیم فطری تعصبات نے یہ رنگ دکھایا کہ مسلمان اس پر ناز کرنے لگے کہ ہماری زبان ہے اور ہندوؤن نے یہ خیال کرکے کہ اس زبان مین ہم مسلمانون کا مقابلہ نہ کرسکین گے اُسے مسلمانون ہی کے سر مارا اور دامن جھٹک کے علٰحدہ ہوگئے - اس سے اُردو کو نقصان پہونچا - اور روز بروز زیادہ نقصان پہونچے گا - مگر باوجود اسکے اس سے انکار نہین کیا جا سکتا کہ جو رسیلا پن - جو ادبی خوبیان اس مین ہین نہ نئی پیدا کی ہوئی ہندی زبان مین ہین اور نہ ہندوستان کی کسی اور زبان مین -

انگریز ہون یا عرب - افغانی ہون یا ایرانی جب اُردو بولتے ہین تو مخاطب کے لیے سوا "تم" کے اور کوئی لفظ اُن کے خیال مین نہین آتا - اس لیے کہ اس قسم کا اور کوئی لفظ جو "تم" سے زیادہ شائستہ و ترقی یافتہ ہو اُن کی زبان مین موجود ہی نہین ہے -

انگریزی مین خطاب کے اور الفاظ ہین مثلاً یور آنر - یور اکسلنسی - یور ہائنس

یورمجسٹی وغیرہ - مگر وہ اعلیٰ درجے کے امرا اور بادشاہوں کے لیے خاص ہین۔ اُن کے سوا اور کسی کی نسبت نہین استعمال کیے جا سکتے - اس قسم کے مختص الاشخاص الفاظ اُردو مین بھی ہین - مثلاً جہان پناہ - صاحب عالم - مرشدزادہ - نواب صاحب - نواب زادہ - صاحبزادہ - یہ خاص اعلیٰ طبقے کے لوگون کے خطابات ہین - جن کے ساتھ جناب یا حضور کے الفاظ ملا کے خطاب کیا جا سکتا ہے - اور غالباً اس قسم کے مخصوص خطابات ہر زبان مین موجود ہون گے - مگر مذکورۂ بالا تعظیمی الفاظ جو اُردو زبان مین ہر معزز و شایستہ انسان کی نسبت استعمال کیے جا سکتے ہین اُردو کے سوا کسی اور زبان مین نہین نظر آتے -

مزاج پرسی کو دیکھیے - ہر زبان مین اس کے لیے معمولی الفاظ ہین مگر اُردو مین ادب و احترام کی نگہداشت کے لیے - مزاج عالی - مزاج مبارک - مزاج اقدس - مزاج مقدس - مزاج معلّی وغیرہ سے کسی معزز مخاطب کی خیریت دریافت کرتے ہین - یہ الفاظ اگرچہ اب ترقی اُردو کے ساتھ ہر جگہ اور ہر شہر مین پھیل رہے ہین مگر اُن کے استعمال مین جو اجتہادی ملکہ شرفاے لکھنؤ کو حاصل ہے اور کسی جگہ کے لوگون کو نہین نصیب ہو سکتا -

شرفاے لکھنؤ مین ایک خاص بات یہ ہے کہ "ش" "ق" درست رہیگا - اور تمام عربی حرفون کو حتی الامکان اُن کے اصلی مخرج سے ادا کرین گے - فارسی ترکیبون مین اضافت نمایان طور پر ادا کی جائے گی - علما اور ذی علم لوگون سے باتین کرین گے تو عربی و فارسی الفاظ کو زیادہ استعمال کرین گے - اور اُنکے صحیح تلفظ سے ادا کرین گے - اطبا سے گفتگو ہوگی تو عربی کے طبی مصطلحات کو کام مین لائین گے - جاہل نوکرون اور عوام سے بات کرین گے تو عربی الفاظ سے بچین گے - عورتون سے بات چیت ہوگی تو اُن کے مذاق کے محاورون اور مثلون کو گفتگو مین صرف کرین گے -

خُرد بزرگ سے - ادنیٰ اعلیٰ سے - یا عامی عالم سے گفتگو کرے گا تو ہر لفظ اور ہر فقرے مین ادب و تعظیم کا خیال رکھے گا - آواز مناسب درجے تک پست اور نیچی رہے گی - اسی طرح بزرگ خُردون سے - اعلیٰ طبقے والے ادنیٰ لوگون

سے۔ علما عوام سے بات کرین گے تو اُن کے لہجے۔ اُنکے انداز اور اُنکے الفاظ مین شفقت ومحبت کے جذبات مضمر ہون گے۔

ان باتون کا لحاظ رکھنے اور مذکورۂ بالا ادب وتعظیم کے الفاظ وضمائر استعمال کرنے سے اہل لکھنؤ کی زبان اس قدر شایستہ اور شستہ ورُفتہ ہوگئی ہے کہ یہان کے عوام اور جُہلا دوسرے شہرون کے اکثر شعرا وفصحا سے زیادہ اچھی اُردو بولتے ہین۔ اور جو شایستگی وتمیزداری اُن سے ظاہر ہو جاتی ہے کسی اور مقام کے قابل وذی علم لوگون سے بھی نہین ظاہر ہو سکتی۔ مگر افسوس لکھنؤ مٹتا جاتا ہے۔ اب یہان بیرونی لوگون کا ایسا طوفان بے تمیزی بپا ہے یہان کے شایستہ لوگ اس طرح بیکار ہو کے کونے مین بیٹھ گئے ہین۔ اور قانونی آزادی نے جہلا وعوام کو اس درجہ بیباک وبدتمیز بنا دیا ہے کہ یہ تمام ادبی خوبیان خاک مین مل رہی ہین اور چند روز بعد شاید اُن کا پتہ بھی نہ ہو۔

(۴۴)

(۸) آداب معاشرت مین آٹھوین چیز طریقۂ مذاق ہے۔ عرب کا پرانا مقولہ بلکہ مشہور حدیث نبوی ہے کہ "کلام مین ظرافت ویسی ہی ہے جیسے کھانے مین نمک"۔ سچ یہ ہے کہ شوخی وظرافت کے بغیر نہ کلام مین مزہ پیدا ہوتا ہے اور نہ صحبت مین جان پڑتی ہے۔ مگر اُسی ظرافت مین اگر بے احتیاطی ہو جائے تو وہی سخت فتنہ وفساد کا باعث ہو جاتی ہے ظرافت نے باتون باتون مین اکثر تلوار چلوادی ہے۔ اور پُرانے جانی دوستون کو گھڑی بھر مین دشمن بنا دیا ہے۔ غور سے دیکھو تو صاف نظر آجائے گا کہ ان خرابیون کا باعث ظرافت نہین بلکہ ظرافت مین بے احتیاطی کرنا یا اعتدال سے باہر ہو جانا ہوا کرتا ہے۔

جو زبان جتنی زیادہ ترقی کرتی ہے اُسی قدر اُس مین مذاق وظرافت کے پہلو بڑھتے جاتے ہین۔ کلام مین ظرافت جن طریقون سے پیدا ہو جاتی ہے اُن کا محصور کرنا بہت دشوار ہے۔ صدہا طریقے ہین جن سے ایک فصیح البیان شخص اجتہادی طور پر فائدہ اُٹھا لیا کرتا ہے۔ اور اُن کے متعلق تفصیلی بحث کرنے کے لیے ایک مستقل کتاب چاہیئے۔ ہمین اس موقع پر فقط اس قدر کہنا ہے کہ زیادہ تر بنا ے ظرافت ایسے

الفاظ ہوا کرتے ہین جو مختلف معنی رکھتے ہون - اور بعض معنون سے کسی پر تعریض ہوتی ہو - اور کبھی ظرافت مین ایسے الفاظ سے بھی کام نہین لیا جاتا بلکہ کسی انسان یا چیز کو کسی ایسی شے سے تشبیہ دی جاتی ہے جو باوجود غیر متناسب ہونے کے مشابہ ہو - پھر اُس تشبیہ کو ایسے عنوان اور پہلو سے ادا کرنا کہ اُس مین بعوض تشبیہ کے استعارے کی شان پیدا ہو جائے - علیٰ ہذا القیاس کبھی اپنے آپ کو یا کسی اور کو اس قدر بڑھانا یا اتنا گھٹانا کہ اصلی درجے سے بہت دُور ہو جائے - ان سب باتون کے لیے سلیقے کی ضرورت ہے - اچھا سلیقہ رکھنے والا سخت سے سخت تعریض کر جاتا ہے اور ناگوار سے ناگوار تشبیہ دے دیتا ہے مگر کسی کا دل میلا نہین ہوتا - یا کسی کو اظہارِ ناگواری کی گنجائش نہین ملتی - بخلاف اسکے اگر کسی بدسلیقہ شخص نے یہ کام کرنا چاہا تو لوگ بگڑ کھڑے ہوتے ہین اور عداوت پر آمادہ ہو جاتے ہین - اس کا جیسا اچھا سلیقہ لکھنؤ کے عوام الناس کو ہے اور جگہ کے خاص لوگون مین بھی نہین نظر آتا -

ایک بنگالی عالم ڈاکٹر اگھورناتھ نے جو بڑے عالم و فاضل - فلسفے مین یکتاے روزگار - لٹریچر کے ڈاکٹر اور اُردو کے اچھے ماہر تھے زبان اُردو پر اعتراض کرنے کے عنوان سے مجھ سے کہا "صاحب یہ کون سی زبان کی خوبی ہے کہ ایک دفعہ مین نے ایک صحبت مین کہا - ہم آج کل دودھ پیا کرتے ہین - اس پر سب لوگ بیساختہ ہنس پڑے" - مین نے کہا اُردو کا یہی اعلیٰ درجے کا حُسن ہے - آپ چونکہ اس زبان مین ناقص ہین اس لیے آپ کو بجاے اپنے عیب کے یہ زبان کا عیب نظر آیا - ہر زبان مین ذو معنی لفظ ہوا کرتے ہین - اور زباندانون کا کام یہ ہے کہ تمام ذم کے پہلوون کو بچا کے لفظون کو استعمال کیا کرین - انگریزی مین لفظ "کنسیو" کے معنے خیال کرنے کے بھی ہین اور حاملہ ہونے کے بھی - ایک مشہور لاٹ صاحب نے پارلیمنٹ مین تین بار کہا "آئی کنسیو" اور آگے سوچنے لگے - کسی نے پکار کے کہدیا جناب نے تین بار آئی کنسیو کہا اور ہوا کچھ نہین - یعنی تین بار حمل رہا اور پیدا کچھ نہ ہوا - اسپر سب نے قہقہہ لگایا اور وہ لاٹ صاحب جھینپ گئے - اسی طرح اُردو مین ہزارہا الفاظ ہین جن مین مختلف پہلو نکلتے ہین - بولنے والا اُنکے استعمال کا صحیح سلیقہ نہ رکھتا

ہوگا تو بات بات پر ہنسا جائے گا۔

یہی مذکورۂ بالا "دودھ پینے" کا جملہ ہے۔ ہندوستان میں "دودھ پینا" شیرخوار بچوں کا کام ہے۔ اور کسی عاقل بالغ کے لیے کہنا کہ "یہ دودھ پیتے ہیں" عیب ہونے کے علاوہ اِن معنوں میں مستعمل ہوتا ہے کہ یہ ابھی ناسمجھ اور ناوان ہیں۔ اس پہلو کے بچانے کے خیال سے اہل لکھنؤ یہ کبھی نہ کہیں گے کہ "میں دودھ پیتا ہوں" بلکہ اس مضمون کو یہ عیب کا پہلو بچا کے مختلف عنوانوں سے ادا کریں گے۔ کہیں گے کہ "میں آج کل دودھ کو استعمال کرتا ہوں" "آج کل میری غذا دودھ ہے" "دودھ چانول کھاتا ہوں"۔ لکھنؤ والوں کی ان احتیاطوں کو دیکھ کے آگرے کے ایک قابل وزباندان شاعر کو دھوکا ہوا کہ لکھنؤ کی زبان دودھ کھانا ہے دودھ پینا نہیں۔ لکھنؤ کے ایک صاحب سے اُن سے اس بارے میں اختلاف ہوا۔ اور حَکم کے طور پر مجھ سے دریافت کیا گیا۔ میں نے کہا "دودھ پینے کی چیز ہے۔ کوئی اُسکی نسبت کھانے کا لفظ کیسے استعمال کر سکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ذم کا پہلو بچانے کے لیے اہل لکھنؤ "دودھ پینے" کا لفظ اپنی نسبت استعمال نہ کریں گے۔

ایک اسی محاورے پر منحصر نہیں اُردو میں صدہا الفاظ میں مختلف محاوروں اور معنوں کی وجہ سے ذم کے پہلو پیدا ہو گئے ہیں۔ اور ہر اہل زبان کا کام ہے کہ اُن سے بچے۔ یا کوئی شخص کسی کی نسبت مذاقاً استعمال کر جائے تو اُس کا فرض ہے کہ سمجھے اور جواب دے۔ ورنہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ زبان سے ناواقف ہے۔

اہل لکھنؤ میں شوخی وظرافت بہت ہے۔ وہ اپنے کلام میں صدہا عنوانوں سے ظرافت پیدا کر دیا کرتے ہیں۔ اور جو اس فن میں جتنا زیادہ کمال رکھتا ہے اُتنا ہی زیادہ اہل سخن کی محفلوں میں چمکتا اور ممتاز ثابت ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اور مقامات کے لوگوں میں یہ ملکہ نہیں ہے اور کثرت سے ہے۔ اور اب اُردو زبان سارے ہندوستان میں اس طرح ترقی کر رہی ہے کہ ہر جگہ اعلیٰ درجے کے ظریف پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اور سخن دانی وسخن فہمی کا شعور بڑھ رہا ہے مگر لکھنؤ والوں میں یہ ملکہ طبیعت ثانویہ بن کے اُن کی فطرت و جبلت

بن گیا ہے۔ اور لطافتِ کلام کے ساتھ بذلہ سنجی وظرافت مین جیسا بے تکلف اور ستھرا مذاق اُن کا نظر آئیگا اَوروں کا نہین ہو سکتا۔

(۹) آداب معاشرت مین نوین چیز شادی اور غمی کی محفلین ہین۔ مسلمانون کی اگلی دولتمندی وحکومت نے اُن کی عورتون کی ارمانین بمقابل اکثر مقامات کے یہان بہت بڑھادی ہین۔ ولادت سے لے کے شادی تک لڑکے کی ہر خوشی وکامیابی ایک تقریب بن جاتی ہے۔ پیدایش کے بعد ہی چھٹی چلہ اور درمیان کے نہان۔ عقیقہ۔ کھیر چٹائی۔ دودھ بڑھائی۔ بسم اللہ۔ ختنہ۔ اور سب سے بڑھ کے عقدِ نکاح۔ یہ سب بجائے خود شادی کی تقریبین ہین۔ اکثر بچّون کی سالگرہ ہوا کرتی ہے۔ مذکورہ تقریبون کے علاوہ غسل صحت یا کسی خاص منت کے پورے ہونے پر بھی خوشی کی غیر معمولی تقریبین ہو جاتی ہین۔

ان سب تقریبون مین قرابت والی بیویان اور پاس پڑوس کی بہت سی شناسا عورتین جمع ہو جاتی ہین۔ زنانی محفلین مرتب ہوتی ہین جن مین تختون کے چوکون پر اور زیادہ مہمان ہوے تو زمین پر دری چاندنی کا اُجلا فرش بچھتا ہے۔ دولتمند گھرون مین چاندنی پر تین طرف یا فقط صدر مین پُرتکلف قیمتی قالین بچھتے ہین۔ کنول اور مردنگین روشن ہوتی ہین۔ اور ڈومنیون کا طائفہ سامنے بیٹھ کے مجرا کرتا ہے۔ ناچنے والی ڈومنی گھونگھرو باندھ کے ناچتی اور بھاؤ بتاتی ہے۔ مجرے کے درمیان مین وقتاً فوقتاً ڈومنیان ہنسانے والی نقلین کرتی ہین۔ بہرحال مسرت کے ولولے اور خوشی کے چہچہے ہوتے ہین۔ اور ڈومنیان اگرچہ مجرے مین اکثر بے اعتدالیان کرنے لگتی ہین اور صحبت مین بیحیائی و بے شرمی کو بڑھادیتی ہین مگر نشست برخاست کے سلیقے۔ بیویون کے باہمی ربط وضبط۔ اور اُسکے ساتھ حفظ مراتب مین کوئی فرق نہین آنے پاتا۔ ہر تقریب کے متعلق صدہا رسمین ہین جن کا انجام پانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اُن رسمون کی محافظ اور برقرار رکھنے والی بڑی بوڑھی عورتین اور اُنکے ساتھ ڈومنیان ہوا کرتی ہین۔ جن کو اُن رسمون کے بہانے بہت کچھ مل جاتا ہے۔

اکثر تقریبون مین رت جگا ضرور ہوا کرتا ہے۔ اور یہی ایک چیز ہے جو ہندوستانی

عورتوں کے اعتقاد میں خالصۃً لوجہ اللہ ہے۔ اور جس میں ڈومنیاں "اللہ میاں کی سلامتی" کا نغمہ گاتی ہیں۔ شب زندہ داری ہوتی ہے۔ مگر عبادت کے لیے نہیں بلکہ گانے بجانے رات بھر دھماچوکڑی مچانے اور صبح ہوتے مسجد میں جا کے اللہ میاں کا طاق بھرنے کے لیے۔ جن کی نذر کے لیے گلگلے اور خدا رحم مخصوص چیزیں ہیں۔ ان تقریبوں میں یہی کارروائی دیہات میں بھی ہوا کرتی ہے مگر وہاں بدتمیزی و بدسلیقگی ہوتی ہے تو شہر والیوں میں نفاست۔ صفائی۔ خوش ترتیبی۔ اور شائستگی۔

(۴۵)

جن شادی کی تقریبوں کا ہم ذکر کر چکے ہیں اور اُن کی زنانی محفلوں کی ایک عام تصویر گذشتہ موقع پر دکھا دی ہے اُن کی مفصل تشریح یہ ہے کہ چھٹی اُس تقریب کا نام ہے جبکہ زچگی کے بعد ماں اور بچے کو پہلی دفعہ نہلایا جاتا ہے۔ زچہ کو تیز گرم پانی سے نہلانا ایک طبی علاج ہے۔ مگر یہ غسلِ ولادت چونکہ ایک خوشی کے موقع پر ہوتا ہے۔ اس لیے اُس کو نہایت اہمیت دی جاتی ہے۔ اور چونکہ عموماً زچگی کے چھٹے روز یہ پہلا نہان ہوتا ہے اس لیے اس کا نام ہی چھٹی پڑ گیا۔ اور اس میں زچہ بڑے اہتمام سے نہلائی جاتی ہے۔ پھر بچہ نہلایا جاتا ہے۔ اور اُنکے بعد تمام عورتیں جو مہمان ہوتی ہیں یکے بعد دیگرے سب نہاتی ہیں۔ زچہ اور بچے کے لیے نئے بھاری جوڑے حسب حیثیت تیار کیے جاتے ہیں۔ اور ساتھ ہی سب عورتیں کپڑے بدلتی ہیں۔ اس نہان میں جو طرح طرح کی رسمیں برتی جاتی ہیں وہ بے حد و بے شمار ہیں۔ اور غالباً ہر شہر و قریے بلکہ ہر خاندان میں کلیۃً یکساں اور جزءً مختلف اور نئی ہیں۔

دولھن کے میکے یا دیگر اعزا کی طرف سے اس موقع پر زچہ اور بچے کے جوڑے طوق۔ ہنسلی اور کڑے۔ ننھے بچے کے قابل کھلونے جھنجھنے۔ چھوٹے۔ ان کے ساتھ مرغیاں اور خدا جانے کیا کیا چیزیں بڑی دھوم دھام جلوس اور باجوں کے ساتھ آتی ہیں۔ زنانے میں رقص و سرود کی محفلیں گرم ہوتی ہیں۔ اور اتنی استطاعت نہ ہو تو خود گھر والی عورتیں ڈھول سامنے رکھ کے گا بجا لیتی ہیں۔

یہی شان ہر بچے کے دو نہانوں یعنی بیسویں اور چلّے کے نہانوں کی ہوتی ہے۔ اگر خدا نے اطمینان دیا ہے تو دونوں موقعوں پر محفل عیش و نشاط گرم ہوتی ہے۔ ورنہ فقط چلّے کے نہان میں زیادہ دھوم دھام ہوتی ہے۔ اور بیسویں کے نہان کی تقریب معمولی ہوتی ہے۔

عقیقہ مسلمانوں کی خالص مذہبی رسم ہے جس کا آغاز بنی اسرائیل کے زمانے سے آل ابراہیمؑ میں چلا آتا ہے۔ یہود پیدائش کے آٹھویں دن بچے کو مسجد اقصیٰ میں لے جاکے اُس کا سر منڈاتے اور قربانی کرتے تھے۔ اور اُن کا مقتدا خاص طریقوں سے اُس کے لیے برکت کی دعا کیا کرتا تھا۔ یہی طریقہ مسلمانوں میں بھی رسم ابراہیمیؑ اور سنت محمدیؐ کی حیثیت سے آج تک جاری چلا آتا ہے۔ اگرچہ اب ولادت کے بعد آٹھویں دن عقیقے کی قید اُٹھ گئی ہے مگر اکثر بچے کی عمر کے پہلے ہی سال میں ہو جایا کرتا ہے۔ اس میں بچے کو نہلا کے نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں۔ اور اسکے بعد اعزا و احباب کے مجمع میں نائی اُس کا سر مونڈتا ہے۔ اور جیسے ہی وہ سر میں اُسترا لگاتا ہے بچہ اگر لڑکا ہے تو دو اور لڑکی ہے تو ایک بکرا قربانی کیا جاتا ہے۔ مُنڈ جانے کے بعد سر میں صندل لگایا جاتا ہے۔ اعزا و اقارب حسب حیثیت بچے کو کچھ رونمائی دیتے ہیں۔ قربانی کا گوشت غربا اور اعزا میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اور گھر میں خوشی کا جلسہ ہوتا ہے۔ اور اُسی قسم کی محفل مرتب ہو جاتی ہے جیسی کہ اور تقریبوں میں ہوتی ہے۔

کھیر چٹائی۔ اس تقریب سے بچے کو دودھ کے علاوہ اور غذاؤں کے دینے کا آغاز ہوتا ہے جو اکثر اُس وقت ہوا کرتی ہے جب بچہ چار پانچ مہینے کا ہو چکتا ہے۔ اکثر گھروں میں غذا کا آغاز کھیر سے کیا جاتا ہے۔ جو خاص اہتمام سے پکائی جاتی ہے اور خاص طور پر قرابت دار خاتونوں کی موجودگی میں بچے کو چٹائی جاتی ہے۔ جبکہ وہ نئے کپڑے پہنے ہوتا ہے۔ اور سب بیویاں ترقی عمر کی دعاؤں کے ساتھ اُسکے ہاتھ میں روپئے دیتی ہیں۔ اور وہی محفل طرب قائم ہو جاتی ہے جو ہر تقریب میں نظر آتی ہے۔

دودھ بڑھائی۔ یہ تقریب اُس موقع پر ہوتی ہے جب بچے کا دودھ چھڑایا جاتا

ہے - اس مین عموماً کھجورین پکائی جاتی ہین تا کہ بچہ اگر دودھ کے لیے ضد کرے
تو بہلانے کے طور پر اُس کے ہاتھ مین دیدی جایا کرین - مگر عموماً رواج ہے
کہ اتنی مقدار مین پکائی جاتی ہین کہ جن جن گھرون سے حصہ داری ہے اُن مین
تقسیم بھی ہو سکین - دودھ کے چھڑانے کا عام طریقہ یہ ہے کہ مان یا فرضعہ
کی چھاتیون مین پانی مین گھول کے ایلوا یا اور کوئی کڑوی چیز لگا دی جاتی ہے
جس کی کڑواہٹ سے گھبرا کے بچہ دودھ چھوڑ دیتا ہے - اور جب پینے کے لیے
ضد کرتا اور بہلانے نہین بہلتا تو پھر یہی کارروائی کی جاتی ہے - اور دو ایک
دفعہ مین اُسے دودھ سے نفرت ہو جاتی ہے - دودھ بڑھائی کا زمانہ علی العموم
اُس وقت ہوتا ہے جب بچہ دو سال کا ہو جائے - حنفیون مین مدت رضاعت
اڑھائی برس ہین - یعنی اڑھائی برس کے بعد دودھ چھڑانا لازمی ہے لیکن
رواج اس سے کم ہی زمانے کا ہے - یہ اور بات ہے کہ بعض عورتین تین تین
چار چار سال دودھ پلاتی رہتی ہین - مگر یہ بات عموماً نفرت کی نظر سے دیکھی جاتی
ہے - اس لیے کہ شرع کے خلاف ہے - اس تقریب مین بھی جن گھرون کو خدا نے
استطاعت دی ہے اُن مین بہت اچھی چہل پہل ہو جاتی ہے - اور رقص و سرود
کی محفل گرم ہوتی ہے -

بسم اللہ - یہ تقریب اُس دن ہوتی ہے جس روز لڑکے کو پہلے پہل پڑھنے کے
لیے بٹھاتے ہین - اور اُس کا زمانہ انڈر دسے رسوم مروجہ وہ خیال کیا گیا ہے
جب بچہ چار سال چار مہینے اور چار دن کا ہو جائے - اور اس چار کے عدد نے
اس تقریب مین اس قدر خصوصیت پیدا کر لی ہے کہ چار سال چار مہینے چار دن
کے بعد چار گھنٹے اور چار منٹ کا بھی لحاظ کیا جاتا ہے - وقت مقررہ پہ کوئی محترم
مولوی صاحب یا کوئی بزرگ خاندان لڑکے کو جو نہلا دھلا کے اور نئے کپڑے
پہنا کے دولھا بنا دیا جاتا ہے - پڑھانے کے لیے لے کے بیٹھتے ہین - الف بے کی
کتاب اُس کے سامنے رکھتے ہین - اور بسم اللہ کہلا کے عربی کے دعائیہ الفاظ
"رب یسر ولا تعسر وتمم بالخیر" کہلاتے ہین - جن کے معنی یہ ہین کہ "خدا وندا آسان کر
اور دشوار نہ کر - اور خیریت سے ختم کر" پھر الف بے کہلا کے مٹھائی تقسیم ہوتی ہے

عزیز و قریب لڑکے کو حسب توفیق دیتے ہین - اور اُس دن سے اُس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے -

ختنہ - یہ بھی سنتِ ابراہیمی اور آلِ ابراہیمؑ کی پرانی اور ضروری رسم ہے - اور چونکہ ہندوستان مین صرف مسلمانون کے ساتھ مخصوص ہے اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس کارروائی کے بعد سے لڑکا مسلمان ہو جاتا ہے اس لیے اس رسم کا عام نام ہی "مسلمانی" پڑ گیا ہے - اس مین بچے کے عضوِ مخصوص کے مُنہ پر کی کھال کاٹ لی جاتی ہے - جس کا کاٹنا طبی اور ڈاکٹری اصول سے بھی بعض امراض و شکایات سے بچنے کے لیے نہایت مفید ہے - یہ ایک قسم کا اپریشن ہے جس کو ہمارے قدیم سرجن (جرّاح) جو عموماً نائی ہوتے ہین نہایت خوبی اور غیر معمولی پھرتی سے انجام دیتے ہین - اُنکو اچھا معاوضہ اور انعام دیا جاتا ہے - اور اس رسم کے انجام دیتے وقت مردانے مین اکثر اعزا و احباب بُلا کے بٹھا لیے جاتے ہین اور زنانے مین مہان بیویون کا مجمع ہوتا ہے - ختنہ ہوتے ہی مٹھائی تقسیم ہوتی ہے - جن کو استطاعت ہوتی ہے دعوت کرتے ہین - اور پھر اُس روز خوشی کی تقریب ہوتی ہے - جب زخم اچھا ہونے کے بعد لڑکا غسلِ صحت کرے - اکثر خاندانون اور متمول گھرانون مین اس روز لڑکا دولھا بنا کے گھوڑے پر چڑھایا جاتا ہے - اور برات بڑے جلوس اور دھوم دھام کے ساتھ کسی درگاہ مین جاتی ہے جہان چادر اور مٹھائی چڑھا کے لڑکا اُسی شان سے گھر واپس آتا ہے - جہان خوشی کے چہچہے اور عیش و شادمانی کے جلسے نظر آتے ہین اس رسم کے ادا ہونے کا زمانہ مختلف ہے - بعض لوگ چھٹی یا چلّے ہی مین بچے کا ختنہ کرا دیتے ہین - مگر عام رواج اُس وقت ہے جب لڑکا چھ سات برس کا ہو جائے -

ایک اور تقریب روزہ کشائی کی بھی ہے - یہ اُس وقت ہوتی ہے جب لڑکا یا لڑکی نو دس برس کی عمر کو پہونچ جائے - اور اُسے پہلے پہل روزہ رکھوایا جائے - اس مین علی العموم بہت سے روزہ دارون کی دعوت کی جاتی ہے جن کے لیے کثرت سے افطاریان تیار کی جاتی ہین - اور لڑکا اُن کے ساتھ بیٹھ کے افطار

کرتا ہے - اور لڑکی ہے تو زنانے مین جہان روزہ دار بیویون کے ساتھ روزہ کھولتی ہے - اس مین گانا بجانا کم ہوتا ہے - مگر شوقین اور رنگین مزاج لوگون کے لیے یہ بہانہ بھی محفل رقص وسرود گرم کرنے کے واسطے کافی ہو جاتا ہے -

اسی قسم کی کارروائیان غسل صحت کی تقریبون اور منت مراد پوری ہونے کے موقعون پر ہوا کرتی ہین - اور سوا اُن خاص باتون کے جو اُس تقریب سے تعلق رکھتی ہون باقی سب باتین اُن مین بھی وہی ہوتی ہین جو اور تقریبون مین بیان کی گئین -

سب سے بڑی اور اہم تقریب شادی یا عقد نکاح ہے - یہ وہ ضروری تقریب ہے جس کی بے اعتدالیون کی بدولت سیکڑون خاندان تباہ وبرباد ہوتے چلے جاتے ہین - اور وجہ یہ کہ خوشی کے جوش اور شاہد آرزو سے ہمکنار ہونے کی محویت مین کسی کو نہ اپنی حالت و استطاعت کا خیال رہتا ہے نہ اپنے انجام و مآل کار کا - نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرض لے کے - جائداد بیچ کے - دوستون اور عزیزون سے مانگ کے - یا جس طرح کوئی رقم مل سکے فراہم کر کے ارمانین پوری کی جاتی ہین - اور شادی کے ختم ہوتے ہی یہ حالت ہوتی ہے کہ اکثر گھرون مین فاقے کی نوبت آجاتی ہے -

شادی اور نکاح چونکہ انسانی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہے اس لیے اسکو ہم ذرا زیادہ تفصیل و تشریح سے بیان کرنا چاہتے ہین - شادی کی نسبت اکثر مشاطاؤن کے ذریعے سے ٹھہرتی ہے - ہندوستان کے تمام بڑے شہرون مین خصوصاً اُن مین جہان اگلے تمدن نے ترقی کی تھی عورتون کا ایک خاص پیشہ ہے مشاطہ گری - شعرا کے کلام اور لغت مین مشاطہ اُس عورت سے مراد ہے جو عالی مرتبہ خاتونون کے کنگھی چوٹی کرتی - کپڑے اور زیور پہناتی - اور اُنھین بنا چُنا کے سنوارتی اور آراستہ کرتی ہے - مگر سوسائٹی مین مشاطہ اُن عورتون کو کہتے ہین جو شادی کے پیام لیجاتی - نسبتین ٹھہراتی اور شادیان کراتی ہین - غالباً اس پیشے کی ابتدا اُنھین عورتون سے پڑی جو حسینون کو بنایا سنوارا کرتی ہین اور آخر مین شادی ٹھہرانے والی عورتون کا نام مشاطہ پڑ گیا - یہ بڑی چالاک

اور مکار عورتین ہوا کرتی ہین - ہر لڑکے کا پیام جب کسی گھر مین لیجاتی ہین تو اسکی دولتمندی - تعلیم - سعادتمندی - خوش اخلاقی اور خوبصورتی کی اس قدر تعریف کرتی ہین کہ لڑکی والون کی نظر مین اُسے مثنوی میر حسن کا شاہزادہ بے نظیر ثابت کیے بغیر دم نہین لیتی ہین - اسی طرح جب کسی لڑکی کی بات لڑکے والون کے یہان لے جاتی ہین تو اُسکے حسن و جمال - ناز و انداز - اور خوبی و رعنائی کے بیان مین ایسے نقشے باندھ دیتی ہین کہ معلوم ہوتا ہے جس لڑکی کا ذکر کر رہی ہین وہ انسان نہین کوہ قاف کی پری یا شاہزادی بدر منیر ہے -

مشاطہ کی پیام رسانیون کے بعد اگرچہ تحقیق و جستجو مرد ہی کرتے ہین مگر نسبت ٹھہرنے مین زیادہ دخل دونون گھرون کی عورتون ہی کو ہوا کرتا ہے جو اپنا اطمینان کر کے مردون کی رضامندی حاصل کرتی ہین - اور نسبت ٹھہر جاتی ہے - دونون خاندانون مین بچون کے پیدا ہوتے ہی اسان بھری ماؤن نسبت ٹھہرا لیا کرتی ہین اُن کے لیے مشاطہ کی ضرورت نہین پیش آتی - بلکہ دولہا کو بے عقل و عشق کھٹکے کی منگنی دلھن مل جاتی ہے - اور شادی سے پیشتر کی رسمین جن کو نسبت ٹھہرنے سے تعلق ہے اُن کی نوبت نہین آتی - گویا پیدا ہوتے ہی منگنی ہو جاتی ہے -

نئے گھرون مین جب پیام جاتا ہے تو اکثر لڑکا اپنے چند عزیزون اور مخصوص دوستون کے ساتھ "بردِکھوا" کے نام سے دلھن والون کے وہان بلایا اور ایسی جگہ بٹھایا جاتا ہے جہان سے عورتین بھی اُسے تاک جھانک کے دیکھ سکین گھر والے مرد جمع ہو کے اُس سے ملتے اور حسب حیثیت خاطر مدارات کرتے ہین - اسی طرح لڑکے کی ماں بہنین ایک مقررہ تاریخ پر دلھن کے گھر مین جاتی اور مٹھائی کھلانے یا کسی اور بہانے سے دلھن کا چہرہ دیکھتی ہین جو عام طور پر اُن سے چھپائی اور پردے مین رکھی جاتی ہے - مگر بعض شریف گھرون مین دولھا نہین بلایا جاتا بلکہ خاندان کے مرد کسی نہ کسی عنوان سے لڑکے کی لاعلمی مین اُسے دیکھتے اور اُس کا حال دریافت کر لیتے ہین - اور یونہین لڑکی کی حالت کا بھی پتہ لگا لیا جاتا ہے -

ان طریقون سے جب لڑکے والے لڑکی کو اور لڑکی والے لڑکے کو پسند کر لیتے ہین جس مین صورت شکل - حالت وحیثیت کے علاوہ شرافت خاندان کو بھی بہت کچھ دخل ہوتا ہے تو منگنی کی رسم عمل مین آتی ہے - اُس مین دولھا کی طرف سے مٹھائی جاتی ہے - پھولون کا گہنا جاتا ہے اور ایک سونے کی انگوٹھی جاتی ہے جسے بعض گھرانون مین دولھا کی عزیز عورتین خود جاکے پہناتی ہین -

منگنی کی رسم ادا ہو جانے کے بعد سمجھا جاتا ہے کہ نسبت ٹھہر گئی - اور اُس وقت سے دونون جانب معمول ہو جاتا ہے کہ جب کوئی تقریب ہو تو سمدھیانے مین خاص اہتمام سے حصے جائین - اور جو حصہ لڑکے یا لڑکی کے لیے ہوتا ہو وہ بڑا ہوتا ہے اور خصوصیت کے ساتھ مُشتّین و باوقعت بنا دیا جاتا ہے - اسی اثنا مین اگر محرم آگیا تو دونون جانب سے اہتمام اور تکلیف کے ساتھ گوٹا - الائچیان - چکنی ڈلیان - اور اعلیٰ درجے کے کارچوبی اور ریشمی جوڑے سمدھیانے مین بھیجے جاتے ہین -

برات یعنی نکاح کے دن سے چند روز پہلے دولھن مانجھے بٹھادی جاتی ہو جبکہ اُسے مانجھے کا زرد جوڑا پہنایا جاتا ہے - اُس وقت سے روز اُس کے بٹنا لگتا ہے - اور پھر خاص ضرورتون کے وہ پردے سے باہر نہین نکلتی جس دن وہ مانجھے بیٹھتی ہے اُسی روز رسم ہے کہ اُس کا جھوٹا بٹنا - اُسکی جھوٹی مہندی مصری کا کوزہ - اور بہت سی پنڈیان ایک شاندار جلوس اور باجے کے ساتھ دولھا کے گھر بھیجی جاتی ہین - جو پنڈیان خاص دولھا کے لیے ہوتی ہین وہ جداگانہ خوانون مین ممتاز و مخصوص ہوتی - اُنھین کے ساتھ دولھا کے لیے مانجھے کا زرد بھاری جوڑا - ایک رنگی ہوئی منقش چوکی - اور لوٹا - کٹورا بھی ہوتا ہے - لوٹا کٹورا چوکی پر ناڑے سے کس کے باندھ دیے جاتے ہین - اور جلوس مین یہ چیزین اس ترتیب سے ہوتی ہین کہ باجے والون اور جلوس کے بعد سب کے آگے چوکی ہوتی ہے - اُسکے بعد خوانون مین دولھا کی مخصوص چیزین ہوتی ہین جو گوٹا لگے طباقون مین رکھی ہوتی ہین - اور اُن کے بعد بہت سے خوانون مین عام قسم کی پنڈیان ہوتی ہین - دولھن کی چھوٹی بہنین اور ڈومنیان فینس اور ڈولیون پر

سوار ہو کے جاتی ہین - جو دولہا کے گھر پہونچ کر ایک پینڈی اور مصری کے سات سات سات ٹکڑے کر کے وہ سب ٹکڑے دولہا کو ڈہکا ڈہکا کے کھلاتی ہین -
اس رسم کی نسبت قیاس کیا جاتا ہے کہ خالص ہندی رسم ہے جس کو نہ عرب سے تعلق ہے نہ عجم سے - اس لیے کہ مانجھے اور اُسکے ساتھ کنگنے کی ابتدا ہندوستان کے سوا اور کسی جگہ نہین ثابت ہوتی -

مانجھے کے دس بارہ روز سے زیادہ زمانہ گذرنے کے بعد اُسی شان و شوکت اور جلوس کے ساتھ دولہا کے گھر سے دولھن کے یہان سانچق جاتی ہے - سانچق ترکی لفظ اور ترکی رسم ہے - اور معلوم ہوتا ہے کہ ترک و مغل اس رسم کو اپنے ساتھ ہندوستان مین لائے - اس مین دولہا کے یہان سے دولھن کے لیے چڑھاوے کا جوڑا جاتا ہے جو عموماً بہت بھاری اور کارچوبی ہوتا ہے - اسکے ساتھ دولھن کے لیے سنہری مقیش کا سہرا - چاندی کا چھلا - سونے کی انگوٹھی وہ ایک اور چیزین ہوا کرتی ہین - اور وہ زیور ہوتا ہے جس کو پہنا کر وہ رخصت کی جائے گی - اور پھولون کا گہنا ہوتا ہے - جوڑے کے ساتھ شکر کے نقل شکر کے قرص - اور میوہ جاتا ہے - سانچق کے لیے خاص اہتمام سے منقش اور رنگین گھڑے تیار کرائے جاتے ہین - پھر بانس اور کاغذ کے رنگا رنگ تختون مین چار چار گھڑے لگا کے چوگھڑے بنا دیے جاتے ہین - اور دولتمندی و امارت کی شان کے مناسب ان چوگھڑون کی تعداد بڑھتی جاتی ہے - اور اکثر سو سو دو دو سو کے شمار کو پہونچ جاتے ہین - مگر اُن کے اندر چند گھنتی کے نقلون یا پاؤ آدھ سیر شکر کے سوا کچھ نہین ہوتا - اُنکے منہ گھڑون پر عموماً سوہے کا کپڑا ناڑے سے بندھا ہوتا ہے - اور جلوس مین اُن سب گھڑون کے آگے چاندی کی ایک دہی کی مٹکی رہتی ہے جس مین دہی بھرا ہوتا ہے - اور اُسکے منہ پر بھی سوہا ناڑے سے باندھ دیا جاتا ہے - اور اُسکے گلے مین مبارک فالی کے لیے دو ایک مچھلیان بھی بندھی ہوتی ہین - یہ چیزین جب دولھن کے گھر پہونچتی ہین تو اعزا و اقارب مین تقسیم ہوتی ہین -

سانچق کے دوسرے ہی روز شب کو دولھن کے گھر سے بڑے جلوس اور روشنی کے ساتھ مہندی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ غالباً یہ عربی الاصل رسم ہے۔ اس مین دراصل دولھن والون کی طرف سے دولھا کے لیے وہ جوڑا جاتا ہے جسے پہن کر وہ بیاہنے کو آئے گا۔ اس جوڑے مین علی العموم قدیم عہد مغلیہ کے درباری وضع کا خلعت۔ شملہ۔ جیغہ۔ سرپیچ اور مرصع کلغی ہوتی ہے نصیب ہوا تو اسکے ساتھ موتیون کا ہار بھی بھیجا جاتا ہے۔ مذکورہ چیزون کے علاوہ ریشمی پائجامہ اور جوتا وغیرہ معمولی چیزین بھی ہوتی ہین۔ اکثر ایک طلائی انگوٹھی بھی جاتی ہے۔ اس جوڑے کے ساتھ دولھا کے لگانے کے لیے پسی ہوئی تیار مہندی بھی بھیجی جاتی ہے۔ جس کو بہت سے طباقون مین پھیلا کے رکھتے ہین۔ اور اُس مین سبز و سرخ شمعون کو نصب کرکے روشن کردیتے ہین۔ اس طرح کے مہندی کے بہت سے طباق روشن ہوتے ہین جو مہندی کے جلوس مین ایک خاص شان اور آن بان پیدا کردیتے ہین۔ مہندی کے اُن روشن طباقون کے ساتھ سوپچاس طباقون مین ملیدہ ہوتا ہے جو خرمون کو کوٹ کے بنایا جاتا ہے۔ اور جیسی حیثیت ہوتی ہے اُسی کے مناسب کثرت سے بھیجا جاتا ہے۔ اس موقع پر جوڑے کے ساتھ دولھا کے لیے سونے کا سہرا بھی بھیجدیا جاتا ہے۔

مہندی کے دوسرے دن دولھا کی طرف سے برات جاتی ہے۔ برات جانے کا اگلا ضروری وقت پہر رات رہے یعنی تین بجے شب کا تھا۔ لیکن اب یہ وقت اکثر چھوٹتا جاتا ہے۔ اور بجائے پہر رات رہے کے پہر دن چڑھے یعنی نو دس بجے صبح کو براتین جانے لگی ہین۔ اس تاخیر کی ابتدا واجدعلی شاہ آخری بادشاہ اودھ کے زمانے سے ہوئی۔ اُن کی برات جانے مین اتفاقاً دیر ہوگئی اور دن نکل آیا تھا۔ لوگون نے آسانی اور روشنی کے سامان کی تخفیف کے خیال سے اُسی وقت کو اختیار کرنا شروع کردیا۔ چنانچہ اب عموماً ابتدائے روز مین برات جاتی ہے اور دوپہر کو عقد ہوجاتا ہے۔

برات مین حتی الامکان پورا جلوس جمع کیا جاتا ہے۔ مروجہ تین باجے

یعنی پرانا ڈھول تاشے اور جھانجھین۔ روشن چوکی۔ اور ارگن باجا۔ ضرور ہوتے ہین۔ اس سے ترقی ہوئی تو گھوڑون پر نوبت۔ نقارہ۔ جھنڈیان۔ پرچھے بردار ہاتھی۔ اونٹ۔ گھوڑے۔ اور اس سے بھی زیادہ حوصلہ ہوا تو انھین باجون کے متعدد گروہ بڑھا دیے جاتے ہین۔ دولھا وہی جوڑا پہنے جو منہدی کے ساتھ آیا تھا۔ اور سہرا باندھ کے علی العموم گھوڑے پر اور اعلی طبقے کے امرا کے یہان ہاتھی پر سوار ہو کے سارے جلوس اور باجون کے پیچھے آہستہ آہستہ زینت و وقار سے روانہ ہوتا ہے۔ دولھا کو "نوشہ" یعنی نیا بادشاہ کہتے ہین۔ اور خیال بھی یہی ہے کہ دولھا ایک دن کے لیے بادشاہ بنا دیا جاتا ہے۔ مگر غور طلب یہ امر ہے کہ جب دولھا کو بادشاہ بناتے ہین تو اُس کے سر پر شملہ کیون ہوتا ہے؟ تاج کیون نہین پہناتے؟ اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان مین مسلمان سریر آرا تاج نہین پہنتے تھے بلکہ سب کے سرون پر کلغی دار شملے ہوتے تھے۔ انگریزون نے غازی الدین حیدر کے زمانے سے شاہان اودھ کو تاج پہنا دیا۔ مگر وطنی سوسائٹی نے اُس تاج کو قبول نہین کیا۔ اور اپنے بادشاہون کی وضع وہی رکھی جو پُرانی تھی۔ اور اُسی نمونے کا بادشاہ اپنے نوشاہون کو بناتے ہین۔ دولھا کے پیچھے فینسون اور ڈولیون مین سوار دولھا کی ماں بہنین اور عزیز و قریب عورتین اور ڈومنیان ہوتی ہین۔ چلتے وقت گھر مین جو صدہا رسمین اور ٹوٹکے ہوتے ہین بہت ہین۔ مختلف ہین۔ اور لغو ہونے کی وجہ سے زیادہ قابل لحاظ بھی نہین۔

اس شان سے جب برات دولھن کے گھر پہونچتی ہے تو عموماً اُسوقت دولھن نہلائی جا چکتی ہے۔ اور اُس کے غسل کا پانی باہر لاکے دولھا کی سواری کے گھوڑے یا ہاتھی کے پانون کے نیچے ڈال دیا جاتا ہے۔ دولھن کو یہ غسل سات دن کے باسی ٹھنڈے پانی سے دیا جاتا ہے۔ جو کلس کا پانی کہلاتا ہے اور جاڑون کے موسم مین غریب دولھن کے لیے اس پانی مین نہانا قیامت سے کم نہین ہوتا۔ چوکی پر پان بچھا کے وہ نہلائی جاتی ہے۔ اور یہی پان اُس کلس یا نون والے بیڑے مین شامل ہوتے ہین جو سب سے پہلے سُسرال مین کھلایا جاتا ہے۔

اب دولہا سواری سے اُتر کے زنانے مین جاتا ہے۔ وہان رسمی نگھائی جاتی ہے۔ اور طرح طرح کی بیسیون اور رسمین عمل مین آتی ہین جو ہر گروہ اور ہر خاندان مین جدا جدا اور عجیب و غریب ہوتی ہین۔ یہ وقت علی العموم وہ ہوتا ہے جب دولھن نہا تو چکتی ہے مگر ابھی کپڑے نہین پہنائے گئے ہوتے ہین۔ وہ ایک چادر مین لپٹی ہوتی ہے۔ اور اُس کے ہاتھ پر مصری رکھ کے دولہا کو کھلائی جاتی ہے۔ جس مین سالیان۔ زندہ دل عورتین۔ اور ڈومنیان قیدین بڑھا بڑھا کے دولہا کے لیے ہر کام مشکل کر دیتی ہین۔

شادی کی یہ پہلی ہفتخوان طے کر کے دولہا باہر مردانے مین آتا ہے جہان بزم نشاط مرتب ہوتی ہے۔ اعزا و احباب پُر تکلف کپڑے پہنے قرینے سے صاف سُتھری دری چاندنی اور قالینون کے فرش پر بیٹھے ہوتے ہین۔ اور سامنے مردانہ یا زنانہ طائفہ کھڑا مجرا کرتا ہوتا ہے۔ عین محفل کے درمیان مین اور صدر مقام پر دولہا کے لیے زرنگار مسند تکیہ ہوتا ہے جس پر دولہا کو اُس کے ہم عمر لڑکے لا کے بٹھا دیتے ہین۔ اور اُسکے دونون طرف خود بیٹھ جاتے ہین۔ تاکہ دولہا اُنکے ساتھ آزادی سے باتین کر سکے۔

دولہا کے لیے لازم ہے کہ اپنی ہر وضع۔ ہر حرکت سے شرمیلاپن ظاہر کرے۔ وہ نہ تو بے تکلف باتین کر سکتا ہے۔ نہ کوئی اُس کی آواز سُن سکتا ہے۔ نہ کسی سے بے تکلفی سے ہل جُل سکتا ہے۔ مُنہ پر سہرا ہوتا ہے۔ اور پھر سونے کے سہرے پر پھولون کا سہرا باندھ کے اس قابل نہین رکھا جاتا کہ کوئی بغیر کوشش اور دیر تک کی محنت کے اُس کی صورت دیکھ سکے۔ محفل نشاط مین بیٹھنے بلکہ اکثر عقد ہو جانے کے بعد سہرا اُٹھا کے شملے مین لپیٹ دیا جاتا ہے تاکہ چہرہ کُھل جائے۔ مگر اب بھی اُسکے لیے لازم ہے کہ ایک ہاتھ سے منہ پر رومال رکھے رہے جو اظہار شرم کی ایک علامت ہے۔ اور اب چہرہ کُھلنے کے بعد بھی اس رومال کی وجہ سے اسکی صورت دیکھنے کے شائقین کو بغیر دیر تک اس فکر مین لگے رہنے کے کامیابی نہین ہو سکتی۔

دولہا کے باہر آکر تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد عقد نکاح کا انتظام ہوتا ہے

جس کے لیے یہ سب کھیڑا کیا گیا ہے۔ اگر شیعہ خاندانوں کی شادی ہے تو وہ مجتہد صاحب تشریف لاتے ہیں ایک لڑکے کے نائب و وکیل بن کے اور دوسرے لڑکی کے نائب و وکیل بن کے۔ لڑکی والے خود پردے کے پاس جا کے یا عادل شاہدوں سے تصدیق فرما کے لڑکی کی شرعی مختاری حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد دونوں دولھا کے سامنے بیٹھ کے دولھا دولھن کی جانب سے قرأت وصحت مخارج سے ایجاب و قبول کے صیغے ادا کرتے ہیں۔ اور اگر خاندان سُنّی ہے تو کوئی محترم مولوی صاحب اور اگر کوئی گا ذن ہوا تو وہاں کے مقررہ خاندانی قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھاتے ہیں۔ جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی کے عزیزوں میں سے کوئی صاحب اُسکے وکیل و مختار بن کے آتے ہیں اور وہ شاہدوں کو پیش کرتے ہیں کہ فلاں لڑکی نے مجھے اپنا وکیل اِن دونوں شاہدوں کے سامنے مقرر کیا اور مجھے اپنے عقد کا اختیار دیا۔ قاضی صاحب اُن شاہدوں پر اطمینان کر کے اور مقدار مہر کو اُن وکیل صاحب سے دریافت کر کے دولھا کو کلمۂ شہادت پڑھاتے مسلمان کے لیے جن جن چیزوں پر ایمان لانا ضروری ہے اُن کا عربی میں اقرار کراتے۔ اور اسکے بعد تین بار اُس سے یہ کہہ کے کہ "فلاں لڑکی کے ساتھ اتنے مہر پر ہم نے تمھارا عقد نکاح کر دیا۔ دولھا سے اقرار کراتے ہیں کہ میں نے قبول کیا۔ اسکے بعد ایک دعائیہ خطبہ پڑھ کے لوگوں سے کہتے ہیں "مبارک" ساتھ ہی مبارک سلامت کا غل ہوتا ہے۔ نقل اور چھوہارے جو سینیوں میں بھرے سامنے رکھے ہوتے ہیں اُنکو حاضرین میں لٹا دیتے ہیں۔

مجتہد یا مولوی صاحب کے آنے کے وقت گانا بجانا موقوف ہو جاتا ہے اور بعد عقد مولوی صاحب چلے جاتے ہیں تو پھر رقص و سرود کی محفل گرم ہو جاتی ہے۔ اور اُسکے بعد دولھا پھر اندر زنانے میں بلایا جاتا ہے۔ عورتوں کی دنیا میں رسوم اور شرائط عقد کے اصلی لوازم کے بجا لانے کا خاص یہی وقت ہے۔ زنانے میں اس موقع پر رسوم نکاح کے ضمن میں دولھا کے ساتھ ہر قسم کا تمسخر کیا جاتا ہے۔ اور اُس کے پریشان کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی جاتی ان تمام رسوم کی بجا لانے والی سالیاں اور ڈومنیاں ہوتی ہیں۔ درحقیقت نا کتخدا

نوجوانون کے لیے شادی ایک پُراسرار لاچ (فراشتن خانہ) ہے جس مین بیسیون ایسے مراحل پیش آتے ہین جو اُسکے وہم و گمان مین بھی نہین ہوتے۔ دولھن اوڑھ لپیٹ کے ایک غیر متحرک گٹھری کی طرح اُسکے سامنے لاکے رکھ دیجاتی ہے۔ ابھی تک اُسے رخصتی کا جوڑا نہین پہنایا گیا ہوتا۔ لاتے وقت کوشش کیجاتی ہے کہ پہلی آمد مین دولھن کی ایک لات دولھا کے پڑ جائے۔ پھر ٹھونے گائے جاتے ہین۔ دولھاسے بیوی کی غلامی۔ ذلیل ترین غلامی۔ اور خدا جانے کیسی کیسی خدمتین بجا لانے کا اقرار کرایا اور وعدہ لیا جاتا ہے۔ اسکے بعد آرسی مصحف کی رسم ادا ہوتی ہے۔ جس کے لیے دولھا دولھن کے درمیان رحل پہ قرآن شریف اور اس پہ آئینہ رکھا جاتا ہے۔ اور اُس آئینے مین دولھا کو دولھن کا پہلا جلوہ دکھایا جاتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ چہرہ دیکھنے سے پہلے دولھا سورۂ اخلاص پڑھ لے۔ اس جلوے مین دولھن آنکھین بند کیے رہتی ہے۔ عورتین دولھاسے آنکھین کھولنے کے لیے طرح طرح کی التجائین کراتی ہین۔ اور اسی سلسلے مین ہر قسم کی اطاعت و غلامی کا اُس سے اقرار کرالیتی ہین۔ بڑی مشکلون اور خوشامدون کے بعد دولھن آنکھین کھول کے ایک نظر دیکھتی اور پھر آنکھین بند کر لیتی ہے۔ اور اسی پہ رسوم کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب دولھا باہر رخصت کر دیا جاتا ہے کہ دولھن کو کپڑے پہنائے جائین زیور پہنایا جائے۔ بنائی سنواری اور سسرال جانے کے لیے تیار کی جائے۔ اسوقت ڈومنیان بابل یعنی رخصتی کا نغمۂ جان گداز گاتی ہین۔ اور خوشی کا گھر ماتم کدہ بنجاتا ہے۔ جب دولھن بنا چُنا کے تیار کر دی جاتی ہے اُسوقت میکے کے تمام عزیز دوست اور سب ملنے والے آتے۔ روروکے دولھن کو رخصت کرتے۔ اور جو کچھ توفیق ہو روپیہ یا زیور اُسے دیتے ہین۔

(۴۷)

اسی اثنا مین جہیز کا سامان نکالا جاتا ہے۔ اُس کی فرد لاکے دولھا والون کے سامنے پیش کر دی جاتی ہے۔ جس مین وہ تمام زیور۔ جوڑے۔ ظروف۔ پلنگ۔ اور چھپرکھٹ اور جو کچھ چیزین دی جائین درج ہوتی ہین۔ تمام چیزون

کا فہرست سے مقابلہ کر لیا جاتا ہے - اور اب دولھن رخصت ہونے کے لیے بالکل تیار ہوتی ہے - اُس کا لباس کوئی بھاری کامدار جوڑا نہیں ہوتا ہے بلکہ ایک سُوہے یعنی ٹول پری تنزیب کا کُرتا اور سادہ ریشمی پائجامہ پہنے ہوتی ہے - اور اُس میں بھی سادگی کا اس قدر لحاظ رہتا ہے کہ گوٹ تک نہیں لگائی جاتی - اور ناڑے کا ازاربند پڑا ہوتا ہے -

اُس کے سنگار اور کپڑے پہنانے کے وقت ڈومنیان "بابل" یعنی میکا چھوٹنے کا راگ گاتی رہتی ہین جو نہایت ہی پُرحسرت اور جگر گداز ہوتا ہے - ایک عجیب رنج والم کا سمان بندھ جاتا ہے - ہر شخص ملول وحزین ہوتا ہے - تمام اعزا ملنے والے اور خاندان کے دوست احباب مل مل کے اور سوز و گداز کے الفاظ کے ساتھ لڑکی کو رخصت کرتے ہین - وہ خود زار وقطار روتی ہوتی ہے - اور فنیس ڈیوڑھی مین لگا دی جاتی ہے - اُس وقت دولھا پھر اندر بلایا جاتا ہے کہ آ کے اپنی دولھن کو لے جائے - وہ آتا اور دولھن کو اپنی گود مین اُٹھا کے فنیس مین بٹھا دیتا ہے -

رخصت سے پہلے زنانے مین دولھا کو سلام کرائی دی جاتی ہے - اور تمام اعزا و اقارب - دوست احباب بقدر حیثیت دیتے ہین - اسی وقت باہر شربت پلائی ہوتی ہے - جس مین شربت کا کنٹر اور گلاس فقط رسم کے طور پہ لایا جاتا ہے پیتا کوئی نہین - مگر تمام حاضرین محفل شربت کی تھالی مین حسب حیثیت و توفیق روپیہ ڈالتے ہین - اور اس طرح اندر باہر جو کچھ روپیہ سلام کرائی اور شربت پلائی مین جمع ہوتا ہے دولھا کو دے دیا جاتا ہے -

اب برات اُسی دھوم دھام اور اُسی شان و شوکت سے دولھا کے گھر کی طرف واپس روانہ ہوتی ہے - واپسی کے اس جلوس مین جو اضافہ ہوتا ہے اُس مین سب سے پہلے تو دولھن کی فنیس ہے جو دولھا کے گھوڑے کے آگے رہتی ہے - اور نہایت ہی ممتاز ہوتی ہے - پُرتکلف جھبکا پڑا ہوتا ہے - دونون جانب کہاریان جھبکے کو پکڑے ہوے ساتھ رہتی ہین - اور گرد دولھا کے ملازمون یا مخصوص لوگون کا ہجوم رہتا ہے - اور دولھا کے بعد پھرا اور سب ساتھ والی عورتون کی فنیسین رہتی ہین -

سب سے زیادہ نمایاں چیز اس جلوس مین جہیز کا سامان ہوتا ہے - یہ سب سامان سارے جلوس اور باجے والون کے پیچھے اور دولھن کی فینس کے آگے اس ترتیب سے جاتا ہے کہ تانبے کا ایک ایک برتن ایک ایک چنگیر مین رکھا ہوتا ہے اور ایک مزدور کے ہاتھ مین ہوتا ہے - چینی اور شیشے کے ظروف کشتیون مین لگے ہوتے ہین ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔۔ اُن کے بعد صندوق وغیرہ ہوتے ہین جن مین دولھن کے جوڑے ہوتے ہین - اُنکے بعد پلنگ ہوتا ہے جس مین ریشمی توشک - لحاف تکیے - چادر - سب سامان تیار موجود ہوتا ہے - اور بچھونا ریشمی ڈوریون سے پایون مین بندھا ہوتا ہے - اور ڈوریون کے دونون سرون پر خاص وضع کے نقرۂ گپھے لٹکتے ہوتے ہین - لڑکی کو معاشرت کا تمام سامان دیا جاتا ہے - آئینہ کنگھی - سنگھار کی ضروری چیزین تیل عطر - اور اگر استطاعت ہو تو چاندی کا پاندان - خاصدان - لوٹا - کٹورا - اور بعض اور چیزین دی جاتی ہین - بہرحال یہ سب سامان باجون اور برات کے جلوس اور دولھا کے درمیان مین رہتا ہے اور سب کے پیچھے ڈولیون پر کھانے کی دیگین ہوتی ہین - یہ جوڑے کا کھانا کہلاتا ہے جس کو عموماً لڑکی والے دولھا کو دیتے ہین -

اس شان سے جب برات دولھا کے گھر پہونچتی ہے تو خوشی کے شادیانے بجتے ہین - ڈومنیان پہلے سے پہونچ کے بنڑے گانا شروع کرتی ہین - جو خاص شادی کے گیت ہین - اور اس مبارک سلامت کے زور وشور مین دولھن اُتاری جاتی ہے - بعض خاندانون مین یہان بھی اُسے دولھا ہی گود مین لے کے اُتارتا ہے اور بعض گھرانون مین دولھا کی مان بہنین آکے اُتارتی ہین - اندر اُسے لیجا کے بٹھاتے ہی دولھا سے اُسکے دامن پر نماز شکرانہ پڑھائی جاتی ہے - دولھن کے پاؤن دھلا کے پانی مکان کے چارون کونون مین ڈال دیا جاتا ہے - رُونمائی ہوتی ہے - جس مین تمام عورتین اور عزیز مرد بھی کھول کھول کے روپیہ یا زیور دیتے ہین - اور منھ کھول کھول کے اُسکی صورت دیکھتے ہین -

اس نئے گھر مین یہ پہلی رات دولھن کے لیے نہایت سخت پابندیون اور

شرمیلے پن سے بسر کرنے کی رات ہوتی ہے۔ نہ وہ کسی سے بول سکتی ہے نہ باتین کر سکتی ہے۔ نہ کسی کو آنکھ بھر کے دیکھ سکتی ہے۔ سوا میکے کی ساتھ والیون کے اور کسی سے کچھ نہین کہ سکتی۔ اور اسی مصیبت سے بچانے کے لیے صبح ہوتے ہی اُس کا بھائی یا اور کوئی رشتہ دار چوتھی لینے کو آ پہونچتا ہے۔ اور جہان تک بنتا ہے سویرے ہی سوار کرا لے جاتا ہے۔ اس مرتبہ بھی دولھن اگرچہ امتیاز اور شان سے جاتی ہے۔ مگر جلوس اور باجے کی ضرورت نہین۔ دولھا بھی دولھن کے ساتھ جاتا ہے۔ اور اُس کے ساتھ سات طرح کی ترکاریان اور سات قسم کی مٹھائیان جاتی ہین۔

دن گذر کے اُسی رات کو دولھن کے گھر مین چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ دولھن کو وہ بر کا جوڑا اُتار کے چڑھاوے کا جوڑا پہنایا جاتا ہے جو سب جوڑون سے زیادہ بھاری کامدار اور نہایت ہی پُرتکلف ہوتا ہے۔ یہ جوڑا پہنا کے اُس کا خوب بناؤ چناؤ کیا جاتا ہے۔ دولھا کی طرف سے اُسکی بہنین اور رشتہ دار عورتین بھی آجاتی ہین۔ اور اُس مجمع مین دولھا دولھن مٹھائی سے اور دولھا کی ساتھ والیان اور دولھن والیان ترکاری اور پھولون کی چھڑیون سے باہم لڑتی ہین۔ یعنی مٹھائی اور ترکاریان ایک دوسرے کے کھینچ کھینچ کے مارتی۔ اور چھڑیون کے ہاتھ رسید کرتی ہین۔ کبھی دلگی دلگی مین لڑائی تیز بھی ہو جاتی ہے۔ اور بعض عورتین خفیف سی چوٹ بھی کھا جاتی ہین۔

چوتھی کے دو چار روز بعد پھر دولھن دولھا کے گھر مین آتی ہے۔ اور اُسکے بعد علی العموم چار چالے ہوا کرتے ہین۔ چالے کا لفظ چال اور چلنے سے نکلا ہے مطلب یہ ہے کہ دولھن اپنی سسرال سے بُلائی جاتی ہے۔ مگر یہ بُلانا خود اُسکے میکے مین نہین بلکہ میکے والیون مین ہوتا ہے۔ یعنی اُس کی خالائین پھوپھیاں اور ممانیان ہمت کر کے باری باری اُسے اپنے یہان بلاتی ہین۔ جہان وہ مع دولھا کے جاتی ہے۔ اور اُس نئے جوڑے کے رکھ رکھاؤ کے لیے خاص اہتمام اور انتظام کیا جاتا ہے۔ فقط ایک رات دن دولھا دولھن وہان رہتے ہین۔ اور رخصت کرتے وقت اُنھین جوڑا۔ سلام کرائی۔ اور زیور وغیرہ بقدر ہمت و

و استطاعت دیے جاتے ہین۔

یہ تھی لکھنؤ والون کی شادی جس کی بہت سی رسمون کو چھوڑ کر اُس کا ایک اجمالی خاکہ ناظرین دلگداز کو دکھا دیا گیا۔ دیہات والون کی شادی کا طریقہ بجز عقد نکاح کے اور تمام باتون مین بدلا ہوا ہے۔ وہان بھی مانجھا ہوتا ہے مگر دولھا کے لیے مانجھے کا زرد جوڑا اسکی بہنین اور عزیز عورتین لاتی ہین۔ دولھن کے گھر سے دھوم دھام اور جلوس اور باجے کے ساتھ مانجھا نہین آتا۔ نہ دولھا کے یہان سے سانچق آتی ہے اور نہ دولھن کے گھر سے مہندی آتی ہے۔ بلکہ سانچق اور مہندی کا مقصد برات ہی کے دن ایک اور طریقے سے پورا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ برات جب دولھن کے وہان پہونچتی ہے تو اُسکے مکان سے ذرا فاصلے پر ٹھہر جاتی ہے۔ وہان سے پہلے بجاے سانچق کے بَری کے نام سے دولھن کا جوڑا اور اُسکے ساتھ اور بہت سے جوڑے اور سُہاگ کی چیزین جو ضروری سمجھی جاتی ہین۔ کچھ شکر کچھ کھیلین خوانون پر لگاکے باجے کے ساتھ دولھن کے دروازے پر بھیجی جاتی ہین۔ دولھا کے اعزا و احباب ساتھ جاتے ہین جو اُن سب چیزون کو دولھن والون کو علانیہ دکھاتے اور اُنکے سپرد کرتے شربت پینے کے بعد واپس آتے ہین۔

اُسکے تھوڑی دیر بعد اسی طریقے سے دولھن کی طرف سے بَری آتی ہے جس مین دولھا کا جوڑا ہوتا ہے۔ یہ بَری دیہاتیون مین مہندی کی قائم مقام ہے۔ اسکے بعد وہ جوڑا پہن کے جس مین جامہ۔ نیمہ۔ پگڑی۔ مقنع۔ سہرا۔ پھولون کی بدھیان اور جوتا وغیرہ ہوتا ہے روانہ ہوتا ہے۔ اب برات دولھن کے دروازے پر جاتی اور اُس مقام مین ٹھہرتی ہے جو محفل نکاح کے لیے منتخب کیا گیا ہو۔ یہان رات بھر نغمہ و سرود اور ناچ گانے کی محفل گرم رہتی ہے۔ بجز اُس وقت کے جب قاضی صاحب آ کے نکاح پڑھاتے ہین۔ نکاح کا وہی طریقہ ہے جو شہر والون مین بیان کیا گیا۔ عقد کے بعد لڑکی والے برات کا کھانا دیتے ہین۔ شہر مین بجز تھوڑے کے کھانے کے برات کو کھانا دینا لازمی نہین ہے بلکہ دولھا خود کھلا پلا کے لے جاتا ہے۔ اگر دیہات مین لڑکی

والون کا اہم ترین فرض برات کو کھلانا ہے جس مین ذرا بھی کمی رہ جائے تو اُنکے خیال مین برادری مین ناک کٹ جاتی ہے۔

یہ کھانا پورا توڑا ہوتا ہے جس مین پلاو۔ زردہ۔ قورمہ۔ خمیری روٹیان شیرمال لازم ہین۔ اور ہر ادنیٰ و اعلیٰ کو بلا استثناء و امتیاز پورا توڑا دیا جاتا ہے۔ کھانا لیتے وقت لڑکے والے نہایت بے حمیتی اور بے شرمی سے چونٹی چونٹی کے لیے کھانا مانگتے ہین۔ گھوڑون اور بیلون کے لیے دانہ چارہ ضرورت سے بہت زیادہ طلب کرتے ہین۔ اور لڑکی والون پر فرض ہے کہ زبان سے نہین نہ نکلے۔ کسی چیز کے دینے سے انکار کیا اور آبرو خاک مین مل گئی۔ اور سب کیا دھرا برباد ہوگیا۔

اسکے بعد رخصتی اور واپسی کا قریب قریب وہی طریقہ ہے جو شہر والون مین ہے۔ ہان ایک رواج یہ بھی ہے کہ دیہات مین برات کے ساتھ عورتین نہین جاتین۔ اور نہ دولھن کے ساتھ کوئی معزز خاتون آتی ہے۔ دائی اور خادمہ کی حیثیت سے دو ایک ادنیٰ درجے کی عورتین البتہ چلی آتی ہین۔ ما سوا اسکے دیہات مین دولھن پر بھی بہت زیادہ سختیان ہوتی ہین۔ اُس کا فرض ہے کہ چوتھی مین واپس آنے کی گھڑی تک سسرال مین جس طرح رکھ دی جائے رکھی رہے۔ نہ کھائے نہ پیے۔ نہ پیشاب پاخانے کو جائے۔ نہ بولے نہ چالے۔ نہ چہرے پر سے ہاتھ ہٹائے۔ اور نہ آنکھین کھولے۔ اس لیے کہ یہ سب باتین بیحیائی و بے شرمی مین داخل ہین۔ اور اس اندیشے سے کہ دولھن کو سسرال مین جاکے پاخانے پیشاب کی ضرورت نہ پیش آئے دو دو دن پہلے سے اُس کا کھانا پانی بند کر دیا جاتا ہے۔ اور زیادہ مصیبت یہ ہے کہ دیہات کی دولھن اکثر دوسرے گانوُن مین بیاہ جاتی ہے۔ اور آمد و رفت مین دو دو تین تین منزلین طے کرنا ہوتی ہین۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت مین دولھن بیچاری پر کیسی سخت مصیبتین گذرتی ہون گی۔

دیہات مین سانچق اور مہندی کے ترک ہو جانے اور برات کھلانے مین سختیان ہونے کی وجہ غالباً یہ ہے کہ زیادہ تر برات سفر کرکے ایک بستی سے دوسری بستی مین جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ ممکن نہین ہوتا کہ ایک دن ایک جلوس یہان سے جائے اور دوسرے دن دوسرا جلوس وہان سے یہان آئے۔ اور پھر تیسرے

روز برات روانہ ہو۔ علیٰ ہٰذا القیاس براتیوں کو گو کہ دولھا اکثر اپنے گھر سے کھلا کے لیجاتا ہے۔ مگر لڑکی والے کے گھر پہونچتے پہونچتے سارے براتی بھوکے بنگالی ہوتے ہیں اور کنگلوں کی سی شان دکھانے لگتے ہیں۔

(۴۸)

خوشی کی تقریبوں کو ہم بقدر ضرورت بتا چکے اب غمی کی صحبتوں کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے۔ مگر یہ سارے ہندوستان میں عام ہیں۔ جہاں تک میں نے غور کیا ان میں لکھنؤ کی کوئی خصوصیت نہیں نظر آتی۔ غمی کا باعث کسی کا مرنا ہوتا ہے۔ لہذا مرنے کے دن اعزا و احباب کو خبر کر دی جاتی ہے۔ اور جن لوگوں کو مجبوری مانع نہیں ہوتی ضرور آتے ہیں۔ عورتیں جو آتی ہیں اپنی ڈولی یا سواری کا کرایہ آپ دیتی ہیں۔ شادی کی تقریبوں میں اور عام قسم کی آمد و رفت میں لازم ہے کہ مہمان آنے والیوں کا کرایہ دیا جائے مگر غمی کا گھر اس تکلیف سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد مُردے کو نہلاتے ہیں۔ شیعوں کے یہاں معمول ہے کہ غسل کے لیے جنازہ پہلے غسل خانے میں لے جایا جاتا ہے جہاں غسّال جو نہلانے میں نہایت مشاق مگر اس کے ساتھ قسی القلب مشہور ہیں مُردے کو غسل دے کے کفن پہناتے ہیں۔ مگر سُنّیوں کے یہاں مُردہ اپنے گھر ہی میں نہلایا جاتا ہے۔ اور خود اعزا و اقارب یا دوست احباب نہلاتے ہیں۔ اکثر مرد اور عورتیں جو زیادہ مشاق ہوں بُلا لیے جاتے ہیں۔ اور اکثر جگہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی شرع دان مولوی صاحب یا اور کوئی پڑھے لکھے واقف کار بزرگ بتاتے جاتے ہیں کہ اس ترتیب سے نہلانا چاہیے۔ اور مسنون غسل میت کیا ہے۔

غسل کے بعد کفن پہنایا جاتا ہے جس میں ایک ازار ایک کفنی جو کرتے کے نام سے مشہور ہے پہنا کے اوپر سے دو چادریں لپیٹ دی جاتی ہیں۔ اور سر اور پاؤں کے پاس اور کمر میں کپڑے کی چٹیں پھاڑ کے باندھ دی جاتی ہیں تاکہ کھلنے نہ پائیں۔

اس کے بعد اگر شیعوں کا جنازہ ہے تو صندوق میں رکھ کے اُس پر کوئی دوشالہ

ڈال کے جنازے کو شامیانے کے سائے مین لے جاتے ہین - اور ساتھ ساتھ کوئی شخص قرأت و ادا اے مخارج سے سورۂ رحمان کی بعض آیتین پڑھتا جاتا ہے صندوق شامیانے کے اُٹھانے والے علی العموم شہدے ہوتے ہین - جن کا مدت دراز سے مُردے اُٹھانا پیشہ ہوگیا ہے - مگر ان لوگون کی بیہودگیون اور بدتمیزیون سے شیعون مین خیال پیدا ہوا ہے کہ جنازون کو خود اُٹھانا چاہیے - جسکے لیے متعدد کمیٹیان شہر مین قائم ہوگئی ہین - اور اُن کے پُرجوش اور دیندار ارکان تلاش مین رہتے ہین کہ کوئی مرجائے تو اُس کے جنازے کو خود اپنے اہتمام مین لے کے مذہبی آداب اور احتیاطون سے اُٹھائین -

سُنیون مین میت کو کسی ہلکی چارپائی پر لِٹا کے اور اوپر سے چادر ڈال کے لیجاتے ہین - اگر عورت کا جنازہ ہو تو چارپائی پر بانس کی کھپاچون کو قوس نما صورت مین قائم کرکے اور اُن کے سِرون کو دونون جانب چارپائی مین اٹکا کے اوپر سے چادر ڈالتے ہین - اس کو گہوارہ بنانا کہتے ہین - اور اس کی ضرورت محض پردے کے خیال سے پیدا ہوئی ہے - سُنیون مین جنازے کو خود اعزا و احباب اپنے کندھون پر اُٹھا کے آہستہ آہستہ کلمہ پڑھتے ہوے لے جاتے ہین اور نمازِ جنازہ پڑھائی جاتی ہے -

قبریان عموماً صندوقی کھودی جاتی ہے - جس مین انسان کے سینے تک ایک چوڑا حوض کھودا جاتا ہے - پھر اُسکے اندر دونون جانب کنارے چھوڑ کے ایک دوسرا پتلا حوض کھودا جاتا ہے - وہ بھی انسان کی کمر سے کم گہرا نہین رہتا - جب قبر خوب صاف کرلی جاتی ہے تو مُردے کو اُس مین نہایت احتیاط سے اُتارتے ہین تاکہ ہاتھ سے گرنے اور چوٹ کھانے نہ پائے - قبر مین عموماً سرہانا شمال کی طرف رکھا جاتا ہے - اور مُردے کا مُنہ ڈھیلون وغیرہ کی آڑ لگا کے قبلے کی طرف کردیا جاتا ہے - اسکے بعد بند کھول دیتے ہین - اور اکثر اعزا کو منہ کھول کے میت کی آخری صورت بھی دکھا دیا کرتے ہین - اس موقع پر شیعون کے وہان تلقین پڑھی جاتی ہے - جس کی صورت یہ ہے کہ کوئی ثقہ اور متقی بزرگ قبر مین اُتر کے میت کا شانہ ہلاتے جاتے ہین - اور ایک عربی عبارت پڑھتے جاتے

ہین جس مین میت کی طرف خطاب کرکے بتایا جاتا ہے کہ وہان نکیرین آکے سوال کرین تو تم یہ جوابات دینا جس کے سلسلے مین تمام عقائد دینیہ کی تعلیم کردی جاتی ہے۔ اسکے بعد اندرونی حوض پر تختے جما دیے جاتے ہین۔ اور اگر اُن مین درز یا جھری ہو تو مٹی کے ڈھیلے رکھ رکھ کے اطمینان کرلیتے ہین کہ مٹی اندر نہ جائے گی۔ قبر مین کافور اور خوشبو تو کفن ہی مین موجود ہوتی ہے بعض لوگ کیوڑے کی بوتل بھی ڈال دیتے ہین۔ اور اُسکے بعد اوپر سے مٹی ڈال کے قبر کا اوپر والا حوض بھر دیا جاتا اور قبر کی صورت بنا دی جاتی ہے۔

مٹی دینے کو لوگ بڑا اہم اور ضروری کام تصور کرتے ہین۔ اور جب قبر مین مٹی ڈالی جانے لگتی ہے تو حاضرین مین سے ہر شخص عام اس سے کہ کوئی ہو تین مرتبہ ہاتھ مین مٹی لے کے قبر مین ڈالتا ہے۔ اور قرآن کی تین آتین پڑھتا ہے جن کا ترجمہ یہ ہے کہ "ہم نے تم کو اس سے (مٹی سے) پیدا کیا۔ ہم نے تم کو پھر اُسی مین پہونچایا۔ اور ہم پھر آیندہ (روز قیامت) تم کو اس سے نکال کے کھڑا کرین گے"۔

بہر حال جب قبر بن کے تیار ہو جاتی ہے تو اُسپر وہی چادر جو جنازے پر پڑی تھی یا پھولون کی چادر ڈال دی جاتی ہے۔ اور فاتحہ پڑھ کے اور دعاے مغفرت کرکے لوگ واپس آتے ہین۔

مرنے والے کے گھر مین اُس کی وفات کے دن چولھا نہین جلتا بلکہ جنازے کے گھر سے نکلنے کے بعد کسی عزیز و قریب کے گھر سے پکا پکایا کھانا آجاتا ہے جس کو لوگ دفن سے واپس آکے کھاتے ہین۔ اور اُسی وقت تمام مہمان اُس کھانے سے پیٹ بھرتے ہین۔ تین دن تک معمولاً یہی ہوتا ہے کہ گھر مین کھانا نہین پکتا۔ یہ طریقہ اصل مین آغاز اسلام اور خود حضرت رسالت علیہ السلام سے شروع ہوا۔ جبکہ حضرت جعفر طیار کی شہادت کا حال سُن کر اور انکے گھر والون کو روتا پیٹتا دیکھکر آپ نے کھانا بھجوا دیا تھا۔ مگر لوگون نے اس شایستہ بنیاد پر جو عمارت یہان قائم کرلی ہے وہ نہایت لغو اور شرمناک ہے۔ کسی کے مرتے ہی گھر مین جتنا کھانا تیار ہو پھینکدیا جاتا ہے۔ گھڑون مٹکون کا پانی بہا دیا جاتا ہے۔ اور اس کا سبب

عورتین بچون سے یہ بیان کرتی ہین کہ فرشتۂ موت جس چھری سے جان لیتا ہے اُسکو کھانے پینے کی چیزون مین دھو ڈالتا ہے -

مرنے کے تیسرے دن اور کبھی مناسب دن دیکھ کے چوتھے روز سوم ہوتا ہے دراصل اس کا آغاز اس سے ہوا کہ یہ دن اس لیے مقرر تھا کہ لوگ آکر مراسم تعزیت ادا کرین اور پسماندون کی تسلی و تشفی کرین - مگر یہ خیال کر کے کہ ایک مجمع کثیر کا خالی بیٹھا رہنا اچھا نہین معلوم ہوتا - یہ طرز عمل اختیار کیا گیا کہ جو لوگ آئین بیٹھکر قرآن مجید کی تلاوت کرین - اور دو ایک پارے پڑھ کے اُن کا ثواب مرحوم کی روح کو بخشین - چند روز مین تعزیت کا خیال جاتا رہا - اور فقط یہ دیکھا کہ اُس دن کتنے لوگ آئے اور کتنے قرآن مرنیوالے کو بخشے گئے - ختم صحبت کے وقت پہلے مختلف لوگ قرآن کے چند رکوع اور آخر کی چھوٹی سورتین پڑھکر فاتحے کے لیے ہاتھ اُٹھاتے ہین - اس مین ایک نیا لغو طریقہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ تھوڑا گھسا ہوا صندل - ایک پیالے مین تیل - اور تھوڑے پھول لا کے حاضرین مین سے ہر ایک کے سامنے پیش کیے جاتے ہین - ہر شخص ایک پھول اُٹھا کے تیل مین الٹا ہے - اور وہ صندل و تیل اور پھول لے جا کے مرحوم کی تربت پر ڈال دیئے جاتے ہین -

اسی روز شام کو سب سے پہلے بڑی فاتحہ خوانی ہوتی ہے - اور گھر مین پہلی بار کھانا پکتا ہے - اگرچہ اب غربت نے ہمدردون کی اس قدر کمی کر دی کہ میت کے گھر کھانا بھیجنے والے بہت کم رہ گئے ہین - اور اکثر غریب گھر والون کو اس سے پہلے ہی کھانا پکانے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے - لیکن مروجہ طریقہ یہی ہے کہ تیجے یعنی سوم سے پہلے باہر ہی کے کھانے پر بسر ہو -

سوم اور چہلم کی فاتحون نے عوام مین عجب شان پیدا کر لی ہے - اصلیت تو اسی قدر ہے کہ جہان تک ہو سکے غریبون اور محتاجون کو کھانا کھلایا جائے اور اُسکا ثواب مرنے والے کو پہونچا دیا جائے - ہندوستان مین ہندوون مین مُردون کی تیرہوین اور برسی ہوتے دیکھ کے مسلمانون کا جی چاہا کہ ہم بھی اسی قسم کے کام ناموری اور دھوم دھام سے کرین - اس شوق کے تقاضے سے تیجے - دسوین

بیسوین - چہلم - اور دیسے کے نام سے غمی کی تقریبین پیدا کر دین - جن مین ہوتا وہی ایصال ثواب ہے مگر دکھانے - نام پیدا کرنے - اور برادری کو کھانا دینے کی شان سے - پھر اُس پر قیامت یہ ہوئی کہ عوام مین یہ عقیدہ پیدا ہوا کہ ان ہمارے مروجہ فاتحون مین جو کچھ دیا جاتا ہے وہ خدا کے حکم سے بجنسہ مُردے کو پہونچا دیا جاتا ہے - اس عقیدے نے فاتحون مین یہ شان پیدا کر دی کہ گویا مُردے کی دعوت کی جاتی ہے - وہ کھانے زیادہ اہتمام سے دیے جاتے ہین جو مرحوم کو مرغوب تھے - حالانکہ خیرات کا اصول یہ چاہتا ہے کہ جس غریب کو کھلایا جائے اُس کی پسند کا لحاظ رکھا جائے تاکہ اُس کے خوش کرنے سے ثواب مین ترقی ہو -

اسی قدر نہین فاتحون مین تو اب یہ ہوتا ہے کہ چار چار یا پانچ پانچ جوڑ کھانے کے نکال کے ایک پاک و صاف مقام پر ترتیب سے چُنے جاتے ہین - آبخورے مین پانی بھی لاکے رکھ دیا جاتا ہے - اس لیے کہ کھانے مین مُردے کو پانی پینے کی بھی ضرورت ہوگی - پھر اُس کے لیے کپڑون کے نئے اور حتی الامکان نفیس و قیمتی کپڑے اوڑھنا بچھونا - جانماز - نئی قلعی کیے ہوے تانبے کے برتن - لوٹا - کٹورا - تپلی وغیرہ بھی کھانے کے برابر رکھ دیے جاتے ہین - اور جب یہ سب سامان تیار ہو جاتا ہے تو کوئی مُلّا آکے فاتحہ کرتا - یعنی قرآن کی چند مخصوص آیتین اور چھوٹی سورتین پڑھ کر دعا کرتا ہے کہ خداوندا ان چیزون کا ثواب فلان شخص کو پہونچا - اس طریقے سے عوام کو اطمینان ہو جاتا ہے کہ یہ چیزین مردے کو پہونچ گئین - اور وہ سب کھانے اور چیزین کسی محتاج یا دیندار مسلمان کے گھر پہونچا دی جاتی ہین -

ان چیزون سے خود مرحوم کے متمتع ہونے کے خیال نے دلون مین یہان تک رسوخ پیدا کر لیا ہے کہ بعض ادنیٰ طبقے کی جاہل عورتین فاتحے کی چیزون کے پاس بن سنور کے خود بھی بیٹھ جاتی ہین کہ مرحوم شوہر ان کھانون اور کپڑون سے لطف اُٹھائے گا تو خود اُسکے حسن و جمال کی لذت سے کیون محروم رہ جائے -

فاتحون مین کھانا فاتحے کی ضرورت سے بہت زیادہ پکوایا جاتا ہے - جو حسب توفیق اعزا و احباب مین جن سے حصہ داری ہے تقسیم ہوتا ہے - اور تمام

گھر کے پرجون - دھوبی - نائی - حلال خور وغیرہ کو دیا جاتا ہے - جنھون نے فاتحون
کے شاندار تقریبین بن جانے کی وجہ سے اپنے حقوق پیدا کرلیے ہین۔

گوکہ ہم نے یہ سب کارروائیان فاتحۂ سوم کے ضمن مین بیان کردی ہین لیکن
انکی تعمیل زیادہ اہمیت کے ساتھ چہلم مین ہوتی ہے جو کہنے کو تو مرنے کے چالیسوین
دن مگر ازروے عمل درآمد چالیس سے دو چار روز کم زمانے مین ہوا کرتا ہے - اور
فاتحے دسوین بیسوین کے بھی گو امتیاز سے ہوتے ہین اور ہر جمعرات کا دن خاندان
کے بزرگون کے فاتحے کے لیے مقرر ہوگیا ہے - مگر علی العموم سوم اور چہلم کے فاتحے
غیر معمولی اہتمام سے ہوتے ہین - اور حضرات امامیہ کے وہان ہر غمی کے فاتحے مین
لزوم کے ساتھ مجلس عزاے آل عبا علیہم السلام بھی ہوتی ہے۔

غمی کی تقریبون کے خصوصیات ہم نے بیان کردیئے - اب رہی محفلون کی نشست
کا طریقہ وہ وہی ہے جو دوسری تقریبون مین عرض کردیا گیا - یہ خوشی اورغمی کی
وہ تقریبین تھین جو اخلاقی و معاشرتی طریقے سے مروج ہین - مذہب نے جن
محفلون کو رواج دیا ہے اُن کو ہم آیندہ بیان کرین گے۔

(۴۹)

آداب صحبت مین دسوین چیز مذہبی صحبتین یعنی عزاداری کی مجلسین اور مولد شریف
کی محفلین ہین - مجلسون کا عام رواج شیعون مین ہے اور مولد شریف کا سُنّیون مین -
اگرچہ دونون مین دونون فریقون کے لوگ شریک ہوتے ہین - بلکہ یہ بھی ہوتا ہے
کہ کبھی بعض محب اہل بیت سُنّی مجلس عزا کرتے ہین اور شیعہ حضرات کے یہان مولد
شریف کی محفل ہوتی ہے - مگر لکھنؤ کی خاص چیز جس نے لکھنؤ کی سوسائٹی پر اثر ڈالا
اور نیز سوسائٹی اُس سے متاثر ہوئی وہ مجلسین ہین - مولد کی محفلون مین کوئی
خصوصیت نہین - جیسی سارے ہندوستان مین ہوا کرتی ہین یہان بھی ہوتی
ہین - گو اس مین شک نہین کہ بعض اُمرا کے یہان مولد مین بھی قریب قریب وہی
شایستگی و تہذیب نظر آتی ہے جو شیعون کی شایستگی کی وجہ سے مجالس مین
ہوا کرتی ہے۔

عزاداری کی مجلسین بہت کثرت سے ہوتی ہین - اور اگر کوئی شخص چاہے

اور پتہ لگاتا رہے تو سال بھر بغیر محنت مزدوری کے محض مجالس کی شرکت سے اپنا پیٹ پال سکتا ہے۔ اور فقط فیاض وعقیدتمند شیعون کی فیاضی پر جی سکتا ہے۔ مجالس ہی کی برکت سے یہان مختلف قسم کے ذاکر پیدا ہوگئے جو جدا جدا عنوانون سے مصائب سید الشہدا علیہ السلام کو بیان کرکے روتے رُلاتے ہین۔ اُن مین سب سے پہلے علما و مجتہدین کا بیان ہے۔ اُنکے بعد حدیث خوان ہین جو احادیث کو سنا کر ایسے پُر درد اور سوز وگداز کی آواز مین فضائل ائمۂ اطہار و مصائب آلِ رسول بیان کرتے ہین کہ سامعین بے اختیار رونے لگتے ہین۔ اور کیسا ہی سنگدل ہو ضبطِ گریہ نہین کر سکتا۔ اُنھین سے ملتے جُلتے واقعہ خوان ہین جو واقعات مصائب اہل بیت کو ایسے الفاظ اور ایسی فصیح وبلیغ عبارت مین سناتے ہین کہ جی چاہتا ہے سنتے رہیے۔ اور روتے جائیے۔ واقعہ خوانی کی فصاحت نے در اصل داستان گوئی کو بے مزہ کر دیا ہے۔ اسکے بعد مرثیہ خوان یا تحت اللفظ خوان ہین جو مرثیون کو شاعرانہ انداز سے سناتے ہین۔ مگر اس سادگی کے سنانے مین بھی چشم وابرو اور ہاتھ پاؤن کے حرکات وسکنات سے واقعات کی ایسی سچی اور مکمل تصویر کھینچ دیتے ہین کہ سامعین کو اگر رقت سے فرصت ملی تو داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہین۔ اسی مرثیہ خوانی کی ضرورت و قدر نے میر انیس اور مرزا دبیر پیدا کیے جو کمال شاعری کے اعلیٰ ترین شہ نشین پر پہونچ گئے۔ یا تو یہ مثل مشہور تھی کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو۔ یا لکھنؤ کے کمال مرثیہ گوئی نے سارے ہندوستان سے منوا لیا کہ عالم شعر وسخن مین مرثیہ گوئی کا رتبہ دیگر اصناف سخن سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ قدردانی نے بیسیون مرثیہ گو اور صدہا مرثیہ خوان پیدا کر دیے جو محرم اور دیگر ایام عزا داری مین لکھنؤ سے نکل کے ہندوستان کے بلاد دور و دراز مین پھیل جاتے ہین۔ اور وہان کی صحبتون مین اپنے کمالات کا سکہ بٹھا کے واپس آتے ہین۔ مرثیہ خوانون کے بعد سوز خوان ہین۔ یہ لوگ نوحون اور مرثیون کو اصول موسیقی کی پابندی مین گا کے سُناتے ہین۔ اُن مین علی العموم تین آدمیون کا گروہ ہوتا ہے۔ دو سُر دیتے ہین جو "بازو" کہلاتے ہین اور تیسرا شخص جو بیچ مین بیٹھتا ہے سوز سُناتا ہے۔ ان لوگون نے بھی اصول موسیقی

کے برتنے ۔ اور راگون اور دھنون کے ادا کرنے مین اس درجہ ترقی کی ہے کہ گویون کو پیچھے ڈال دیا ۔ اور لکھنؤ مین بہت سے اس پائے کے سوز خوان پیدا ہوے کہ بڑے بڑے اُستاد گویّے اُنکے آگے کان پکڑنے لگے ۔ بہرحال جو درجۂ کمال مرثیہ گوؤن نے شاعری مین حاصل کیا وہی سوز خوانون نے موسیقی مین ۔

یہ سب فن محض مجالس عزا کی برکت سے پیدا ہوے ۔ اور خاص لکھنؤ مین پیدا ہوے ۔ اور ان سب نے علاوہ ادب اُردو کو سب انتہا ترقی دینے کے نظم و نثر اُردو کی دنیا مین یہ خاص شان پیدا کر دی کہ انسانی جذبات کو جس طرح چاہین حرکت مین لائین ۔ اور جس قسم کے جذبات اور جیسے جوش کو چاہین پیدا کر دین ۔ اس فن کو باضابطہ طور پر یونانیون نے ترقی دی تھی ۔ جنھون نے اپنی تقریرون کے موثر بنانے کے لیے پتہ لگایا تھا کہ کن الفاظ ۔ کن حرکات ۔ کیسے لہجے ۔ اور کن آوازون سے انسان کے دل مین خوشی یا غم یا رحم یا قہر و غضب کا جوش پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ اسکے بعد کبھی اس فن کی طرف کسی قوم نے توجہ نہین کی ۔ یہان تک کہ اب یورپ کے آرٹیرون اور اسپیکرون نے اس فن کو زندہ کرنا شروع کیا ۔ مگر لکھنؤ مین محض ذاکری کے طفیل مین اس فن کو خود بخود اس قدر ترقی ہو گئی کہ یورپ والے بھی شاید اس درجے سے آگے نہ بڑھ سکے ہون گے ۔

مجلسون مین ختم کے وقت شربت پلانا یا مٹھائی یا کھانا تقسیم کرنا لازم ہے ۔ مگر مہذب اور دولتمند لوگون نے اب یہ نہایت ہی شایستہ طریقہ اختیار کر لیا ہے کہ جن حضرات کو بُلانا ہوتا ہے اُن کے پاس دعوت کے رقعون کے ساتھ حصہ بھی بھیج دیا جاتا ہے ۔ مجلس سے واپس آتے وقت ہاتھ مین حصہ لے کے چلنا بہت سے مہذب اور خوشحال لوگون کو تہذیب کے خلاف اور نہایت مبتذل معلوم ہوتا تھا ۔ گو کہ عوام اور بازاری لوگ اس مین مضائقہ نہین سمجھتے مگر خوش حال اور وضعدار لوگون کو یہ گران گذرتا تھا ۔ اور اگر خدمتگار موجود نہ ہوا تو بہت سے لوگون کو مجبور ہونا پڑتا تھا کہ مجلس ہی مین کسی دوست یا غریب آدمی کو اپنا حصہ دے دین ۔

مجلس کی نشست کی شان یہ ہے کہ لکڑی کا ایک ممبر جس مین سات آٹھ زینے ہوتے ہین دالان یا کمرے کے ایک جانب رکھا ہوتا ہے ۔ اور لوگ چارون طرف دیوار کے برابر پُر تکلف فرش پر بیٹھتے ہین ۔ اور اگر مجمع زیادہ ہوا تو بیچ کی جگہ بھی بھر جاتی ہے ۔ جب کافی آدمی جمع ہو جاتے ہین تو ذاکر صاحب ممبر پہ رونق افروز ہو کر پہلے ہاتھ اُٹھا کر کہتے ہین "فاتحہ"۔ ساتھ ہی تمام حاضرین ہاتھ اُٹھا کے چپکے چپکے سورۂ فاتحہ پڑھ لیتے ہین ۔ اسکے بعد وہ اگر حدیث خوان یا واقعہ خوان ہوے تو کتاب کھول کے بیان کرنا شروع کرتے ہین ۔ اور اگر مرثیہ خوان ہوے تو مرثیے کے اوراق ہاتھ مین لے کے مرثیہ سنانے لگتے ہین مجتہدون اور حدیث خوانون کے بیان کو لوگ خاموشی وادب سے سنتے اور رقت کے موقعون پر زار زار روتے ہین ۔ مگر مرثیون کے سننے وقت مجمع حاضرین سے بجز رقت کے بندون کے جبکہ رونے سے فرصت نہین ملتی برابر صداے آفرین و مرحبا بلند ہوتی رہتی ہے ۔

سوز خوان ممبر پر نہین بیٹھتے بلکہ لوگون کے بیچ مین ایک جانب بیٹھ کر نوحے اور مرثیے سُناتے ہین ۔ اور اکثر داد بھی پاتے ہین ۔

اکثر مجلسون مین مختلف ذاکر یکے بعد دیگرے پڑھتے ہین ۔ اور عموماً حدیث خوانی کے بعد مرثیہ خوانی اور اُسکے بعد سوز خوانی ہوتی ہے ۔ سوز خوانی چونکہ دراصل گانا ہے اس لیے اس کا رواج اگرچہ لکھنؤ ہی مین نہین سارے ہندوستان مین کثرت سے ہو گیا ہے مگر مجتہدین اور ثقہ اور پابند شرع بزرگون کی مجلسون مین سوز خوانی نہین ہوتی ۔ مجتہدین کے وہان کی مجلسون مین پابندی آئین کا بہت خیال رہتا ہے ۔ خصوصاً یہان غفرانمآب کے امام باڑے مین نوین محرم کو جو مجلس ہوتی ہے وہ خاص شان اور امتیاز رکھتی ہے ۔ اور اُس کی شرکت کے شوق مین لوگ دُور دُور سے آتے ہین ۔ اُس مین اثناے بیان مین اونٹ حاضرین کے سامنے لائے جاتے ہین جن پر کجاوے یا محملین ہوتی ہین اور اُن پر سیاہ پوششین پڑی ہوتی ہین ۔ اور مومنین کو یہ منظر نظر آجاتا ہے کہ دشت کربلا مین اہل بیت کا لُوٹا مارا اور تباہ شدہ قافلہ کس مظلومی و ستم زدگی

کی شان سے شام کی طرف چلا جاتا تھا۔ حاضرین پر اس المناک منظر کا ایسا اثر پڑتا ہے کہ ہزارہا حاضرین سے دس بیس کو غش ضرور آجاتا ہے جو بڑی مشکلوں سے اُٹھا کر اپنے گھروں کو پہونچائے جاتے ہین۔

خاندان اجتہاد سے مجالس مین اس ڈریمٹک شان کی ابتدا ہونے کا یہ انجام ہوا کہ اکثر عقیدتمند اُمرا جدت طرازیان کرنے لگے۔ اور بعض بزرگون نے تو یہان تک ترقی کی کہ مجلسون کو بالکل ڈراما بنا دیا۔ چنانچہ مولوی مہدی حسین صاحب مرحوم کے یہان مجلسون مین وقتاً فوقتاً تھیئٹر کے ایسے پردے کھلتے جن کے ذریعے سے واقعات کربلا کے پُرالم سین پیش نظر کر دیے جاتے۔ اور حاضرین پر عجب رقت کا عالم طاری ہوتا۔ اس سے بھی زیادہ ترقی مرحوم کے یہان کی زنانی مجلسون مین ہوتی۔ جن مین شہر کی ہزارون عورتین جمع ہو جاتین۔ اور بجاے اسکے کہ ذاکر حدیث خوانی کرین اسٹیج پر کربلا کے سین زندہ ایکٹرون اور ایکٹرسون کے ذریعے سے دکھائے جاتے۔

جہان تک مجھے معلوم ہے علما و مجتہدین نے ان بدعات کو پسند نہین کیا۔ مگر عوام الناس کی دلچسپی ان مین روز بروز بڑھتی ہی جاتی ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ شیعون کی مجلسون نے لکھنؤ کی معاشرت پر بہت نمایان اثر ڈالا ہے۔ اور اُن کے ذریعے سے آداب صحبت اور تہذیب و شایستگی کو بہت زیادہ ترقی ہو گئی ہے۔ اور مرثیون کے ذوق نے شاعری و موسیقی کو زندہ ہی نہین کر دیا بلکہ اُن دونون فنون کا سچا مذاق مردون سے تجاوز کر کے پردہ نشین شریف خاتونون تک مین پیدا کر دیا۔ اور مین سمجھتا ہون کہ یہ چیز یورپ کے سوا جہان رقص و سرود لڑکیون کی تعلیم مین داخل ہے ایشیا کے کسی شہر مین نہ پیدا ہو سکی ہو گی۔

مجلسون کے علاوہ ایک اور طرح کی محفلین بھی شیعون مین ہوتی ہین۔ جو "صحبت" کے نام سے یاد کی جاتی ہین۔ اُن کا زمانہ ۹۔ ربیع الاول یعنی عید شجاع کے دن سے شروع ہو کر چند روز تک باقی رہتا ہے۔ مجالس عزا جس طرح اہل بیت کے مصائب پر رونے اور آنسو بہانے کے لیے ہین۔ اسی طرح یہ صحبتین

اس غرض سے کی جاتی ہیں کہ ڈرامیٹک طریقے سے دشمنان اہل بیت کی توہین و تذلیل کی جائے اور اُن کو بے نقط گالیاں دی جائیں۔ اور چونکہ شیعوں کے خیال میں اہلبیت کے سب سے بڑے دشمن اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت عمر فاروقؓ تھے اس لیے انھیں دونوں محترم ناموں کی توہین کرنا اور اُن کے پتلے بنا کے ذلت و نفرت کے ساتھ جلانا ان صحبتوں کا مقصود اصلی ہو گیا ہے۔ ان میں کسی سُنی کے جانے کی کوئی وجہ نہیں ہے اس لیے کہ وہ اپنے مقتداؤں کی توہین کو گوارا نہیں کر سکتے۔ مگر سُنا جاتا ہے کہ یہ نہایت ہی بدتہذیبی و فحاشی کی شرمناک محفلیں ہوتی ہیں۔ جن میں ابتذال اس درجے تک ترقی کر جاتا ہے کہ کوئی مہذب شیعہ بھی بغیر روحی تکلیف اُٹھائے واپس نہیں آ سکتا۔ ان صحبتوں نے بھی شیعوں کے مذاق پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ اور اسی اثر کا نتیجہ ہے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر سُنی شیعوں میں لڑائیاں ہو جاتی ہیں۔

شیعوں کی ان مجلسوں اور صحبتوں کے بعد سنیوں کی مجالس مولد شریف ہیں۔ اُن کی نشست اور شان وہی ہوتی ہے جو مجلسوں کی ہے۔ مگر فرق یہ ہے کہ سُنیوں کے یہاں ممبر نہیں ہوتا بلکہ ایک ممتاز جگہ پر کوئی چوکی بچھا دی جاتی ہے اُس پر تکلف کا فرش کر دیا جاتا ہے اور اُس پر بیٹھ کے واعظ یا مولد خوان صاحب مولد سناتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ تھا کہ کوئی مولوی صاحب حالاتِ ولادت سرور عالمؐ بیان کر دیتے۔ اور ذکر ولادت کے وقت سب لوگ کھڑے ہو جاتے۔ مولد خوان صاحب مسرتِ ولادت میں کوئی نظم پڑھتے اور لوگوں پر گلاب پاش سے کیوڑہ چھڑکا جاتا۔ یا کوئی واعظ نہ ملتا تو کوئی پڑھا لکھا آدمی مولوی غلام امام شہید کا مولد شریف پڑھ کے سُنا دیتا۔ مگر عوام کے لیے مولد خوانی کا یہ طریقہ اطمینان بخش نہ ثابت ہوا۔ اور سوز خوانوں کی دیکھا دیکھی ایسے مولد خوان پیدا ہو گئے جن کے ساتھ دو سُر لانے والے ہوتے ہیں۔ اور اُنکے بیچ میں وہ بیٹھ کر ترنم کے خاص لہجے میں واقعاتِ ولادت بیان کرتے ہیں۔ اور درمیان درمیان میں برابر اشعار و قصائد گائے جاتے ہیں

جن مین دونون بازو اُن کا ساتھ دیتے ہین۔ گر سوز خوانون نے تو موسیقی کو زندہ کر دیا اور مولد خوان گانے والون نے سچ یہ ہے کہ موسیقی کا گلا گھونٹنے مین کوئی کسر اُٹھا نہین رکھی۔

لیکن مولد خوانی کے اعتبار سے لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہین حاصل ہے ہس لیے کہ اُسی طرز سے اور اُسی شان کی مولد خوانی سارے ہندوستان کے سُنیون مین جاری ہے۔ اور یہی حال سُنی صوفیون کی صحبت حال وقال کا ہے۔ جو ہر جگہ یکسان ہے۔ مسلمانون کے ہندوستان مین آنے کے زمانے ہی سے مجلس سماع کی بنیا د پڑ گئی مگر اُس سے سوا اسکے کہ قوالون کا ایک گروہ پیدا ہوگیا جو رتبے اور موسیقی دانی مین ڈھاڑیون اور گویون سے گرا ہوا سمجھا جاتا ہے فن موسیقی کو کوئی نمایان نفع نہین حاصل ہو سکا۔ حالانکہ سوز خوانی نے ایک صدی کے اندر ہی موسیقی کو اپنی لونڈی بنا لیا۔ اور حاکمانہ شان سے اُس پر تصرف کرنے لگی۔

(۵۰)

مجلسون اور محفلون کا حال ہم بیان کر چکے۔ اب ضرورت معلوم ہوتی ہے کہ ہم لوازم صحبت کو بھی شرح وبسط سے بتا دین۔ اس لیے کہ وہ چیزین ہین جن سے معاشرت اور وضع صحبت کا حال آئینے کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ لوازم صحبت بہت زیادہ بلکہ بے شمار ہین۔ جن کو ہم وقتاً فوقتاً بتائین گے۔ مگر فی الحال سب سے مقدم چیزین حقہ۔ خاصدان۔ لوٹیا۔ اور اُگالدان ہین۔ یہ اس قدر ضروری اشیا ہین کہ رؤسا کے ہمراہی خدمتگارون کے پاس لازمی طور پر موجود رہا کرتی ہین۔ چند روز پیشتر اعلیٰ طبقے کے دولتمندون کے ہمراہ ایک خدمتگار کے ہاتھ مین حقہ بھی رہا کرتا تھا۔ مگر اب یہ طریقہ چھوٹ گیا۔ حقہ در اصل دہلی کی ایجاد ہے۔ اور وہین شاہی بھنڈی خانون مین مختلف وضعون کے حقے تیار ہوگئے تھے۔ لکھنؤ نے جو کچھ ترقی کی وہ سب سے پہلے پیچوانون۔ چلمون۔ اور چنبرون کی شکل اور قطع کی اصلاح سے متعلق ہے۔ دہلی کے حقے بھدے اور بدصورت تھے۔ لکھنؤ مین نہایت موزون و خوشنما بنا دیے گئے پھر آئنے۔ پیتل۔ پھول اور جست کے حقون کے علاوہ مٹی کے حقے ایسے خوشنما بن گئے جو لوگون کو اپنی نفاست و

نزاکت کے لحاظ سے نہایت ہی پسند آئے۔ اور اکثر لوگوں کو سٹی کے نازک، سبک خوشنما اور سوندھے حقّے پُر تکلف قیمتی حقّوں سے زیادہ اچھے معلوم ہوئے۔

حقّوں کی شکل مین اصلاح و ترقی ہونے کے بعد خود تنباکو مین عجیب عجیب لطافتین اور خوبیان پیدا کی گئین۔ تنباکو کو گُڑ یا شیرے مین ملا کے کوٹ لینا غالباً دہلی ہی کی ایجاد ہے۔ جس کی وجہ سے پینے کی تنباکو کی اصلاح مین ہندوستان کو دنیا کے سارے ملکون اور صفحۂ زمین کی تمام قومون پر فوقیت حاصل ہے۔ تنباکو ساری دنیا مین پیا جاتا ہے۔ چُرٹ۔ سگریٹ۔ اور پائپ کے لیے تنباکو کی اصلاح مین اگرچہ یورپ نے بے انتہا کوششین کین اور طرح طرح کی نفاستین پیدا کر دین مگر یہ تدبیر کسی کو نہ سوجھ سکی کہ شیرہ یا گُڑ ملا کے تنباکو کی تلخی اور گلوگیری مٹائی جائے اور دھوئین مین لطف اور قیام پیدا کیا جائے۔ اسکے بعد لکھنؤ نے یہ ترقی کی کہ خمیرہ ملا کے اور خوشبوئین شریک کر کے تنباکو سی بدبودار ناگوار چیز کو اس قدر خوش آیندہ اور لطیف بنا لیا کہ چلم بھر کے رکھتے ہی سارا کمرہ خوشبو سے مہک اُٹھتا ہے۔ اور جو حقّہ نہ پیتے ہون اُن کا بھی جی چاہنے لگتا ہے کہ دو ایک کش کھینچ لین۔ ہندوستان کے بعض خطّون کا تنباکو بہت اچھا ہوتا ہے اور اُن شہرون کے نام سے تنباکو مشہور بھی ہو گیا ہے۔ مگر وہ شہرت کسی انسانی کوشش کا نتیجہ نہین۔ کوشش اور تدبیر سے جو نفاست تنباکو مین لکھنؤ نے پیدا کی ہے اور کسی شہر کو نہین نصیب ہوئی۔ اکثر شہرون کے لوگ خمیرے کو نہین پسند کرتے۔ یا شاکی ہین کہ اس سے نزلہ ہو جاتا ہے۔ مگر یہ محض اُن کے عادی نہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ اور ویسا ہی ہے جیسے انگریزون کو قورمہ ناپسند ہے یا اُسے ہضم نہین کر سکتے۔ تنباکو کے ساتھ حقّے کے تمام لوازم مین ترقی ہوئی۔ چلمین بھی پہلے سے زیادہ نازک و نفیس اور خوشنما ہو گئین۔ چنبرون مین بھی ترقی ہوتی رہی چنبرون مین خوبصورت تہری نقرئی زنجیرین لگائی گئین۔ طرح طرح کی مہنالین ایجاد ہوئین۔ پھر پھولون کے نفیس اور دلفریب حقّے ایجاد ہوے۔ غرض یہان کی سوسائٹی نے حقّے کو سنوار کے اور آراستہ کر کے دولھن بنا دیا۔

حقّے کے بعد نہین بلکہ اُس سے بھی زیادہ اہم چیز لوازم صحبت مین خاصدان

ہے جس کی بار بار ضرورت پیش آیا کرتی ہے - اور باہر آنے جانے مین خدمتگارون کے پاس رہتا ہے - خاصدان وہ چیز ہے جس مین پانون کی گلوریان بناکے رکھی جاتی ہین - پان ہندوستان کی قدیم چیز ہے - ہندوون کے زمانے سے اُس کی اہمیت چلی آتی ہے - اگلے دنون راجاؤن اور بادشاہون کو جب کوئی بڑی مہم پیش آتی یا کوئی ذمہ داری کا کام لینا ہوتا تو پان کا بیڑا (گلوری) بناکے سامنے رکھتے اور کہتے کہ کون اسے اُٹھائے گا - جس کا مطلب یہ ہوتا کہ "اس مہم پر کون جائے گا؟" یا اُس ذمہ داری کے کام کو کون انجام دے گا؟ ارکان دولت - سردارون - یا عام حاضرین دربار مین سے جو کوئی اُس بیڑے کو اُٹھا لیتا وہ گویا وعدہ کرتا کہ اس کام کو مین انجام دون گا - یا اس مہم کو مین سَر کرون گا - یہ رسم تو مٹ گئی - مگر یہ کہاوت آج تک زبانون پر موجود ہے کہ "فلان شخص نے اس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے" یعنی اُسکو اپنے ذمے لیا ہے -

پُرانے دربارون مین حاضرین کو انعام واکرام کے ساتھ پان بھی مرحمت ہوا کرتے - جس کا ذکر ابن بطوطہ نے بھی اپنے سفرنامے مین کیا ہے - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ پان ہندوستان کی تاریخی چیز ہے - لہذا چاہیے تھا کہ مرور زمانہ سے پانون اور پان کے سامان کو یوماً فیوماً ترقی ہوتی رہتی - مگر ہمین بالکل نہین نظر آتا کہ پان جب تک دہلی مین تھا اُس کو کیا ترقی ہوئی - اُسکے مسالے کے جو اجزا قدیم الایام سے چلے آتے ہین آخر تک وہی قائم رہے - اور اُن کی بھی کسی قسم کی اصلاح نہین ہوئی - اُسکے مسالون مین کتھا - چونا - ڈلیان - اور الائچیان قدیم زمانے ہی مین منتخب ہو چکی تھین - تنباکو بھی لکھنؤ مین آنے سے پہلے ہی اُسکے اجزا مین شامل ہو چکا تھا - مگر اس کا بالکل پتہ نہین لگتا کہ اگلی بیسیون صدیون اور سیکڑون گذشتہ دربارون اور سلطنتون نے اُس کو کون سی خاص ترقی دی - لکھنؤ مین پان کا رواج دہلی کی بہ نسبت بہت زیادہ ہو گیا - اِس کے لیے خاص قسم کے ظروف ایجاد ہوے - اور اُس کی تمام چیزون کو جدا جدا ترقی حاصل ہوئی - پہلے تو خود پانون یعنی اُسکے پتون کی اصلاح ہوئی - ہندوستان کے بعض شہرون مثلاً مہوبے وغیرہ کے پان قدرتی طور پر بہت اچھے اور اعلیٰ درجے کے ہوتے ہین -

اطراف لکھنؤ میں اگرچہ پان کثرت سے پیدا ہوتے ہیں مگر اُن میں بالذات کوئی خاص خوبی و فوقیت نہیں ہوتی۔ مگر یہاں کے ترقی پسند اُمرا کی توجہ سے تنبولیوں (پان والوں) نے صنعتی اصول پر پانوں کو ترقی دینا شروع کی۔ اور اس درجے پر پہونچا دیا کہ یہاں کے پان سب جگہ سے بڑھ گئے۔ وہ پانوں کو مہینوں زمین میں دفن کرکے رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ اُن کا کچا پن دُور ہو جاتا ہے۔ ہراہند بالکل نہیں باقی رہتی ہے۔ رگیں نازک اور نرم ہو جاتی ہیں۔ رنگ میں سفیدی اور پختگی آجاتی ہے۔ کچے پان میں جو ایک طرح کی تیزی ہوتی ہے وہ بھی جاتی رہتی ہے۔ اور ایسا نرم اور نازک اور لطیف ہو جاتا ہے کہ کسی جگہ کا پان مزے اور لطف میں اُس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہی بنے ہوے پان بیگمی پان کہلاتے ہیں جو دُور دُور کے شہروں میں جاتے اور نہایت ہی شوق اور بڑی قدر سے لیے جاتے ہیں۔

پان کے پتے کے بعد چونا ہے۔ ہر جگہ اور ہر شہر میں معمولی چونا استعمال ہوتا ہے جو اکثر چھنا ہوا صاف بھی نہیں ہوتا۔ ماسوا اس کے چونا نہایت ہی تیز اور اکّال چیز ہے۔ نیا تازہ چونا ہوا یا زیادہ ہو گیا تو منہ کٹ جاتا ہے۔ ان مضرتوں سے بچنے کے لیے یہاں یہ تدبیر کی جاتی ہے کہ اُسے خوب چھان کے اور صاف کرکے اُس میں تھوڑی سی بالائی یا تازے دہی کا توڑ چھان کر ملا دیتے ہیں۔ اس طریقے سے لکھنؤ کے نفیس مزاج لوگوں کے پانداں میں ایسا اچھا خوشگوار۔ لطیف اور بے ضرر چونا ہوتا ہے کہ اور جگہ نہیں نصیب ہو سکتا۔

دوسری چیز پان کے لوازم میں سے کتھا ہے۔ کتھا بجائے خود نہایت ہی بکٹھی۔ کڑوی۔ اور بدمزہ چیز ہے۔ پان میں وہ فقط چونے کی اصلاح اور اچھا رنگ پیدا کرنے کی غرض سے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا بکٹھا پن بہت ناگوار گذرتا ہے جو عادت ہو جانے سے چاہے گوارا ہو جائے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک بدمزہ چیز ہے۔ کتھے کے بنانے کی یہ تدبیر تو سب جگہ عام ہے کہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرکے اُسے پانی میں پکاتے ہیں اور جب جوش کھا کر وہ سرخ شربت سا ہو جاتا ہے تو کپڑے میں چھان کر پانی میں رکھ کے

جما لیتے ہین - عام طور پر سب جگہ اتنا ہی ہوتا ہے مگر یہان ایک طباق یا توسے
مین راکھ بھر کے اُسپر ایک کپڑا ڈالتے ہین - اور اُس کپڑے پر اُس جمے ہوے
کتھے کو روئی کی طرح پھیلا دیتے ہین اور اُس پر بار بار پانی چھڑکے جاتے ہین
پانی اُس کی سرخی کو لے کر جس مین کسیلا پن ہوتا ہے راکھ مین جذب ہو جاتا ہے
اس طرح صاف کرتے کرتے کتھے کا فقط وہ لطیف ترین حصہ باقی رہ جاتا ہے
جو دھوئے کپڑے کا سا سفید اور نہایت ہی نفیس ہوتا ہے - پھر اُس مین کیوڑے
کی خوشبو دے کر یا کیوڑے کے پھولون مین رکھ کر خشک کر لیتے ہین - اس تدبیر پر
بعض اور مقامات مین بھی اب عمل ہونے لگا ہے - مگر یہ ایجاد لکھنؤ ہی کی ہے - اور
جس تکمیل کے ساتھ یہان اُس پر عمل ہوتا ہے اور کہین ہو بھی نہین سکتا - اب
اس قسم کا کتھا اکثر تاجر لکھنؤ مین تیار کر کے فروخت بھی کرنے لگے ہین - جن مین سے
ہمارے مکرم مہربان قاضی محمد یونس صاحب مقیم محمود نگر لکھنؤ نے بہت شہرت
حاصل کی ہے - مگر نفاست پسند اُمرا کے گھرون مین جو سفید - اچھا اور صاف
کتھا خود ہی بنا لیا جاتا ہے - وہ اس قدر نفیس ہوتا ہے کہ اُس کی نفاست کو
بازار والون کا تیار کیا ہو کتھا چاہے کیسا ہی اچھا ہو نہین پہونچ سکتا - دکن کے
شہرون پونا وغیرہ مین ایک نئی طرح کا بنا ہوا خشک کتھا بازار مین ملتا ہے -
جو سوکھا ہی پان مین ڈالا جاتا ہے - وہان کے لوگون کو وہ کتھا پسند بھی ہے
مگر ہم باوجود کوشش کے اُس کی خوبیون کو نہ محسوس کر سکے اور نہ سمجھ سکے -
اس لیے کہ بیڑا ہر وقت کرکرا بھی ہوا کرتا ہے اور کسیلا پن اُس مین اصلی بے
بنے کتھے سے بھی زیادہ ہوتا ہے -

پان کے مسالون مین تیسری چیز ڈلیان ہین جو سروتے سے کاٹ کے اور چھوٹے
چھوٹے ٹکڑے کر کے پان مین ڈالی جاتی ہین - اُن کا کاٹنا ایک معمولی چیز تھا
مگر لکھنؤ مین ڈلیون کا کاٹنا بھی ایک صنعت بن گیا - اس لئے کہ اب اکثر خاتونین
باجرے کے دانون کے برابر باریک کاٹتی ہین جس مین سب دانے برابر اور
یکسان ہوتے ہین - اور پھر اس شرط کے ساتھ کہ چورا زیادہ نہ نکلے اور ڈلی
کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے -

الائچیوں مین کسی اصلاح کی گنجایش ابھی تک محسوس نہین ہوئی اس لیے کہ جیسی آتی ہین ویسی ہی استعمال ہوتی ہین - مگر تکلفات نے اتنا ضرور کیا ہے کہ خاص تقریبوں مین اور خاص موقعوں پر اُن مین چاندی کا ورق لگا دیا جاتا ہے - اور جب خاصدان یا تھالی مین رکھی جاتی ہین تو معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کے چمکتے ہوے ٹکڑے رکھے ہین -

اس کے بعد تنباکو ہے - تنباکو کا استعمال دھوئین کی صورت مین جس طرح عالمگیر ہے اُسی طرح کھانے مین بھی اُس کا رواج بڑھتا جاتا ہے - انگلستان مین مین نے بہت سے انگریزون کو دیکھا جو تنباکو کی خشک پتی مل کر پھانک لیا کرتے ہین - ہندوستان مین بھی مدت سے خشک تنباکو کے کھانے کا رواج چلا آتا ہے - جس کو دہلی مین اس کی سنہری رنگت کے لحاظ سے زردہ کہتے ہین - پہلے فقط غیر مدبر اور غیر اصلاح شدہ پتی کو پان مین ڈالکر کھا یا کرتے تھے - مگر اگلے ہی دنون یہ بھی رواج تھا کہ بہت سے گھرون مین تنباکو کی پتی مین اُس کے ڈنٹھلون کو اُبال کر اور اُس کے عرق مین چند اعتدال پر لانے والے خوشبودار مسالے ملا کر تنباکو کی کرواہٹ اپنے مذاق کے مطابق گھٹا یا بڑھا دی جاتی - اور لطافت و خوشگواری کے ساتھ اُس مین ایک جانفزا خوشبو بھی پیدا کر دی جاتی - مگر یہ تدبیر مخصوص گھرون اور خاندانون تک محدود تھی - عام لوگ تنباکو کی پتی ہی بغیر بنائے کھاتے - جو ہر پاندان مین موجود رہا کرتی - لیکن اب تقریباً بیس برس ہوے منشی سید احمد حسین صاحب نے اپنی ایجاد سے ایک خاص قسم کا بنا ہوا تنباکو جس کی صورت ٹڑتے دار بارودت کی سی ہوتی ہے ملک کے سامنے پیش کیا - اور وہ ایسا مقبول ہوا کہ چند ہی سال کے اندر بے بنی پتی کے کھانے کا رواج قریب قریب اُٹھ گیا -

(۵۱)

تنباکو مین پتی کی اصلاح سے پہلے جس کا سہرا ہمارے مکرم دوست منشی سید احمد حسین صاحب کے سر ہے - اصلاح کی ایک اور کامیاب کوشش کی گئی - وہ یہ

کہ تنباکو کی پتّی اور ڈنٹھلوں کو خوب اچھی طرح اُبال کر اُس کا عرق نکال لیا جاتا ہے اور پکاتے پکاتے وہ اس قدر گاڑھا کر دیا جاتا ہے کہ لیئی یا تازی افیون کی سی شکل ہو جاتی ہے۔ پھر اُس میں مشک۔ کیوڑا۔ اور بہت سی مناسب خوشبوئیں ملا کے اس درجہ لطیف و معطر بنا دیا جاتا ہے کہ پان کے ساتھ۔ تی برابر قوام کھا لیجیے تو تنباکو کا مزہ آنے کے ساتھ منہ میں دن بھر خوشبو آتی رہتی ہے۔ پھر نفاست مزاجی نے اس پر اور زیادہ ترقی کی یعنی اُس قوام کی ننھی ننھی گولیاں بنائی جاتی ہیں۔ اور ہر گولی ایک خوراک کی مقدار میں ہوتی ہے۔ پھر گولیوں پر چاندی یا سونے کے ورق لپیٹ کر اُن کو ایسا خوشنما اور دلفریب بنا دیا جاتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے موتی رکھے ہوئے ہیں۔ قوام اور گولیوں کو مفتی گنج کی ایک بیگم صاحب بے مثل بناتی تھیں۔ خاص لکھنؤ والوں کو اُنکے ہاتھ کی بنی ہوئی گولیوں کے سوا کسی کارخانے کی گولیاں نہیں پسند تھیں۔ مگر اُنھیں کے زمانے میں اصغر علی محمد علی کے کارخانے نے ان دونوں چیزوں کو تیار کر کے سارے ہندوستان کے سامنے پیش کر دیا۔ چند روز بعد ان بیگم صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور ہر جگہ اصغر علی کے کارخانے ہی کے قوام اور گولیوں کا رواج ہو گیا۔ بعد ازاں اور بہت سے لوگوں اور متعدد کارخانوں نے ان چیزوں کو اپنے اہتمام سے تیار کیا۔ مگر ابھی تک کوئی بھی اصغر علی مرحوم کے کارخانے سے سبقت نہیں لے جا سکا۔ لیکن قوام اور گولی میں ایک عیب تھا۔ وہ یہ کہ چاہے خوشبو دیر تک ٹھہر جائے مگر تنباکو کا مزہ اور اُس کا کڑوا پن پہلی ہی پیک میں جاتا رہتا۔ اسی عیب کو مٹانے کے لیے منشی سید احمد حسین صاحب نے یہ جدید مدبر معطر پتی ایجاد کی جس کی تلخی اور عطریت آخر تک پان کا ساتھ دیے جاتی ہے۔ اور اسی خوبی کا نتیجہ ہے کہ یکایک دنیا کا رُخ اس طرف پھر گیا۔ اور قوام اور گولیاں گو اب بھی تیار کی جاتی ہیں مگر تقویم پارینہ ہو گئیں۔ اور اُن کا مذاق گھٹنے کی یہی رفتار رہی تو اُمید ہے کہ تھوڑے زمانے میں بالکل مٹ جائیں گی۔

پان ہی کے متعلق یا اُسکی مناسبت سے لکھنؤ میں چند اور ایجادیں ہوئیں مثلاً ایسی الائچیاں ایجاد کی گئیں کہ ایک الائچی کھا لیجیے تو منہ پان سے زیادہ سرخ ہو جائے۔ ان کی تیاری میں اگرچہ پان ہی کے اجزا سے کام لیا جاتا ہے جو رنگ ملا کر الائچی کے

چھلکوں میں بھر دیے جاتے ہیں مگر یہ بجز اس کے کہ رنگ چوکھا آتا ہے وہ پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور کسی کے پان کھانے کی غرض اُن مصنوعی الائچیوں سے نہیں حاصل ہو سکتی۔ اسی طرح ایک اور قسم کی الائچیاں تیار کی گئیں جن میں مسی بھر دی جاتی ہے۔ اور عورتیں بجائے اس کے کہ دیر تک بیٹھ کر مسی ملیں اس قسم کی ایک الائچی پان میں ڈال کر کھا لیں تو مسی خود بخود لگ جاتی ہے۔ اور گہری نیلگونی خوب اچھی طرح ریخوں میں جم کر بیٹھ جاتی ہے۔ مگر ان دونوں قسم کی الائچیوں سے وہ مقصد بخوبی نہ حاصل ہو سکا جس کے لیے ایجاد کی گئی ہیں۔ مثلاً سرخ الائچیاں پان کا بدل نہیں ہو سکتیں۔ اور سیاہ الائچیوں میں عمدہ عطر مسی کی خوشبو نہیں ہوتی اس لیے عام پسند اور مقبول نہ ہو سکیں۔ اور آج تک اُن سے بجز مذاق اور دل لگی کے کوئی ضروری کام نہیں لیا جا سکتا جو لازمۂ معاشرت ہو۔

اسی سلسلے میں ہمیں چکنی ڈلی کو بھی بیان کر دینا چاہیے جو اگر پان کا جزو لاینفک نہیں تو اُس کے لواحق میں ضرور ہے۔ بعض لوگ معمولی ڈلیوں کے عوض اُسے پان میں کھاتے ہیں۔ اور پان میں نہ کھائیں تو بہت سے لوگ اسے تنہا منہ میں رکھتے ہیں جو الائچی کے ساتھ مل کر بہت لطف دیتی ہے۔ خصوصاً ہندو جو چونکہ مسلمانوں کے ہاتھ کی گلوری نہیں کھا سکتے اس لیے اُن کی خاطر و تواضع محض چکنی ڈلی اور الائچی ہی سے ہوتی ہے۔ لہذا وہ بھی معاشرت کا ایک ضروری سامان بن گئی ہے۔

چکنی ڈلی دراصل وہی ڈلی ہے جو پانوں میں ڈالی جاتی ہے۔ مگر بہتر اور اصلاح شدہ۔ یہ لکھنؤ یا دہلی یا حیدرآباد یا دیگر متمدن شہروں میں نہیں بنتی بلکہ جہاں پیدا ہوتی ہے وہیں سے بنی بنائی آتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اصلی ڈلی کو دودھ میں ڈال کے اُبالتے اور پکاتے ہیں۔ خیر جس طرح بنتی ہو۔ اُس میں ایک لعاب پیدا ہو جاتا ہے خشکی دفع ہو کے دُہنیت آ جاتی ہے۔ اور بعض اوقات زیادہ ڈلی کھا جانے سے گلے میں جو پھندا پڑ جاتا ہے وہ عیب چکنی ڈلی میں بالکل نہیں باقی رہتا۔ اور سچ یہ ہے کہ معمولی ڈلی سے بدرجہا زیادہ بامزہ۔ لطیف و نفیس ہو جاتی ہے۔

جہان تک مجھے معلوم ہے چکنی ڈلی کا رواج حیدرآباد - دہلی اور دیگر شہرون مین لکھنؤ کے مقابل بہت زیادہ ہے - اور انھین مقامات کے شوقینون کا کام تھا کہ اُس مین کسی قسم کی اصلاح کرتے یا اُس کو اپنے مذاق مین ترقی دیتے - مگر تعجب ہے کہ کسی شہر مین اس جانب توجہ نہ کی گئی - اور چکنی ڈلی کی بھی اصلاح کی تو لکھنؤ والون نے - چکنی ڈلی کا اصلی مغز نہایت لطیف - خوش مزہ و نازک ہوتا ہے اور جو حصہ قشر سے ملا رہتا ہے کسی قدر کٹھا رہ جاتا ہے - خصوصاً پیندی کی طرف کا حصہ بہت زیادہ ناقص ہوتا ہے - انھین عیوب کے مٹانے اور ناقص حصے کے نکال ڈالنے کے خیال سے لکھنؤ مین کاٹ چھانٹ کر معمولی چکنی ڈلیان کئی قسم کی تیار ہونے لگین - سب سے اول تو دورخی کہلاتی ہین - اُنکے بننے کی شان یہ ہے کہ نیچے اوپر سے زیادہ تر حصے کو اور تھوڑے تھوڑے کنارون کو گرد سے کاٹ کر خوشنما اور خوش رنگ کٹوریان سی بنا دی جاتی ہین جن مین فقط وہی نرم و لطیف مغز رہ جاتا ہے جو چکنی ڈلی کا بہترین حصہ ہے - دوسرے درجے کی چکنی ڈلیان یک رُخی کہلاتی ہین - اُن مین بھی اگرچہ چارون طرف سے تھوڑی بہت کاٹ چھانٹ ہوتی ہے - مگر نیچے اوپر کے دونون ناقص حصون مین سے ایک طرف کا زیادہ تر حصہ چھوڑ دیا جاتا ہے - تیسری قسم یہ ہے کہ چکنی ڈلی کے مغز کے خوشنما ہشت پہل ٹکڑے بنا دیے جاتے ہین - اس کاٹ چھانٹ مین جو چورا نکلتا ہے وہ جداگانہ فروخت ہوتا ہے - اور دراصل لکھنؤ مین وہ چکنی ڈلی کی پانچوین قسم بن گیا ہے - پھر اُس کی بھی دو تین قسمین ہوگئی ہین - اس لیے کہ دورخی اور یک رُخی ڈلیون مین سے جو چورا نکلتا ہے وہ الگ رہتا ہے - اور دونون کی لطافت - نرمی - اور مزے مین نہایت فرق ہوتا ہے - اور اسی وجہ سے اُن کی قیمتون مین بھی زمین و آسمان کا فرق رہا کرتا ہے - الغرض چکنی ڈلی اگرچہ اس قدر زیادہ لکھنؤ والون کے شوق کی چیز نہین ہے - مگر اسکی اصلاح بھی اُنھون نے اس قدر کی جو کسی جگہ نہین ہوسکی تھی -

اب چونکہ پان کے اجزا ختم ہوگئے لہذا ہم اُسکے ظروف و آلات کی طرف توجہ کرتے ہین - پانون کا سامان رکھنے کی سب سے اہم چیز یا یون کہیے کہ پانون

کی گلوریون مین جو قوت برقی کی سی دخلاقی اور معشوقانہ کشش ہوتی ہے اُسی بیٹری پاندان ہے - اگلے زمانے مین خصوصاً دہلی مین پٹاری ہوا کرتی تھی جو گول اور مربع یا ہشت پہل سب قطعون کی ہوتی ہین - اور غالباً دہلی ہی سے حیدرآباد مین پٹاری کا پاندان گئے - جن کی نقل وہ ٹین اور شیشے کے مربع پاندان ہوتے ہین جو حیدرآباد کی شادیون مین کمال فیاضی سے چونا - کتھا - ڈلیان - چکنی ڈلیان - الائچیان - لونگین اور پان وغیرہ رکھ کر گھرانون مین تقسیم کیے جاتے ہین - بہرحال پُرانے پاندان ایسی پٹاریان تھین - اور انھین پٹاریون کو ساتھ لیے ہوے دو ڈیڑھ صدیون پیشتر کی محترم خاتونین دہلی سے لکھنؤ مین آئی تھین - یہان جب تک دہلی کی تقلید رہی وہی پٹاریان رہین - مگر جس دن سے لکھنؤ والون نے اپنی وضع - معاشرت اور زبان مین اپنی تراش خراش شروع کی اُس روز سے پاندانون کا نقشہ بھی بدلنا شروع ہوگیا - پہلے تو پان رکھنے کے لیے فقط تانبے کی قلعی دار گول پٹاریان اختیار کی گئین - پھر اُنکے ڈھکنے مین بلندی اور گولائی پیدا ہونا شروع ہوئی - چند روز مین اُن کی قطع ایک چوڑے نقرئی قبّے کی سی ہوگئی - جس پر چوٹی کی جگہ گرفت کے لیے ایک لمبوترا کڑا لگا دیا جاتا ہے - کڑے کے دونون سرے کنڈھون مین پھنسا دیے جاتے ہین - چنانچہ بجاے اوپر کی طرف قائم رہنے کے وہ ادھر اُدھر پڑا رہتا ہے - اس پاندان کے اندر کتھے چونے کی کُلھیان ہوتی ہین - جن کی قطع بعینہ چھوٹی پتیلیون کی سی ہوتی ہے - انھین کلھیون کے سلسلے مین تین برابر کی بڑی ڈبیان ہوتی ہین - جن مین سے بعض مین مسلّم اور بعض مین کٹی ہوئی ڈلیان اور چکنی ڈلیان رکھی جاتی ہین - یہ تینون ڈبیان اور دونون کلھیان برابر ایک حلقے مین جمی رہتی ہین اور اُنکے بیچ مین یعنی مرکز کے مقام پر جو جگہ چھوٹتی ہے اُس مین ایک اور چھوٹی ڈبیا رکھ دی جاتی ہے - جس مین علی العموم الائچیان یا لونگین رکھی جاتی ہین - ڈبیون کے ڈھکنے کسے ہوے ہوتے ہین - خود بخود نہین کھُل سکتے بلکہ کھُلنے مین تھوڑا البتہ زور مانگتے ہین - مگر کلھیون کے ڈھکنے تھالی نما ہوتے ہین جو اُن کے منہ پر رکھ دیے جاتے ہین - کتھے چونے کی کلھیون مین کتھا چونا لگانے کی چمچیان ہوتی ہین جن کے سرون پر کبھی تو مور بنا دیا جاتا ہے اور کبھی سادی رہتی ہین - ان کلھیون کے اوپر

ایک بڑی پوری پاندان بھر کی تھالی ہوتی ہے جس مین پان کپڑے مین لپیٹ کر رکھ دیے جاتے ہین - اگلے دنون ایک اور پان کی قطع کا جدا گانہ ڈھکنے دار ظرف ہوتا تھا - جس مین پان رکھے جاتے - وہ ناگردان کہلاتا تھا - مگر تجربے نے اُسکو غیر ضروری اور ناقص ثابت کیا - اس لیے کہ اُس مین بند کر دینے سے ہوا نہ لگتی اور پان خراب ہو جاتے - اسی وجہ سے ناگردان اگرچہ بعض بعض پُرانے پاندانون مین اب بھی نظر آ جاتا ہے مگر در اصل اُس کا رواج بالکل چھوٹ گیا - اور عنقریب عنقا ہو جائے گا -

چند روز مین پاندان عورتون کو صندوق - خزانے - اور کیش بکس کا کام دینے لگا اور عورتون کے لیے سچ یہ ہے کہ وہ ہندوستان مین عمرو عیار کی زنبیل تھا - اس ضرورت سے وہ وسعت اور جسم مین بڑھنا شروع ہوا - یہان تک کہ دس دس سیر اور بیس بیس سیر کے پاندان بننے لگے - اور پھر سخت ضروری تھا کہ جہان جانے مین ہر جگہ وہ ساتھ رہے - اس لیے کہ بمصداق "شملہ بمقدار علم" جتنا بڑا پاندان ہوتا تھا اُتنی ہی بڑی بیگم صاحب کی حیثیت و وجاہت سمجھی جاتی تھی - نتیجہ یہ ہوا کہ ڈولی مین ساری جگہ پاندان لے لیا کرتا - اور بیگم صاحب کو بڑی مشکلون سے دبنے اور سمٹنے کے بعد بیٹھنے کو جگہ ملتی - بہر تقدیر پاندان وزن اور قامت مین روز افزون ترقی کرتے جاتے تھے کہ یکایک اختصار پسندی نے نئی طرح کے چھوٹے - بلند - گنبد نما - اور کلس دار پاندان ایجاد کیے جو پہلے تو آرام دان کہلاتے تھے مگر اب عموماً حسن دان کے نام سے یاد کیے جاتے ہین - اُن مین اندر تو وہی چیزین ہوتی ہین جو پاندان مین ہین - مگر بیرونی قطع ایک کلس دار خوشنما گنبد کی سی ہوتی ہے - اور بجائے کڑے کے اُسی کلس یا چوٹی کو پکڑ کے اُٹھایا جاتا ہے - یہ حسن دان عموماً پسند کیے گئے - لکھنؤ مین بھی اور دیگر بلاد مین بھی اُن کی مانگ بڑھی - لکھنؤ مین پہلے پہل اُن کو مردون نے اختیار کیا - یا اُن لوگون نے جو نمایش اور دکھاوے کو پسند نہین کرتے ہین - مگر چند روز مین عام ہو گیا - اور گو کہ اگلی وضع کے پاندان نہین مٹے مگر اب زیادہ رواج حسن دانون ہی کا ہے - اور جن گھرون مین پاندان باقی بھی ہین تو اتنے بڑے نہین بلکہ چھوٹے - اب مرادآباد مین بھی ایسے ہی لکھنؤ کی وضع کے

حسن دان بننے لگے ہین - گروہ زیادہ پھیلے ہوتے ہین اور اُس قدر خوبصورت نہین ہوتے جیسے کہ لکھنؤ مین بنائے جاتے ہین - لکھنؤ کے حسن دانون کا تناسب ہی ایک چیز ہے جو یہان کے ساتھ مخصوص ہے - اور کسی جگہ کے کاریگرون سے اُس تناسب کا قائم رہنا قریب قریب غیر ممکن ہے -

پاندان کے بعد "خاصدان" ہے - یہ وہ ظرف ہے جس مین رکھ کے گلوریان محفل یا صحبت احباب مین لائی جاتی ہین - دہلی مین یہ کام ایک کھلی ہوئی تھالی دیتی ہے جس مین ایک طرف کتری ہوئی ڈلیان رکھ دی جاتی ہین - اور دوسری طرف آدھے آدھے پان چونا کتھا لگا کر اور دوہرا کے یعنی موڑ کر رکھ دیے جاتے ہین - اور چونکہ اب بھی وہان یہی تھالی مروج ہے اس لیے امید ہے کہ اگلے زمانے مین بھی پانون کے صحبت مین لانے کا یہی طریقہ ہوگا - مگر لکھنؤ مین کم از کم دو پانون کی گلوریان بنائی جاتی ہین - جو پہلے تو سنگھاڑے کی وضع کی خوب گٹھی ہوئی ہوتی تھین - اب عموماً بیڑے ہوتے ہین - اور ان کی قطع ایسی ہوتی ہے جیسی کہ بوتلون مین لگانے کے لیے کاغذ کی ڈانٹ بنائی جاتی ہے - پھر اُنکے قائم رکھنے کے لیے کیلین لگا دی جاتی ہین - پہلے لونگین لگا دی جاتی تھین - بعد ازان زنجیرون کا ایک لچھا ایجاد ہوا - لچھے کی صورت یہ ہے کہ چاندی کی ایک چھوٹی ڈبیا یا کیری نما عطردان مین چارون طرف بہت سی زنجیرین لگا دی جاتی ہین جن مین کیلین لگی ہوتی ہین - یہ پورا لچھا مع پانون کے خاصدان مین رکھ دیا جاتا ہے - مگر اس کو تطویل خیال کر کے یہ رواج ہوگیا کہ گلوریون مین لوہے کی کیلین لگا دی جایا کرین - مگر اب سب سے اچھا طریقہ یہ ایجاد ہوا ہے کہ گلوری کے اوپر پان ہی کا ایک غلاف چڑھا دیا جاتا ہے جو اُسکو کھلنے نہین دیتا -

بہرحال ان گلوریون کے لیے صرف تھالی مناسب نہ تھی - اُسی لیے اُس تھالی پر ایک گنبد نما کلس دار ڈھکنا ایجاد کیا گیا جسکو تھالی پکڑ لیا کرتی - ڈھکنے نے خاصدان کی صورت بھی چھوٹے حسن دان کی سی کر دی -

پانون کی گلوریان رکھنے کے لیے اگرچہ خاصدان میں بہت ترقی کی گئی۔ اُسکی خوشنمائی و نظر فریبی مین کوئی دقیقہ نہین اُٹھا رکھا گیا۔ مگر جب یہ نظر آیا کہ گرمیون کے موسم مین تانبے کے قلعی کیے ہوے خاصدان جل اُٹھتے ہین۔ اور اُن مین رکھنے سے پُرتکلف گلوریون کے خشک ہونے کے علاوہ وہ ایسی گرم ہو جاتی ہین کہ کھانے مین بجاے تفریح کے تکلیف ہوتی ہے۔ اور بعوض تسکین کے منہ خشک ہو جاتا ہے تو اُس موسم مین اُنکے رکھنے کے لیے مٹی کی کوری ہانڈیان اختیار کی گئین جن مین پان ٹھنڈے رہتے ہین۔ اُن کی تازگی و فرحت بخشی مین اور ترقی ہو جاتی ہے۔ اور اُن مین نہایت ہی سوندھاپن پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ کاغذی ہانڈیان لکھنؤ مین ایسی سبک۔ خوشنما اور ورق کی سی باریک بنتی ہین کہ اور کسی جگہ نہین بن سکتین جب اُن کو پانی مین بھگو کے اور اُن مین گلوریان رکھ کے سامنے لائی جاتی ہین تو پان تو بعد کھایا جائے گا اُن کی صورت دیکھتے ہی آنکھون مین تازگی آجاتی ہے۔

پھر اُمرا کے تکلف نے اس خیال سے کہ انکو بار بار بھگونا دشوار ہے اور جب تک پانی مین تر نہ ہون اُن مین لطف نہین آ سکتا۔ اُن پر کپڑا منڈھا تاکہ کپڑا اُنکو تر رکھے۔ اور معمولی سفید کپڑا چونکہ جلد ہی میلا ہو جاتا ہے اور گلوریان رکھنے کی وجہ سے اُس مین جا بجا سرخ دھبے پڑ جاتے ہین اس لیے بجاے سفید کے اُن پر سرخ ٹول منڈھا گیا جو نہ جلدی میلا ہوتا ہے اور نہ پان کے دھبے اُسکو بدنما کر سکتے ہین۔ زیادہ آراستگی کے لیے ان ہانڈیون مین ٹول پر باریک روپہلی دھنک سے پھانکین سی بنا دی جاتی ہین۔ جن چیزون نے پان کی ہانڈیون کو بنا سنوار کے دولھن بنا دیا۔

تانبے کے خاصدان بھی عموماً غلاف مین بندھے رہتے ہین۔ اور اسی طرح کے غلافون کا رواج پاندانون اور حسن دانون کے متعلق بھی ہے۔ جو بڑے اہتمام سے حسب درجہ و حالت پُرتکلف بنائے جاتے ہین جن مین فقط حفاظت ہی نہین آرایش بھی ملحوظ خاطر ہوتی ہے۔

ایسا ہی ٹول دھنک کے ساتھ صراحیون پر بھی منڈھا جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے

صراحیوں میں پانی خوب ٹھنڈا رہتا ہے۔ اور اُنکی صورت دیکھتے ہی بے پیاس کے پانی پی لینے کو جی چاہتا ہے۔

پان کھانے والوں کو اکثر پیک تھوکنے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ جس کے لیے بار بار اُٹھنا زحمت سے خالی نہیں۔ اور پھر جن کمروں میں پُرتکلف فرش بچھا ہو تھوکنے کو جگہ مشکل سے اور دُور جاکے ملتی ہے۔ اور جگہ ملنے بھی تو پیک کے دھبوں سے مکان خراب ہوتا ہے۔ اس لیے پان ہی کے سلسلے میں ایک اور ظرف کی ضرورت پیش آئی جو تھوکنے کے لیے ہو۔ یہ ظرف اُگالدان کہلاتا ہے۔ اگالدان کوئی نئی چیز نہیں جس کو لکھنؤ کے ساتھ خصوصیت ہو۔ پہلے اُگالدان غالباً دہلی میں ایجاد ہوے اور وہ بعینہٖ لکھنؤ میں منتقل ہو آئے۔ اُن کی قطع یہ تھی کہ نیچے گول پینڈا اُسکے اوپر ایک گول لٹو پھر اُسکے اوپر کنول نما دہانہ۔ یہ اُگالدان تانبے پیتل اور جست کے ہر جگہ بننے لگے۔ بیدر میں اُن پر وہان کا بےنظیر بدری کا کام یا لکھنؤ میں تانبے پر نقاشی کا کام بنایا گیا۔ پھر مرادآباد میں بنے اور اُن پر وہان کی نفیس نقاشی ہوئی۔ لکھنؤ میں پھر مٹی کے اُگالدان اُسی قطع کے بننے لگے۔

مگر اُن میں خرابی یہ تھی کہ اُن کے نیچے کا حصہ ہلکا اور اوپر کا زیادہ پھیلاؤ کی وجہ سے وزنی ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اکثر بے احتیاطی یا غفلت میں گر جاتے۔ اور فرش خراب ہوتا۔ اس عیب کے دور کرنے کے لیے جےپور۔ حیدرآباد۔ اور اُسکے بعد مرادآباد میں ایک دوسری قطع کے اُگالدان بننے لگے جو شاید دہلی ہی کے ایجاد ہوں۔ اُنکی قطع کہاروں کی مٹرک یا مداری کی ڈُگڈُگی کی سی ہوتی ہے۔ اور لکھنؤ میں بھی بہت سے لوگوں کو اس قسم کے اُگالدان اختیار کر لینا پڑے۔ اگرچہ یہان ابھی تک پُرانی وضع چھوٹی نہیں اور اُسی وضع کے بہت بڑے بڑے اُگالدان اب بھی بنتے ہیں مگر اب بہت سے گھروں میں اس نئی وضع کے بھی موجود ہیں۔ مگر سچ یہ ہے کہ اُگالدان کی ایجاد و ترقی میں لکھنؤ کو کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ اگرچہ اُنکا رواج لکھنؤ میں ہندوستان کے تمام شہروں سے زیادہ ہے۔

اب ایک نئی قطع کے بیٹھے اور پھیلے ہوے انگریزی اگالدان بھی آتے ہیں جو چینی اور تامچینی کے ہوتے ہیں۔ مگر وہ غالباً چُرٹ پینے وقت تھوکنے کے لیے ہیں۔ پان

کی پیک تھوکنے کے لیے بالکل موزون نہین ہین -

خاصدان کے بعد اُمرا اور خوش باش لوگون کے ہمراہی سامان مین پانی کی لوٹیا بھی ہے جو خدمتگارون کے پاس رہا کرتی ہے - علی العموم یہ تانبے کی اوسط درجے کی سادی یا نقشی لوٹیان ہوا کرتی ہین جن لوگون کو خدا نے استطاعت دی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی ہے کہ امارت و دولتمندی نے اُن کو پابندی شرع سے آزاد کر دیا ہے وہ چاندی کی لوٹیان ساتھ رکھتے ہین -

لوٹیا پُرانی ہندوون کے عہد کی چیز ہے جو ایک بے ٹونٹی کا گول ظرف ہوتا تھا جس کا مُنہ پیٹ سے چھوٹا ہوتا - اور چونکہ کنوئین سے پانی بھرنے کی اکثر ضرورت پیش آیا کرتی اس لیے ہر مسافر کے ساتھ سفر مین لوٹیا ڈوری ضرور رہا کرتی - اور دیہات کے ہندوؤن اور نیز وہان کے ادنے طبقے کے مسلمانون مین آج تک اُسی اگلی شان مین اس کا رواج ہے - مسلمانون نے اپنے زمانے مین اُس لوٹیا مین ٹونٹی لگا دی تاکہ پانی کے استعمال مین آسانی ہو -

مین نہین جانتا کہ دہلی کے امرا مین بھی یہ رواج تھا - اور جن لوگون کے ساتھ خدمتگار رہا کرتے تو اُن کے پاس لوٹیا بھی ضرور ہوتی جو پانی پینے - کُلّی کرنے اور دیگر ضرورتون مین کام آیا کرتی - مگر لوٹیا کی موجودہ قطع اور اُسکی خوشنمائی مین لکھنؤ کو بڑا دخل ہے - جس کا حال ہم تانبے کے برتنون کے سلسلے مین بیان کرین گے -

گرمیون مین رنگین کپڑے کا منڈھا ہوا چھالردار پنکھا بھی خدمتگارون کے پاس رہتا - اور بعد کے زمانے مین چھتری بھی لازم ہو گئی - جن کو دھوپ مین نوکر آقا کے سر پر لگائے رہتا -

گھرون کی اندرونی ضرورتون مین ہاتھ دھونے کے لیے سلفچی - آفتابہ - اور چونکہ صابون کا رواج نہ تھا اس لیے بیسن دانی بھی ضروری چیزین تھین - سلفچی - آفتابہ ہندوستان کے دولتمند گھرانون کی پُرانی چیزین ہین جو دہلی مین خدا جانے کب سے مروج تھین - اور اپنی قدیم وضع و شان سے لکھنؤ مین آ گئین - یہان سلفچی تو وہی رہی اور گو اب اُس کی جگہ تسلے کا زیادہ رواج ہو گیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ سلفچی کا بدل نہین ہو سکتا - سلفچی ایک گول پیٹ کا ظرف ہے جس کا منہ ذرا چھوٹا کر کے کگرین ایک

اُتھلے طشت کی وضع میں بہت زیادہ پھیلی ہوتی ہیں - اور منہ پر ایک پردے کی جالی رکھ دی جاتی ہے جس میں سے ہاتھ دھونے میں سب پانی گر جاتا ہے - اُس پردے کو جب چاہیں اُٹھا کر اُسکو خوب اچھی طرح صاف کر سکتے ہیں - اس جالی کے اوپر تھوڑی گھانس ڈال دی جاتی ہے کہ پانی کے گرنے میں چھینٹیں نہ اُڑیں - اس میں بہت بڑی خوبی اور نفاست یہ ہے کہ میلا پانی جس کی صورت کریہ ہوتی ہے نظر کے سامنے نہیں رہتا - اور جن کے مزاج میں نفاست ہے اُن کو تکلیف ہوتی ہے - مگر آفتابے کی جگہ لکھنؤ میں لوٹا رائج ہو گیا - دراصل آفتابہ ہی پُرانے زمانے کا لوٹا تھا - جس پر لکھنؤ کے مذاق نے تصرف کر کے موجودہ لوٹے کی سڈول شکل پیدا کی - پُرانا لوٹا جو آفتابہ کہلاتا اُس کی شکل یہ تھی کہ تانبے کا ایک مخروطی شکل کا ظرف ہوتا جس میں پیٹ اور گلے کا کچھ امتیاز نہ تھا - پیندے کے پاس جتنا دور ہوتا وہ اوپر کی طرف تدریجی گھٹتا چلا جاتا - آخر میں وہی گلا ہو جاتا - یہاں تک کہ کنارے موڑ کے مُنہ بنا دیا جاتا اور ایک جانب اُس میں خمدار ٹونٹی لگا دی جاتی - اس شکل کے لوٹے حیدرآباد میں آج بھی مل جاتے ہیں جو اپنی قدامت اور ہمارے لوٹوں کے نقش اولین کا ثبوت دیتے ہیں - اُن کی شکل مصر و شام کے گلی ظروف آب یا انگریزوں کے یہاں منہ دھونے کی میز پر جو چینی کا جگ رہتا ہے اُس کی سی ہوتی - اور اسی سے خیال ہوتا ہے کہ مسلمان اس کو عرب و ایران سے اپنے ساتھ لائے ہوں گے - چند روز بعد ہندی تمدن کے اثر نے اُس میں پہلا تصرف یہ کیا کہ پیٹ گول بن کر گردن سے جدا اور متمائز ہو گیا - مگر اصلیت کی قربت کے باعث لمبوترا پن باقی تھا - یعنی عرض اور پھیلاؤ بلندی کی مناسبت سے نہ تھا - اُس وقت تک پیٹ کی گولائی بھی گھڑے کی مثل نہیں بلکہ بیضاوی تھی - یہی شکل اُس آفتابے کی ہے جس کا ذکر اُردو کی اگلی مثنویوں اور قصے کہانیوں میں ہے - لکھنؤ میں یہ ہوا کہ پیٹ بیضاوی سے گروی ہو گیا - اور جتنی بلندی ہوتی اُسی کی مناسبت سے اُس کا دور اور پھیلاؤ بھی بڑھ گیا - گلوں میں ایک موزوں ڈھلاؤ ہو گیا اور ٹونٹی بھی ابتداءً وسیع اور نوک کے پاس تنگ خمدار اور بہت ہی خوشنما ہو گئی - یہ لکھنؤ کا موجودہ لوٹا ہے - جس سے زیادہ خوشنما اور سڈول لوٹے ہندوستان

کے کسی شہر مین نہین بنتے۔ اور ہر جگہ کے شوقین فرمائشین کر کر کے لکھنؤ سے منگوایا کرتے ہین۔ جو تناسب لوٹون مین یہان پیدا ہو گیا ہے چھوٹی لٹیا سے لیکر بڑے سے بڑے لوٹے تک سب مین نظر آتا ہے۔

اسی قسم کا مناسب تصرف تانبے کے تمام برتنون مین ہوا ہے جس کو ہم آیندہ بیان کرین گے۔ اس لیے کہ اس محل پر اُسکے بتانے کا موقع نہین ہے۔

بیسن دانی دراصل تانبے کی ایک بے ٹونٹی کی لوٹیا ہوتی ہے جس مین بیسن بھرا رہتا ہے۔ عموماً کھانے کے بعد ہ ہئیت چھڑانے کے لیے اُس مین سے بیسن لیکر لگا جاتا ہے اور پھر پانی سے دھو ڈالا جاتا ہے۔ بعض مگر بہت ہی کم لوگ ایسے ہین جو بیسن کی جگہ بیسن دانی مین اُبٹنا یا کھلی رکھتے ہین۔ اس لیے کہ بیسن کھانے کی چیز ہے جس کو ہاتھ دھونے مین ضائع کرنا اُنکے خیال مین ناجائز یا نامناسب ہے۔ مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ اس لیے کہ اُبٹنا شادیون کے سوا اور کسی موقع پر نہین بنتا۔ اور کھلی سے ہاتھ مین اُسکی تیز بو آنے لگتی ہے۔

(۵۳)

معاشرت کے بہت سے سامان ضروری اور آداب نشست و برخاست کو ہم اس سے پیشتر بیان کر چکے ہین مگر ابھی ہم کو یہان کے شرفا کی باہر کی آمدورفت کی وضع و شان بتانے کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان کے تمام شہرون کی طرح یہان بھی انگریزیت اس قدر غالب آ گئی ہے کہ ایشیا کے آخری تمدن مین جو وضع پیدا ہوئی تھی بالکل مٹ گئی۔ مگر ہم کو اس موقع پر وہی چیز بیان کرنا ہے جو مٹ چکی ہے یا مٹنے کے قریب ہے۔ لہذا ہم آج سے ساٹھ ستر برس پیشتر سے بھی پہلے زمانے مین نکلے چلتے ہین۔ اور اُس زمانے کی تصویرین ناظرین کے پیش نظر کرتے ہین جو اب کہین نہین نظر آ سکتین۔

آج کل کی سی عمدہ موٹرون اور لمبی چوڑی فٹنون اور لینڈو گاڑیون کے نہ ہونے سے اور نیز حال کے اصول حفظ صحت کے پیش نظر نہ ہونے کے باعث اُن دنون آج کل کی سی لمبی چوڑی اور وسیع و کشادہ سڑکین نہ تھین۔ بلکہ تنگ گذرگاہین تھین جن مین ہاتھی۔ گھوڑے۔ اونٹ۔ ہوادار۔ بوچے۔ فینسین۔ میانے۔

سکھپالین - ڈولیان - رتھین - بہلین آدمیون کی بھیڑ مین سے ہٹو بچو کرتی ہوئی ہر وقت گذرا کرتی تھین - کیسا ہی مرجع عام بازار اور کیسی ہی پسندیدہ سیرگاہ ہو سب کی حالت بلا استثناء یہی تھی -

ایک اونٹ تو نہین جو فوجی شتر سوارون - نامہ بر قاصدون یا باربرداری کے لیے مخصوص تھے - ہاتی اور تمام سواریان شرفا و رؤسا مین حسب حالت و حیثیت مروج تھین - اعلی طبقے کے شاہزادے اور نواب یا امیرون کے درجے کے اور اُمرا ہوادارون اور بوچون پر سوار ہو کے نکلتے - ہوادار - تمام کی وضع کی ایک کُھلی ڈولی تھی جس کے پیچھے چمڑے کا ٹپ ہوتا - اور لوہے کی کمانیون کے ذریعے سے کھولا یا بند کیا جا سکتا - ٹھنڈے اوقات مین جب ٹپ گرا دیا جاتا تو ہر طرف کی فضا کھلی رہتی - آگے پیچھے اُس مین فنس کے سے ڈنڈے لگے ہوتے - چار کہار اُس کو کاندھون پر اُٹھا کے لیجاتے - اور جو شخص سوار ہوتا وہ نہایت وقار و تمکنت سے بازار کی سیر کرتا - ہر چیز کو دیکھتا بھالتا - اور شناساؤن سے صاحب سلامت کرتا ہوا جاتا - ہوادار کی قطع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خاص انگریزون کی ایجاد کی ہوئی چیز تھی - ہندوستان مین آکر اُنھون نے اپنے مذاق کے مطابق اور اپنی جدت طرازی سے اُس کو ایجاد کیا - اور اپنی نفاست - خوشنمائی - اور صفائی کی بدولت رؤسائے ہند کو بہت پسند آیا - اب اُس کا رواج بالکل اُٹھ گیا - اگرچہ بعض پُرانے رؤسا کے یہان چند ہوادار اب بھی پڑے ہوے ہین جو رؤسا کی معمولی آمد و رفت مین تو نہین مگر دولتمند ہندوؤن کی براتون مین وہ کبھی کبھی نظر آجایا کرتے ہین -

بوچہ اُس سے زیادہ باوقار اور متین سواری تھی - اُسکی قطع آج کل کی بروہم یا ڈھا گاڑیون کی سی ہوتی - جس مین پہیون کے بجاے پائے ہوتے - اور آگے پیچھے فنس کے ایسے دو دو ڈنڈے ہوتے - اور کم از کم آٹھ اور اکثر سولہ سولہ کہار اُس کو اُٹھا کے لے چلتے - اس لیے کہ وہ کہارون کے اُٹھانے کی تمام سواریون سے زیادہ بھاری ہوتا - اس سواری پر شاید کبھی اور امرا بھی سوار ہوے ہون مگر مین نے فقط واجد علی شاہ کو کلکتے مین اس پر سوار ہوتے دیکھا -

اور اُن کے سوا یہ سواری مین نے کہین اور کسی کے پاس نہین دیکھی۔ بادشاہ اپنے باغون۔ محلون۔ اور کوٹھیون مین اُسی پر سوار ہو کے پھرا کرتے۔ اور گرد جلوس خدام کے علاوہ معزز ارکان دولت اور حضور رس مصاحبین پا پیادہ ساتھ چلتے مگر یہ بھی یقیناً انگریزون کی ایجاد تھا۔ جو اُس عہد کی انگریزی گاڑیون سے اخذ کر کے کہارون کے اُٹھانے کے قابل بنا لیا گیا۔

سُکھپال اُن دنون عورتون کی نہایت معزز سواری تھی۔ جو خالص ہندوستانی چیز اور ہندی مذاق کے تکلفات کا مکمل نمونہ تھی۔ یہ ایک سرخ گنبد نما ڈولی تھی۔ ایک لمبے چوڑے کھٹولے پر ایک شاندار لال بُرج سا بنا دیا جاتا۔ جس مین سونے چاندی کے کلس لگے ہوتے۔ چارون طرف پردے لٹکتے ہوتے۔ اس مین بھی آگے پیچھے دو دو یا ایک ایک ڈنڈے ہوتے اور بہت سے کہار اُنکو اُٹھا کے لے چلتے۔ یہ سواری عالی مرتبہ بیگمات اور محل شاہی کی خاتونون کے لیے خاص تھی۔

رتھ اسی وضع کی پہیون دار گاڑی تھی جس مین بیل جوت دیے جاتے۔ رتھین دیہات کے تعلقدارون اور معزز زمیندارون کے یہان اور دیسی ریاستون مین اب بھی موجود ہین۔ مگر روز بروز بیکار ہوتی جاتی ہین۔ اور اُن کا رواج اُٹھتا جاتا ہے۔ لکھنؤ مین خاص شاہی محلات کی ضرورت کے لیے اُن دنون ہزارون رتھین تھین۔ شجاع الدولہ کی بیوی بہو بیگم صاحبہ نواب آصف الدولہ کے عہد مین جب اپنی بیوگی کی زندگی ایک حکمران ملکہ کی شان سے فیض آباد مین بسر کرتی تھین تو اکیلی اُن کی سرکار مین آٹھ نو سو رتھین تھین۔ اور قدیم الایام مین جب شاہان دہلی اپنی مملکت مین دور دراز کے سفر کیا کرتے تھے تو اُن کے محلات عالیات انھین رتھون پر سوار ہو کے ساتھ جاتے۔

بہل بیلون کی عام گاڑی تھی جس مین ایک کھٹولے کو دو پہیون پر قائم کرتے۔ پھر اُس پر چار ڈنڈے کھڑے کر کے ایک چھتری لگا دیتے۔ اور اُس پر پردے کے لیے غلاف ڈال دیا جاتا۔ اُس مین اکثر مرد اور عورتین سفر کرتین۔ اُن دنون متوسط طبقے کے دیہاتیون اور شہریون دونون کے لیے سفر کا ذریعہ یہی

سواری تھی۔ بہلین دیہاتون مین اب بھی بکثرت موجود ہین۔ مگر اُن کی ضرورت روز بروز گھٹتی جاتی ہے اور عنقریب ایک زمانہ ایسا آنے والا ہے کہ یہ سواری عنقا ہو جائے گی۔

ان کے سوا تمام سواریون کو لوگ خود ہی جانتے ہین۔ ہمین ان کی شکل وصورت بتانے کی ضرورت نہین ہے۔

بہرحال یہ سب سواریان شہر کے تمام راستون اور گلی کوچون مین گذرتی نظر آتین۔ زیادہ تر لوگ فنسون پر سوار ہوتے۔ علما۔ اطبا۔ امرا۔ اور خوش باش جن کو خدا استطاعت دیتا چار کہار نوکر رکھ لیتے جو خدمتگاری بھی کرتے اور سواری کا بھی کام دیتے۔ جن لوگون مین ذرا بھی بانکپن ہوتا یا سپہگرانہ شان دکھانا چاہتے جو اُن دنون تمام اہل شہر مین عام تھی وہ گھوڑے پر سوار ہو کے نکلتے۔ جو چاندی کے زیور اور کارچوبی سازویراق سے دولھن بنا دیے جاتے۔ اعلی درجے کے معززین ہاتھیون پر بیٹھ کے آمدورفت کرتے۔ جو باوجود اس قدوقامت کے تمام گلی کوچون مین بلا تکلف گذر جاتے۔ ہاتھیون پر سادی بانات یا کارچوبی جھولین ہوتین اور اُن پر کھلے ہودے یا سایہ دار بُرج نما عماریان کسی جاتین۔

زنانی سواریان جو سکھپالون اور فنسون پر ہوتین وہ بڑے تکلف اور شان سے نکلتین۔ فنس پر سرخ غلاف پڑے ہوتے۔ جن پر کبھی گوٹا۔ لچکا بھی ٹانک دیا جاتا۔ کہار سرخ بانات کے چغے پہنے ہوتے۔ سرون پر سرخ گردار پگڑیان ہوتین جن کی گگرون پر چاندی کی مچھلیان ٹکی رہتین۔ مچھلی ہندوستان مین بہترین شگون مانی گئی ہے۔ رخصت کرتے وقت یا کسی کو کسی اہم کام کے لیے جاتے وقت آج بھی عورتون کی زبان سے نکل جاتا ہے "دہی مچھلی" غالباً اسکو نجوم سے تعلق ہو۔ اور یہ بھی نجومیون ہی کا ٹٹکا معلوم ہوتا ہے کہ چاندی کی مچھلیان بنوا کر کہارون کی پگڑی مین ٹانک دی جاتین جو آگے رہتے ہین تاکہ کہین جاتے وقت مچھلیان ہر وقت پیش نظر رہین۔

زنانی فنس کے ساتھ ساتھ ایک کہاری چھتلے کا کونا پکڑے دوڑتی جاتی۔ ان کہاریون کی وضع بھی خاص قسم کی تھی۔ سب سے بڑی پہچان یہ تھی کہ لہنگے مین

اتنی چوڑی گوٹ ہوتی ہے کہ اُس کا آدھے سے زیادہ حصہ فقط گوٹ کا ہوا کرتا۔

ان سواریون مین سے شہر مین اب فقط فنس باقی رہ گئی ہے۔ یا کبھی کبھی کوئی رئیس گھوڑے یا ہاتھی پر دکھائی دے جاتے ہین۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ باہر نکلنے مین شرفا کی کیا وضع ہوتی تھی۔ لباس کو ہم بیان کر چکے ہین۔ مگر ان کی تصویر دکھانے کے لیے ہمین پھر ایک حد تک اُن کی وضع قطع بتانے کی ضرورت ہے۔ سواری کی شان کے متعلق مین نے جو کچھ بیان کیا اُس مین بجز نوچے اور ہوادار کے اور تمام چیزین وہی ہین جو دہلی سے آئین۔ لکھنؤ کو اُن سے کوئی خصوصیت نہین۔ دراصل یہ دہلی ہی کی شان تھی جو اپنی آخری جھلک بڑے کر وفر کے ساتھ لکھنؤ مین دکھا کے غائب ہو گئی۔

لیکن لباس مین لکھنؤ دہلی سے جدا ہو گیا۔ اب گھر مین کرتا یا قمیص اُتار کے بیٹھنا معیوب ہو گیا ہے مگر اُن دنون یہان گھر کا لباس سچ پوچھیے تو ایک غرقی تھی۔ یہان کا دربار شیعہ تھا۔ اور ہر چیز یہان تشیع ہی کے سانچے مین ڈھلتی تھی۔ فقہ امامیہ کی رو سے رانون کے کھلے رہنے مین مضائقہ نہین۔ بخلاف حنفیون کے کہ اُن کے مذہب مین ناف سے لے کر گھٹنون تک جس قدر حصہ جسم ہے ستر مین داخل ہے اُس کا چھپانا ضروری ہے۔ اور اسی بنا پر دہلی مین عموماً تہمد کی وضع کی لنگی باندھی جاتی جس مین گھٹنون کے نیچے تک جسم ڈھکا رہتا ہے۔ یہان کے تمدن مین اُس کی ضرورت نہین باقی رہی۔ اور یہان کی لنگی فقط ایک پتلی سی غرقی یا جانگھیا رہ گئی جس مین ناف سے کنج ران تک تو جسم ڈھنک جاتا ہے باقی سب جسم کھلا رہتا ہے۔ لوگون مین مہذب اور مرد آدمیون کے ننگے رہنے کا خیال تو بڑھا ہوا تھا مگر گھر مین بجز ایک غرقی کے جسم پر ایک دھاگا بھی نہ رہتا۔ اور یہ بات اس قدر عام ہو گئی تھی کہ اسی برہنگی کی وضع سے اپنے گھر پر کسی سے ملنے مین بھی مضائقہ نہ سمجھا جاتا۔ مگر یہی حضرات جب باہر نکلتے تو شان ہی اور ہوتی۔ قالب پر چڑھی چوگوشیہ ٹوپی۔ اُجلا صاف اور براق انگرکھا جو معلوم ہوتا کہ ابھی ابھی دھوبی کے گھر سے آیا ہے۔ اور اسی وقت گوٹ اور آستینین چُنی گئی ہین۔ گلبدن یا تین سکھ کا عرض کا پائجامہ۔ کاندھے پر مثلث رومال۔ ہاتھ مین دستی رومال اور چھڑی۔

اور پاؤں میں لکھنؤ کا بنا ہوا سبک بھی خورد نوکا جوتا - باہر نکلنے میں ہر وضیع و شریف کی یہی وضع تھی۔

بہت سے لوگوں کو باہر نکلنے میں اس وضع و لباس کا اس قدر لحاظ تھا کہ کبھی اُن کے کپڑے میلے نہ نظر آتے۔ معلوم ہوتا کہ اسی وقت دھوبی کے یہاں سے آئے ہیں - حالانکہ مہینوں اُنکے دُھلنے کی نوبت نہ آتی - اور ہوتا یہ کہ دو گھڑی دن رہے گھر سے نکلے - خراماں خراماں ہر چیز سے بچتے اور اپنے سائے تک سے بھڑکتے ہوئے چوک کی سیر کی - دو گھڑی رات گئے واپس آگئے۔ اور آتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ٹوپی قالب پر رکھ کے ایک کپڑے سے اُڑھا دی - انگرکھے - پائجامے - اوڑھنے کے رومال کو احتیاط سے تہ کرکے دستی رومال میں گٹھری کی طرح باندھ کے کھونٹی پر رکھ دیا - اور غرقی باندھ کے اور کوئی پرانا جوتا یا زیرپائی پہن کر بیٹھ رہے - اسی داشت کی برکت تھی کہ قیمتی اور شالی کپڑے چار چار پانچ پانچ پشتوں تک اس احتیاط سے رہتے کہ نہ میلے ہوتے - نہ پھٹتے - نہ کیڑا لگتا - ہمیشہ نئے بنے رہتے - اور شادی کی تقریبوں یا شان و شکوہ کی محفلوں میں ایسا شاہانہ لباس پہن کر جاتے کہ لوگوں کو جو اُن کی حالت و حیثیت سے واقف ہوتے تعجب ہوتا۔

گو کہ اعلیٰ طبقے کے امرا خصوصاً شاہزادے - علما - اور اطبا لزوم کے ساتھ سواریوں پر نکلتے مگر شرفا کے لیے پیدل پھرنا آج کل کے زمانے کی طرح معیوب نہ تھا - ہر طبقے اور درجے کے لوگ یکساں حالت سے پاپیادہ باہر کی سیر کرتے - اور پیدل چلنے والے بڑے سے بڑے رئیسوں اور معزز لوگوں کے برابر بیٹھتے اور مضائقہ نہ ہوتا۔

(۵۳)

اب ہم مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتے ہیں کہ لکھنؤ کی معاشرت نے اپنی ضرورت و قدردانی سے کن کن چیزوں کو ترقی دی۔ اور کن کن فنون کو یہاں نشو و نما ہوا- اس سلسلے میں بہت سی چیزوں کا ذکر آئے گا - مگر ہم پہلے مٹی کے برتنوں سے شروع کرتے ہیں۔

مٹی کے برتن دنیا کی پہلی ایجاد ہیں - ہر ملک اور ہر سرزمین سے کھود کے قدیم الایام کے خزف پارے برآمد کیے گئے ہین - جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مٹی کو بھٹی مین پکا کے خزف بنا لینا انسان کو اپنی ترقیون کے بہت ابتدائی دور مین معلوم ہوگیا تھا - اور غالبًا دنیا کے عہد حجریت ہی مین معدنی فلزات کے برآمد ہونے سے پہلے انسان کو برتن بنا کے اُن کو پکانا آگیا تھا - مصر مین عہد فراعنہ کے گلی ظروف اور بابل و نینوا مین غذا اور پانی کے ظروف کے ساتھ نہایت پختہ اینٹین برآمد ہوئی ہین - فراعنہ کے دور مین امرائے مصر جن تابوتون مین لاشون کو ممی بنا کے رکھا کرتے وہ مٹی ہی کے ہوتے تھے - یہی نہین - اگلی دنیا خزف پارون اور ٹھیکرون سے بہت دنون تک کاغذ کا کام لیتی رہی ہے -

ہندوستان والون کو بھی قدیم الایام ہی مین یہ فن آ گیا تھا - اور عہد قدیم کے نکلے ہوے ظروف سے معلوم ہوتا ہے کہ یہان بھی اس فن نے دیگر مقامات سے کم ترقی نہین کی تھی - خصوصًا بُت پرستی نے ہندوؤن مین بھی مٹی کی مورتون کی بنیاد ڈالی جس مین روز بروز ترقی ہوتی رہی - اور یہان کُمہارون کی ایک ذات پیدا ہوگئی - جس کا خاندانی اور آبائی پیشہ یہی ہے کہ مٹی کے ظروف اور کھلونے بنا کے پکاتے ہین -

دہلی مین اسلامی دور نے عام کُمہارون کی نسبت زیادہ ترقی یافتہ کسگرون (کاسہ گرون) کا ایک نیا گروہ پیدا کر دیا جو مسلمان ہین اور ظروف کے ساتھ کھلونے بھی بناتے ہین - اور اگرچہ شرع اسلام مورتون کے بنانے کو مطلقًا ناجائز بتاتی ہے - مگر کسگرون کا چونکہ ذریعۂ معیشت یہی کام ہے اس لیے وہ ایک حد تک کھلونے بنانے اور بیچنے پر مجبور رہین - مسلمان کسگر عام معاشرت و شایستگی اور نیز اپنے فن مین کُمہارون سے زیادہ ترقی یافتہ ہین -

دہلی سے مسلمان اُمراان کسگرون کو بھی اپنے ساتھ لکھنؤ مین لائے اور امرا کی شوقینی کی بدولت اُنکی صنعت کو یہان زیادہ اور نمایان ترقی ہونے لگی - چنانچہ کمہار اور کسگر دونون نے اپنے کام مین وہی ذہانت وطباعی اور جدت طرازیان دکھانا شروع کین جو ایک مصور تصویرون مین اور ایک شاعر اشعار مین دکھایا کرتا ہے -

حسن اتفاق سے لکھنو کی مٹی اس فن کے لیے مناسب ثابت ہوئی جس نے کاریگری کو اظہار کمالات کا موقع دینا شروع کیا۔ اور برتن اور کھلونے دونوں ایسے بننے لگے جیسے کہ کہین نہ بن سکے تھے۔ ظروف مین تو یہ ترقی ہوئی کہ ایسے سُبک باریک۔ اور صاف اور اس کے ساتھ خوش قطع برتن یہان بنتے ہین کہ کہین نہین بن سکتے۔ امروہے کی مٹی بھی اس کام کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چنانچہ وہان بھی اس فن کو بڑی ترقی ہو رہی ہے۔ اور وہان کے کاریگرون کے ظروف گلدستون اور لکھنو کے ظروف کی وضع مین فرق ہے۔ اور اکثر لوگون کا خیال ہے کہ لکھنو کے کاریگرون کا کام نفاست پسند لوگون کی نظر مین بڑھا ہوا ہے۔

عام چیزون مین لکھنو کے گھڑے۔ بدھنیان سارے ہندوستان کے گھڑون اور بدھنیون سے سُبک اور خوشنما ہوتے ہین۔ گھڑون کی گولائی نہایت ہی مکمل اور اپنے حدود مین پوری ہوتی ہے۔ بدھنیان تانبے کے لوٹون کی قطع سے بہت زیادہ قریب ہوتی ہین۔ ظروف مین سفالی کے برتن یہان سے اچھے شاید کہین کم ملین گے۔ مگر چونکہ مٹی کے برتنون مین کھانے کا رواج بالکل اُٹھ گیا ہے۔ اس لیے کمھارون کی توجہ اب اُنکی طرف سے ہٹ گئی اور روز بروز مٹتی جاتی ہے۔ مگر جن ظروف مین یہان کے کسگرون نے اپنے کمالات کا اعلیٰ ترین ثبوت دیا وہ آبخورے۔ صراحیان۔ جھجریان۔ اور حُقّے ہین۔ اور اُن کے بعد کھیر کی ہانڈیان۔

آبخورے پانی پینے کے ظروف ہین۔ اگرچہ شیشے اور تام چینی کے سُبک خوشنما اور نفیس گلاس اور نیز مرادآباد وغیرہ کے گلاس اور کٹورے کثرت سے رواج پاگئے ہین۔ مگر ہندوستان مین گرمیون کا ایک ایسا موسم آتا ہے جبکہ بجز مٹی کے آبخورون کے کسی ظرف مین پانی مزہ نہین دے سکتا۔ اس لیے کہ پانی اُن مین ٹھنڈا رہتا ہے اور خود اُنکی ٹھنڈک ہاتھ اور ہونٹون کو خنکی کی ایسی لذت دیتی ہے جو اور کسی چیز سے نہین حاصل ہو سکتی۔ علاوہ برین مٹی کے کورے آبخورے مین ایک ایسی روح کو تازہ کرنے والی خوشبو ہوتی ہے جس کے شوق نے یہان مٹی کا عطر ایجاد کرادیا۔ غرض اس ضرورت نے آبخورون کو باقی رکھا جن مین طرح طرح کی نفاستین پیدا کی گئین۔ ایسے نازک۔ ہلکے۔ اور سُبک آبخورے

بنے جو کاغذی کہلاتے ہین - اور اس قدر باریک ہوتے ہین کہ شیشے کے گلاسون
کی نزاکت کو بھی یہان مٹی کے آبخورون کی سبکی اور باریکی نے مات کر دیا - پھر
اُن پر نقش ونگار ربا کے بالو کی ایک تہ چڑھادی جاتی ہے کہ پانی کو زیادہ ٹھنڈا
رکھے اُنھین کے مناسب اُنکے جوڑ کی تھالیان ایجاد ہوئین - آخر آبخورون کی
قطع ایسی خوشنما اور دلکش ہوگئی کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے - اور زمانے کو مان لینا
پڑا کہ انسانی صنعت نے جو کمال پگھلنے والے فلزات کے استعمال مین دکھایا ہے
وہی مٹی مین بھی دکھا سکتی ہے

آبخورون کے بعد پانی رکھنے اور اُس کے ٹھنڈا کرنے کے ظروف مین صراحیان
ہین - صراحی بہت پُرانی چیز ہے جس کا رواج ایران ومصر قدیم مین بھی تھا - مگر
لکھنؤ کی صراحیان مٹی کی خوبی اور کاریگرون کی لطافت مذاق سے نفیس - کاغذی
اور بہت ہی سُبک ہو گئین - اور پھر اُن کی شکل بھی ایسی خوبصورت ہوگئی کہ ان
دونون باتون مین کہین کی صراحیان اُن کا مقابلہ نہین کر سکتین - اُنکے دہانے پر
ایسی متناسب خمیدگی پیدا ہوگئی کہ لکھنؤ کی صراحیون کا دہانہ ہی ایسی چیز ہے جو
اور کسی جگہ نہین نظر آسکتی - جھجھریان بھی ویسی ہی نازک وسبک ہین - اُن کا پیٹ
تو وہی صراحیون کے مثل ہوتا ہے مگر اُسکے اوپر لمبی گردن کے عوض ایک مُنھ کر سا
دیا جاتا ہے - کام اور نزاکت ولطافت کے اعتبار سے وہ بھی صراحیون سے کم نہین ہوتین

حقے - ان مین بھی ٹھنڈک کی بے انتہا ضرورت ہوا کرتی ہے تاکہ دھوان ٹھنڈا آئے
مٹی کے کاغذی حقے یہان ایسے نفیس اور خوش قطع بننے لگے کہ کسی جگہ نہین نصیب ہو سکتے
پھر نئے اور تواسے ہوئے کورے حقون سے دھوئین مین خنکی اور نفاست کے ساتھ کوری مٹی
کی ایسی نفیس خوشبو پیدا ہوجاتی ہے کہ عہد شاہی کے بہت سے عالی مرتبہ رئیسون کو سوا اُنکے کسی
حقے مین مزہ نہ آتا تھا - عظیم اللہ خان نے اُن مین اور خوشنمائی ونفاست پیدا کر کے عظیم اللہ
خانی حقے اپنی یادگار چھوڑ دیے جو آج تک مٹی کے کُل قسمون کے حقون سے اچھے سُبک اور
مقبول عام ہین - مین نے ایک مرتبہ لندن کے ملک الشعرا لارڈ ٹینیسن کی نسبت سنا کہ اُنکو
مٹی کے سفید پائپ جو "کلی پائپ" کہلاتے ہین اس قدر پسند تھے اور اُنکی شاعرانہ نفاست
پسندی کورے پائپون کی اس قدر رسیا تھی کہ سامنے ایک ٹوکری مین بھرے ہوئے کورے

اور اچھوتے پائپ رکھے رہتے - وہ ایک پائپ کو لیکر اس مین تمبا کو بھرتے پیتے
اور چند منٹ مین اُس کو توڑکے دوسری ٹوکری مین ڈال دیتے - پھر دوبارہ
ضرورت ہوتی تو دوسرا پائپ لیتے اور چند کش لے کر اُسے بھی توڑکے ڈال دیتے -
یونہین دن بھر بیٹھے کورے پائپ بھرا-پیا- اور توڑا کرتے - میرا خیال ہے کہ اگر
لارڈ ٹینسن کو لکھنو کے عظیم اللہ خانی حقے مل جاتے-تو ان مگی پائپون کو بھول جاتے -
اس لیے کہ اُنکے دھوئین مین جو ٹھنڈک- نفاست- اور خوبی ہوتی ہے اس کا پتہ گلی پائپون مین
کوسون نہین ہے - !

کھیر کی ہانڈیان - پکانے کی ہانڈیان ہر جگہ بنتی ہین مگر لکھنو کی ہانڈیان تانبے کی پتیلیون کی جیتی
سچی نقل ہین اور کہین نہ ہونگی - خصوصاً گلابی ہانڈیان جو حصون مین کھیر وغیرہ تقسیم کرنے کے لیے بنائی جاتی ہین
آبخورون اور صراحیون کی طرح یہ بھی کاغذی اور بہت ہی خوبصورت بنتی ہین - ان مین اب اکثر نازک
امرا گلوریان بھی رکھتے ہین - اس لیے کہ گرمیون کے موسم مین خاصدان جل اُٹھتے ہین اور اُن مین گلوریان
بھی بہت گرم ہو جاتی ہین - مگر ان ہانڈیون مین وہ اس قدر ٹھنڈی رہتی ہین اور ان مین ایسی
سوندھی خوشبو پیدا ہو جاتی ہے کہ نہایت ہی فرحت بخش ہو جاتی ہین - مگر برتنون سے بھی زیادہ کمال
کمہارون نے کھلونون اور مٹی کی مورتون مین دکھایا - بت تراشی کا فن بت پرستی کے طفیل مین
بہت پرانا ہے - مصریون - بابلیون - اور ایرانیون یونانیون اور رومیون سب نے اپنے اپنے عہد مین
اس فن مین کمالات دکھائے جنکے نمونے آج یورپ کے نامور عجائب خانون مین نظر آسکتے ہین -
خصوصاً اہل یونان نے پتھر کی مورتین تراشنے اور عضا کا تناسب قائم رکھنے مین ایسا کمال دکھایا - کہ آجکا زمانہ
بھی باوجود بے انتہا ترقیون کے اُنکی چابکدستی پر حیران ہے - اور ان کی بنائی ہوئی مورتین حال کے بت تراشو
اور مصورون کے لیے بہترین "ماڈل" یا معیار سمجھی جاتی ہین - مگر مٹی کے کھلونون مین تناسب عضا قائم
رکھنے اور فطرت کی سچی نقل اُتارنے مین جو کاریگری یہان کے ان پڑھ جاہل کمہار دکھا رہے ہین وہ
یونان کے کمال سے ذرا بھی کم نہین ہے - وہ انسان کو دیکھ کر اُسکی پوری مورت اُتنی ہی بڑی جتنا کہ
اُس کا جسم ہو تیار کر دیتے ہین - پھر چھوٹی مورتون مین ہر وضع اور ہر طبقے کے لوگون کی ایسی مطابق اصل
تصویرین بناتے ہین کہ اُنکے کمال مین شاعرانہ نازک خیالیون کا پتہ چلتا ہے - دیوالی مین ہندو کثرت
سے کھلونے خریدتے اور تقسیم کرتے ہین - اور اسی ضرورت سے ہر سال اُس موسم مین یہان کے کمہارون
کو اپنے فن مین نئی نئی ایجادون طباعیون اور نازک خیالیون کے ظاہر کرنے کا موقع ملجایا کرتا ہے -

ان کمہاروں نے جو مورتوں کے طرح طرح کے گروپ اور سٹ تیار کیے ہیں وہ دیکھنے سے تعلق رکھتے
ہیں۔ انگریزی پلٹن۔ رنڈیوں اور بھانڈوں کے طائفے۔ قدیم نوابوں کی محفل۔ امرا کے دربار مختلف
اہل حرفہ کے مجمع خاص شان رکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ نمائش کے موقع پر یہاں کے ایک کمہار نے
ایک ہندوستانی گاؤں بنایا تھا جس میں آبادی کے اندر گاؤں اور مکانوں کے درمیان مختلف
وضع کے لوگوں کا چلنا پھرنا۔ بیلوں اور بیل گاڑیوں کا گزرنا دکھانے کے بعد گرد کے میدان میں کسانوں
کا بیل جوتنا اور نالیوں کے ذریعے سے کھیتوں میں پانی پہنچانا دکھایا تھا۔ نالیوں میں پانی کا بہنا
اور اس میں ننھی ننھی لہروں کا پڑنا ایک نمودار ہوتا تھا۔ اور یہ چیز نمایاں طور پر دکھائی گئی تھی کہ جو بیل
کھیتوں میں کام کر رہے ہیں نہایت دبلے ہیں اور ان کی پسلیاں صاف نظر آ رہی ہیں۔ اسی طرح شاہی
زمانے کے لکھنؤ کی ایک تصویر بھی میں نے دیکھی جس میں اس وقت کی آبادی اور گلیوں اور کوچوں کا
نقشہ دکھا دیا گیا تھا۔ مگر افسوس یہ سب صنعتیں ایک وقتی جوش کے طور پر دو چار روز نظر کے سامنے
ہو جاتی ہیں اور کوئی ایسا مقام نہیں ہے جہاں ان تمام صناعیوں کے نمونے محفوظ رکھے جاتے
ہوں۔ لندن میں میڈم ٹساڈس اگزبیشن کے نام سے ایک مورتوں کا عجائب خانہ ہے جس میں
ہر قسم کی قد آدم تصویریں کل مشاہیر زمانہ کی اور نیز وہ جن میں صناعوں نے کوئی خاص کمال دکھایا
ہے جمع کر دی گئی ہیں بعض ایسی مورتیں ہیں کہ ممکن نہیں ہر جانے والے کو کسی زندہ مورت پر دھوکا
نہ ہو جائے۔ اگر ایسا ان مٹی کی مورتوں کا ایک عجائب خانہ یہاں قائم کر دیا جائے اور اس میں
کمہاروں کی تمام کاریگریاں جمع کر دی جائیں تو میرا خیال ہے کہ فن کی ترقی میں بے حد مفید ہونے
کے علاوہ وہ نفع بخش بھی ہوگا۔ اس کے دیکھنے کے لیے ایک ٹکٹ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے
کہ کوئی باہر کا سیاح بغیر اسکے دیکھے نہ جائے گا۔ لیکن خرابی یہ ہے کہ خود ہم میں کوئی ذوق اور
جوش نہیں ہے۔ اور ہم ہر بات میں گورنمنٹ کے دست نگر رہنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی دولتمند
امیرزادے کو بجائے عیاشی کے اس کا شوق ہو جائے تو کس قدر ناموری و خدمت وطن کا باعث
ہو سکتا ہے؟

عجائب خانوں میں اس قسم کے کھلونے اکثر جمع کر دیئے گئے ہیں مگر وہ بہت ہی محدود ہیں
اور لکھنؤ میں اس صنعت کا درجہ اتنا ہی نہیں ہے کہ دیگر اجناس کی چیزوں کے ضمن میں چند کھلونے
بھی رکھ دیے جائیں۔ یہاں کھلونوں اور مٹی کی مورتوں کی مستقل نمائش ہونی چاہیے۔

سیرۃ احمدی
یعنے
سوانح اقدس حضور سرورِ عالم
احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم
اس کتاب میں حضور کے سوانح عمری کے علاوہ
ازواج و اولاد کا تذکرہ بھی ہے حضور کے طبعی عادات
و خالات حضور کی تعلیم اور اسکی فلاسفی نبوت اور معجزات
اور انکی فلاسفی تکثیر ازدواج ۔ طلاق ۔ غلامی اسلام مذہب
سیف سے نفاذ نہ ہے ان عنوانات پر تفصیلاً علیحدہ
باب قائم کر کے بحث کی ہے جو اس کتاب کی خصوصیت ہے
مؤلفہ
خان احمد حسین خانصاحب ایڈیٹر
رسالہ شباب اردو لاہور
باخذ حقوق دائمی
سید مبارک علی شاہ گیلانی مولوی فاضل
منشی لاہور نے چھپوائی
سیرۃ النعمان
یعنے
امام اعظم ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ کی سوانح عمری
حصہ اول و دوم
اس کتاب کے پہلے حصے میں امام ابو حنیفہ کا نام و نسب
ولادت و سن رشد تعلیم و تربیت شیوخ حدیث درس
و افتاء یقیہ زندگی اور دربار کے تعلقات وفات
عام اخلاق و عادات مناظرات و مناقب ذہانت طباعی
اس قسم کے حالات نہایت تفصیل سے مذکور ہیں
دوسرے حصے میں اصول مسائل علم کلام فن حدیث
اور فقہ پر محققانہ تاریخی حالات کے تفصیلی بحث ہے
خاتمہ میں امام صاحب کے ممتاز شاگردوں کے
مختصر حالات ہیں
مؤلفہ
شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی مرحوم
با تصحیح و تحشیہ
سید مبارک علی شاہ صاحب
مضامین شرر
علامہ شرر لکھنوی نے ناول اتنے لکھے
کہ اردو زبان کے خزانہ کو لٹیا نہ معجزات سے پر
کر دیا (اللہم متع المسلمین بفیوضہ) لیکن
افسوس جو قدر کرنے والی چیز تھی اسکی طرف توجہ
نہ کی گئی علامہ کی اصل جوہر یہ تصنیف مضمون تھے
دلگداز کے ذریعہ شائع ہوتے رہے یہ ایسی چیز
تھی کہ قابل سنتیں تھیں کہ کتابی صورت میں
انکو مرتب در مضمون ہو کر ملیں تو ان کو سر آنکھوں پہ
رکھیں مولانا موصوف سے ان کی از سر نو نظر ثانی
کرا کر مندرجہ ذیل عاشقانہ و شاعرانہ جلدیں طبع
کرائی گئی ہیں۔ شائقین جلد طلب فرمائیں ورنہ
انتظار طبع اٹھانا پڑے گا جو سخت دقت طلب
امر ہے۔ قیمت حصہ اول مکمل دو روپے آٹھ
آنے (عـ۲/۸) حصہ دوم مکمل دو روپے آٹھ آنے
آغاز و اختتام سال قیمت صرف
الیس عبد الرشید اینڈ برادرز لاہور
مضامین شرر
یعنے
مولانا مولوی محمد عبد الحلیم صاحب شرر
لکھنوی مد ظلہ العالی
کے تمام تاریخی و جغرافی مضامین جن کی مکمل
محقق موصوف نے از سر نو نظر ثانی فرمائی ہے
جنہیں
سید مبارک علی شاہ صاحب گیلانی
مولوی فاضل منشی لاہور نے
باہتمام
الیس عبد الرشید اینڈ برادرز تاجران کتب
لوہاری دروازہ لاہور چھپوایا
قیمت حصہ اول مکمل حصہ دوم مکمل
حصہ سوم ہندوستان میں مشرقی تمدن
کا آخری نمونہ یعنی گذشتہ لکھنو قیمت
صرف دو روپے چار آنے
مشہور اکابر کے سوانح عمری زیر طبع
ملنے کا پتہ ۔ الیس عبد الرشید اینڈ برادرز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

شعر العجم حصہ اول شاعری کی حقیقت فارسی شاعری کا آغاز۔ قدماء کا دور قیمت صرف تین روپے ...... ۳ روپے

شعر العجم حصہ دوم شعرائے عہد متوسط۔ قیمت صرف .... (عہ)

شعر العجم حصہ سوم شعرائے متاخرین قیمت دو روپے آٹھ آنے عہ

شعر العجم حصہ چہارم فارسی شاعری پر ریویو قیمت صرف ۱۲/عہ

شعر العجم حصہ پنجم فلسفیانہ صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تبصرہ قیمت صرف دو روپے ...... عہ

مقالات شبلی پندرہ علمی تاریخی مضامین کا مجموعہ قیمت صرف ... ۱۲/عہ

مضامین عالمگیر شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پر اعتراضات اور ان کے جوابات ۱۲/

دستہ گل مولانا کی فارسی غزلوں کا مجموعہ۔ قیمت صرف چار آنے .. ۴/

مکاتیب شبلی مولانا مرحوم کے خطوط کا مجموعہ علمی۔ قومی۔ اخلاقی ادبی معلومات کا خزانہ ہے جلد اول قیمت صرف ۱۲/عہ جلد دوم قیمت صرف .. ۱۲/عہ

مجموعہ کلام شبلی اردو نہایت اعلیٰ کتاب قیمت صرف ... ۱۲/

سوانح مولانا روم مولانا روم کے حالات و ان کے دیوان و مثنوی پر ریویو قیمت دو روپے ...... عہ

کلیات شبلی فارسی مجموعہ قصائد و غزلیات و مثنویات و رباعیات قیمت صرف دو روپے .. عہ

تصنیفات مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

ارض القرآن جلد اول قرآن مجید کے مقامات کا جغرافیہ اور اقوام قرآن میں سے عاد۔ ثمود۔ جرہم۔ سبا۔ اصحاب ایکہ کی تاریخ مع نقشہ مقامات عرب قیمت صرف دو روپے ... عہ

ارض القرآن جلد دوم اسرائیلی عربوں کی تاریخ اور عرب کی تجارت زبان۔ اور مذہب پر تفصیلی مباحث حجم ۲۵۱ صفحات قیمت صرف .. ۱۲/عہ

رسائل اہل سنت والجماعت ۔ فرقہ اہل سنت والجماعت کے اصولی عقائد کی تحقیق نہایت وضاحت سے کی گئی ہے قیمت ۸/

لغات جدیدہ چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری قیمت صرف ایک روپیہ .... عہ

سیرۃ عائشہ حضرت عائشہ صدیقہ کے حالات زندگی قیمت صرف .. (عہ)

حیات مالک ۔ امام مالک کی سوانح عمری اور موطائے مالک پر تبصرہ قیمت .... عہ

بہادر خواتین اسلام قیمت ۲/

تصنیفات مولانا مولوی عبدالسلام ندوی

اسوہ صحابہ جلد اول صحابہ کرام کے عقائد عبادات۔ اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر اور قرون اولی کے اسلام کا عملی خاکہ ضخامت ۵۰۳ صفحات قیمت صرف ۳ روپے

اسوۂ صحابہ حصہ دوم صحابہ کرام کے سیاسی انتظامی اور علمی کارناموں کی تفصیل ضخامت ۵۰۴ صفحات قیمت صرف (للعہ)

سیرۃ عمر بن عبدالعزیز سوانح عمری اور ان کے عہد حکومت کے تمام علمی مذہبی اور سیاسی کارناموں اور ان کے مجددانہ اعمال کی تشریح قیمت صرف ...... (عہ)

تصنیفات مولانا حالی مرحوم

حیات سعدی قیمت صرف ... ۱۲/عہ

مجموعہ نظم حالی عہ + مسدس حالی قیمت ۸/

مسدس حالی پاکٹ ایڈیشن قیمت ۱۲/

شکوہ ہند قیمت ۲/ + مثنوی حقوق اولاد ۲/

بیوہ کی مناجات قیمت صرف ۳/

تحفۃ الاخوان ۲/ + یادگار غالب ۳ روپے

جھوٹ اور سچ کا مناظرہ قیمت ۲/

چپ کی داد قیمت ۲/ + دیوان حالی قیمت عہ

مقدمہ دیوان حالی قیمت صرف عہ

تعصب اور انصاف قیمت صرف ۲/

رباعیات عمر خیام مع تذکرہ خیام مطبوعہ امرتسر قیمت صرف عہ

البرامکہ خلیفہ ہارون الرشید عباسی کے نامور وزراء یحیی۔ فضل و جعفر برمکی کی مفصل سوانح عمری قابل دید کتاب ہے۔ قیمت صرف تین روپے آٹھ آنے .. ۳ روپے ۸/

ملنے کا پتہ۔ ایس عبدالرشید اینڈ برادرس تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

اُردو زبان کی تجارتی انسائیکلوپیڈیا

بے روزگاروں کو برسرِ روزگار کرنے اور ملک سے افلاس و تنگدستی کی مصیبت دور کرنے اور نئی نسلوں کو تجارتی تعلیم دینے کے لئے نظامیہ دارالاشاعت دہلی کی مفید عام کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے پانچ حصے تجارت کی پہلی۔ تجارت کی دوسری تجارت کی تیسری۔ تجارت کی چوتھی۔ تجارت کی پانچویں کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔

تجارت کی پہلی

اس میں مبادیات تجارت کا بیان ہے یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ تجارت کیوں کی جائے۔ اور کیونکر کی جائے۔ تجارت کے حیرت انگیز منافع۔ تجارت شروع کرنے اور اس میں کامیاب ہونے کے طریقے اور روپیہ پیدا کرنے اور اس کفایت سے خرچ کرنے کے ایسے بیش بہا اصول بیان کئے گئے ہیں کہ آدمی ان پر عمل کر کے اپنی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے ایک ناتجربہ کار کو تجربہ کار بنانے اور تجارت کی مشکلات پر قابو پانے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے قیمت مجلد دو روپے عہ غیر مجلد صرف ... عہ

تجارت کی دوسری

اس کتاب میں فن اشتہار کی تعلیم ہے اور اشتہارات کے ذریعے سے ہر قسم کی جائز تجارتوں کو فروغ دینے کے لئے نہایت کارآمد اصول بیان کئے گئے ہیں اشتہارات کا مضمون بنانے ڈیزائن تجویز کرنے عمدہ لکھوانے چھپوانے اور ان کی اشاعت کے لئے کم از کم خرچ میں بہتر سے بہتر طریقے اختیار کرنے کے متعلق وہ تمام ضروری ہدایات و معلومات اس کتاب میں موجود ہیں جن سے اہل مغرب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہندوستانی ناواقف ہیں قیمت مجلد صرف عہ بلا جلد ایک روپیہ عہ

تجارت کی تیسری

اس میں دوکانداری کی تعلیم ہے دکان کیسی ہو؟ اسباب ہو؟ چیزیں کیسے آراستہ کی جائیں؟ مال کیونکر کفایت سے خریدا جائے؟ نفع کتنا لیا جائے؟ گاہکوں کو کیونکر خوش رکھا جائے؟ بکری اور نفع بڑھانے کے لئے کن کن اصولوں پر عمل کیا جائے؟ دکان کی شہرت و ہردلعزیزی کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں؟ گاہکوں سے قرضہ کیونکر وصول کیا جائے؟ دوکان کا حساب کتاب کیونکر رکھا جائے؟ الغرض سینکڑوں کی بہت سی کارآمد باتیں دوکانداری کے متعلق اس کتاب میں ہیں جن سے ہندوستانی عموماً ناواقف ہیں۔ قیمت مجلد عہ بغیر جلد بارہ آنے ... ۱۲؍

تجارت کی چوتھی

یعنی مراسلات تجارت خط و کتابت تجارت کے لئے ایک لازمی چیز ہے۔ اور بہت مشکل ہے اس کتاب میں اشتہار کے ساتھ تجارتی خط و کتابت کے تمام اصول اور رسیدات و ہنڈی و چیک وغیرہ لکھنے کے طریقے بتائے گئے ہیں جن سے اردو خوان اور انگریزی خوان دونوں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ کاروباری خطوط و کاغذات کے نمونے انگریزی میں بھی دئے گئے ہیں اور اردو میں بھی۔ تجارت میں خط و کتابت ایسی چیز ہے کہ صرف ایک کرسی اور ایک میز بچھا کر آپ محض خط و کتابت کے ذریعہ سے لاکھوں روپے پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ خط و کتابت کی جانب بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور یہ کام زیادہ تر دوسروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے اس لئے مراسلات تجارت کا مطالعہ ہر اس شخص کے لئے ضروری ہے۔ جو تجارت کرنا چاہتا ہے یا تجارت کر رہا ہے قیمت مجلد عہ بغیر جلد صرف عہ

تجارت کی پانچویں

یعنی فن بہی کھاتہ کی کتاب۔ اس میں تجارتی حساب کتاب رکھنے کی مفصل تعلیم دی گئی ہے فن بہی کھاتہ پر یہی جامع مفصل اور مفید کتاب ہندوستانیوں کے لئے اب تک اردو کیا انگریزی میں بھی نہیں لکھی گئی۔ یہ کتاب انشاء اللہ ملک کے تجارتی لٹریچر میں ایک ایسا اضافہ ہوگئی ہے جس کو ماہرین فن بہی کھاتہ کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اس لئے چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے تاجر کے لئے نہایت ضروری چیز ہے کتاب کی ضخامت قریباً ۵۰۰ صفحات قیمت عہ مجلد دو روپے عہ

تاریخ لاہور

مصنفہ رائے بہادر کنہیا لعل صاحب۔ واقعی قابل دید کتاب ہے قیمت دو روپے عہ

1

نیز یہ کتابیں حکیم محمد سراج الحق منیجر رسالہ دلگداز و ایڈیٹر رسالہ ماہی سخن سنج کٹرہ ترن بیگان لکھنؤ
سے ملتی رہیں ؀

فہرست مطبوعات خاص متعلقہ دوکان ایس عبد الرشید

اینڈ برادرز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

سیرۃ احمدی یعنی حضور سرور عالم رحمۃ للعالمین کی سوانح عمری۔ اس کتاب میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سوانح عمری کے علاوہ ازواج و اولاد کا تذکرہ بھی ہے حضور کے طبعی عادات اور حالات حضور کی تعلیم اور اس کی فلاسفی۔ نبوت اور ثبوت اور ان کی فلاسفی تکثیر ازدواج۔ طلاق غلامی (اسلام مذہب سیف۔ جہاد ہے) ان عنوانات پر تفصیلاً علیحدہ علیحدہ باب قائم کرکے بحث کی ہے۔ جو اسی کتاب کی خصوصیت ہے نہایت دیدہ زیب کتابت اور طباعت اعلیٰ کاغذ تین طرح کا لگایا قیمت درجہ اول تین روپے (سے) درجہ دوم عہ درجہ سوم (عہ) رکھی گئی ہے۔ عاشقان حضور کے قابل مطالعہ ہے جلدی طلب فرمائیے تاکہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے ٭

مختصر تاریخ اسلامی حصہ چہار آجتک بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں مگر افسوس ان تاریخوں سے ہمارے بچے مستفید اس لئے نہ ہو سکے کہ ان کی عبارتیں دقیق اور الفاظ مشکل ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایسی آسان عام فہم تاریخ لکھی جائے جس کو بچے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ لہذا ہم نے یہ سلسلہ مختصر تاریخ اسلامی کا شائع کیا ہے جس سے مسلمان لڑکے اور مسلمان لڑکیوں کو ایک مختصر خاکہ اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ کا معلوم ہو جائے اگر ان کو شوق ہوا تو ان کے لئے یہی کتابیں تاریخ اسلامی کا بنیادی پتھر بن سکیں گی۔ مولانا سید سلیمان صاحب نے اس کتاب کے مفید ہونے کی نسبت معارف میں پر زور لکھا ہے قیمت حصہ اول دو روپیہ چار آنہ ۲/۴

حصہ دوم حصہ سوم حصہ چہارم

سیرۃ النعمان مصنفہ علامہ شبلی نعمانی مرحوم جیسی یہ کتاب علامہ مرحوم نے اعلیٰ درجہ کی تصنیف فرمائی ہے۔ اور کروڑوں حنفی مذہب مسلمانوں کو امام اعظم اور ان کے نامور و مشاہیر شاگردوں کے حالات اور مسائل سے آگاہ کیا۔ ویسے ہی یہ کتاب مختلف مطابع چھاپ کر ایسی ابتر کر دی تھی کہ دیکھ کر دماغ پریشان ہوتا تھا۔ ہم نے اس کی نہایت عرق ریزی سے صحت کی اور اس پر حاشیے بھی تحریر کئے اور دو قسم کے کاغذ پر چھپوائی قسم اول دو روپے (عہ) قسم دوم (عہ) اب آپ اس کتاب کو منگوائیں اور ملاحظہ فرمائیں جس میں محنت اور صحت کی داد بھی اس طرح ہی مل سکتی ہے

مستقبل اسلام پروفیسر وامبری۔ جو بہت عرصہ تک اسلامی دنیا میں رہا۔ اور سیاسی و مذہبی معلومات سے مستفید ہو کر ایک معرکۃ الآراء تصنیف مغربی تمدن اور مشرقی ممالک شائع کی۔ اس کا مسٹر ظفر عمر صاحب بی اے (علیگ) مؤلف نیلی چھتری و بہرام کی گرفتاری نے نہایت مقبول ترجمہ فرمایا اور حاشیے بھی لکھے۔ یہ دوسرا ایڈیشن ہے۔ اسلام کی آئندہ حالت مغربی نقطہ نظر سے دیکھنا ہو تو اس کو ملاحظہ فرمائیے آج کل اس کا مطالعہ نہایت فائدہ بخش ہے ٭
قیمت صرف ایک روپیہ پانچ آنے ..... (۱/۵)

ذکر فتح اندلس کتاب نایاب تھی حالات قابل مطالعہ تھے۔ مسٹر محمد جمیل الرحمن صاحب پروفیسر حیدرآباد دکن نے ترجمہ کر دیا اور اصل متن عربی کو بھی منسلک کر دیا قابل دید مختصر تاریخ قیمت بارہ آنے ۱۲/

حسنیہ عربی صرف و نحو ہیں۔ اردو کتابیں میں کی تشریح اور توضیح جو مصنف نے اس کتاب میں فرمائی۔ بڑی بڑی کتابوں میں بھی یکجا نہ پائی جائے گی۔ نادر الوجود اور قابل قدر کتاب ہے قیمت صرف چھ آنے ۶/

مضامین شرر علامہ شرر لکھنوی نے دل اتنے لکھے کہ اردو زبان کے خزانے کو بھر دیا (اللھم متع المسلمین بفیوضہم) اور دنیا میں کوس لمن الملک الیوم درست طور پر بجا دیا۔ لیکن افسوس جو قدر کرنے والی چیز تھی۔ جس سے فائدہ اٹھا کر مشہور ادیب اور نامور مصنف بن جائیں اس کی طرف اردو دنیا نے توجہ نہ کی۔ علامہ کی اصل جوہر ریز تصنیف مضامین تھے جو دلگداز کے ذریعہ وقتاً فوقتاً شائع ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے شائع ہوتے رہتے یہ ایسی چیز تھی کہ قابل نگاہیں نہیں تھیں کہ ...

کو بہ مرتب اور مضمون ہو کر نکل جائیں تو سر انکھوں پر رکھیں جیسے ایسی قابل ہستیوں کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے علامہ موصوف کو تکلیف دی تو انہوں نے مہربانی فرمائی اور میری التماس کو شرف قبولیت بخش کر علیحدہ علیحدہ عنوانوں سے مضامین کو مرتب فرما دیا۔ جنکے حصص کر کے جیسے طبع کرانا شروع کر دیا ہے۔ جن میں سے عاشقانہ و شاعرانہ مضامین کے تین حصہ چھپ کر تیار ہو گئے ہیں۔ اور تاریخی وجغرافی مضامین کے دو حصہ ان میں سے ہی ہندوستان میں مشرقی تمدن بصورت حصہ سوئم (قیمت ۱۲/) عاشقانہ و شاعرانہ مضامین حصہ اول قیمت دو روپے آٹھ آنے (عہ/) ایضاً حصہ دوم قیمت (عہ/) حصہ سوم آغاز و اختتام سال قیمت (عہ/) تاریخی وجغرافی مضامین حصہ اول۔ قیمت (عہ/) حصہ دوم دو روپے آٹھ آنے (عہ/)

جلد دلگداز ۱۸۸۷ء } یہ باوجود دو تین بار شائع ہونے کے علامہ شرر مدظلہ کے کتب خانہ میں بھی مکمل نہ تھی جیسے اسکو طبع کرا دیا ہے۔ تھوڑی جلدیں طبع کرائی ہیں اسلئے جلد طلب فرمائیں قیمت ایک روپیہ چار آنے ...... (عہ/)

جلد دلگداز ۱۸۸۹ء } اب پھر چھپ کر تیار ہے اس کو بھی میں نے اس لئے طبع کرایا ہے۔ کہ یہ سخت نایاب ہو گئی تھی قیمت صرف عہ/

بیاض آزاد } کیا ہے؟ مشاہیر شعرائے ہند کے کلام کا انتخاب لاجواب ہے اور وہ بھی مسلم استاد آزاد مرحوم کا کیا ہوا نہایت خوشخط شعر نیچے لکھے ہوئے۔ جلی قلم معلوم ہوتا ہے کہ شنگرف سے لکھی ہوئی قلمی کتاب سامنے رکھی ہے۔ مولانا کا فوٹو بھی شامل ہے علامہ شرر لکھنوی نے جو اس کتاب کی نسبت تحریر فرمایا ہے وہ ابتداء میں منسلک کر دیا ہے باوجود ان تمام خوبیوں کے قیمت صرف ... عہ/

سمرنا کا چاند } مصنفہ مصور غم مولانا راشد الخیری دہلوی اس کتاب کی مقبولیت اس سے ظاہر ہو سکتی ہے کہ پہلی بار چھپتے ہی اتنی جلد ختم ہوئی کہ چھ ماہ کے اندر اندر دوسری دفع طبع کرانے کی ضرورت اٹھانی پڑی اب پھر تھوڑی سی جلدیں ہیں جلد طلب فرمائیے۔ یہ کتاب تربیت نسواں کے لئے ایک

سبق آموز افسانہ ہے قیمت ایک روپیہ چار آنہ عہ/

آفتاب دمشق } عہد صدیقی کا اسلام۔ مسلمانوں کے عظیم الشان جنگی کارنامے مسلمانوں نے دمشق اور بصرے وغیرہ شہروں پر قبضہ کرنے اور اسلام کی اشاعت کے لئے جو عظیم الشان قربانیاں کی ہیں ان کا ذکر اور ایسے دردناک پیرائے میں جو مصور غم علامہ راشد الخیری کا مخصوص امتیاز ہے ایک مسلمان جیا ہو اور مسلمان خاتون کی موت ان کے مصائب دیکھئے اور سبق حاصل کیجئے۔ ایک حسینہ کا اسلام پر شیدا ہو کر مسلمان ہونا۔ قید کیا جانا۔ اور فصیل کے کنگوروں پر سے گرائے جانے پر بھی اسلام سے سرتابی نہ کرنا۔ اس کتاب میں مرقوم ہے۔ جوش اسلامی حمیت اسلامی۔ عدل اسلامی کا نمونہ آپ کو اس کتاب کے مطالعہ سے ملیگا۔ دوبارہ چھپی ہے اور قریب الاختتام۔ چھپائی۔ لکھائی سرورق نہایت دیدہ زیب قیمت عہ/

رہنمائے قانون المعروف **وکیل کا منشی** وکلا کے لئے نت نئی کتب طبع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن منشی صاحبان جن کو کم دماغ سوزی نہیں کرنی پڑتی ان کے لئے ایک کتاب بھی نہ ہو کتنی افسوس کی بات ہے۔ یہ کتاب منشی صاحبان کے لئے خصوصاً اور عرائض نویسوں۔ ثالثوں۔ ساہوکاروں وغیرہ وغیرہ کے لئے عموماً مفید ہے اس کتاب میں قانون مروجہ ہند کو نہایت آسان عام فہم زبان میں بیان کیا ہے ناظرین منگوائیں اور قانونی الجھاؤں سے مخلصی حاصل کریں قیمت ۳/

تصنیفات مسٹر ظفر عمر صاحب بی۔ اے (علیگ)

نیلی چھتری } مسٹر ظفر عمر صاحب کا نہایت دلچسپ اور پسندیدہ ناول قیمت (عہ/)

بہرام کی گرفتاری } نیلی چھتری کے ہیرو بہرام کے حیرت انگیز کارنامے حصہ دوم قیمت ایک روپیہ چار آنے ... (عہ/)

چوروں کا کلب۔ دل بہلانے اور چوری کے خطرات سے بچنے اور لطف اٹھانیکا نادر خزانہ عہ/

لیسپین اہلکاران پولیس کے لئے بہر بابالی چاہیا پو ہے قیمت صرف آٹھ آنے ۸/

مستقبل اسلام پروفیسر وامبری کی کتاب کا ترجمہ قیمت صرف (۸/)

ملنے کا پتہ۔ ایس عبدالرشید اینڈ برادرس تاجران کتب لوہاری دروازہ۔ لاہور

نہایت نتیجہ خیز دلچسپ قابل دید تمدنی اخلاقی ناول اور رامہ کہانیاں

نظیر بیگم یہ اپنے رنگ کا بے نظیر ناول ہے جس میں ایک بیاہتا کی وفاداری اور ایک رنڈی کی بیوفائی دکھائی گئی ہے۔ شوہر کی جدائی اور بے اتفاقی سے بیوی مرجاتی ہے آخر میں رنڈی کے مظالم سے تنگ آکر شوہر مجنون ہو جاتا ہے۔ اور بیوی کی قبر کی تلاش میں قبرستان جاتا ہے۔ وہاں ایک نقاب پوش عورت کو پاتا ہے۔ یہ در اصل اس کی بیوی ہے مرجانے کے بعد اس کی بیوی کیونکر زندہ مل گئی؟ یہ راز صرف کتاب پڑھنے پر معلوم ہوگا۔ انداز تحریر دلکش ہے مصنف کا فوٹو بھی درج ہے قیمت ...... عہ

حسرت یہ ناول اسم با مسمٰے ہے جس میں عالم کی نیرنگیاں اور فلک ستمگار کی جفا آرائیاں دکھائی گئی ہیں۔ یہ درد و غم کا فسانہ چوٹ کھائے ہوئے دلوں کے لئے مرقع عبرت ہے جہان فانی کی لذتیں اس قابل نہیں کہ کوئی سمجھ دار انسان ان سے دل لگائے۔ یہ دنیا کسی کی نہیں کبھی بھی اس نے کسی کے ساتھ وفا نہ کی شاذ و نادر ہی کسی کی اُمید بر آئی ہوگی صدہا نامراد اپنی اُمیدوں سمیت اپنی قبروں میں جا سوئے۔ ان میں سے ایک مظفر بھی تھا۔ کہ کامیابی کی جھلک دیکھی لیکن وہ سراب سے زیادہ پائدار نہ تھی۔ اپنی محبوبہ حسن آرا کے ساتھ چند دن بھی بسر نہ کر سکا۔ بدقسمتی نے بیوی بچوں گھر بار سے چھڑایا غربت کے مصائب سہے۔ زمانہ کے نشیب فراز دیکھے۔ گھر پلٹا تو بیوی دوسرے کی ہو چکی اندوہ ناک فسانہ شروع سے آخر تک دلکش ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ دلدوز اور درد انگیز بھی قیمت عہ

سوز عورت کی کیادی اور مکاری کی داستان۔ عورت کی بیوفائی دوستوں کی عہد شکنی۔ خود غرضی اور خود کامی کے نتائج رنج و اندوہ کا فسانہ۔ درد و غم کی کہانی۔ زمانہ کی ناسازگاری۔ دنیا کے نشیب و فراز۔ دوستوں پر بھروسہ کا انجام۔ بے وفائی اور بے مہری کی داستان عورت کی کرتوت۔ ظالم کا ظلم اور اس کا کیفر کردار ضبط و تحمل کی کامیابی بہت ہی دلچسپ اور دلکش انداز میں دکھائی گئی ہے۔ اس کو پڑھ کر انسان مبہوت ہو جاتا ہے۔ مصنف کا فوٹو ساتھ ہے قابل دید قیمت صرف ایک روپیہ .... عہ

آہ محبت آہ محبت!! کیا شے ہے ؟ یہ ایک مصیبت ایک آفت صوفی اور فلسفی چاہے جو کچھ کہیں انہیں اختیار ہے۔ یہاں تو جو گذری ہے وہی کہتا ہوں محبت کے دام میں پھنسا اور گیا۔ محبت ایک کو نہیں دونوں کو لے ڈوبتی ہے اس کی ابتداء اور انتہا دونوں تباہ کن۔ اس میں سوائے محرومی اور نامرادی کے رکھا ہی کیا ہے وصل کی گھڑیاں میسر بھی ہوں تو کس شمار میں ہیں ان کا زمانہ چشمک برق سے زیادہ نہیں پھر وہی جدائی ہے اور رنج و محن اور اس سے اگر کچھ حاصل ہوتا ہے تو صرف آہ! اور یہیں پر منزل ختم ہو جاتی ہے اس آہ سے آشنا ہونا چاہتے ہو تو اسے پڑھو اور سبق حاصل کرو۔ اور دنیاوی چیزوں کی محبت میں اپنی ہستی تباہ نہ کرو قیمت صرف ... عہ

آئینہ روزگار زمانہ سازوں اور فتنہ پردازوں کی چالیں بے وقوفوں کی غلطیاں ہوا وہوس کے خطرناک نتائج بچوں کو زیور پہنانے کا برا انجام ہر کس وناکس پر بلا پورے تجربے کے بھروسہ کرنے کا دردناک نتیجہ۔ دلالہ عورتوں کی کارستانیاں۔ دولت کا لالچ چور بدمعاشوں کی سازشیں اور اُن کے مضر نتائج ایک غریب عورت کا شریر اور فتنہ جو لوگوں کی سازش سے نجات پانا۔ اور ان بدمعاشوں کا اپنی سزا کو پہنچنا۔ ضمناً ایک دوسرا قصہ بھی آگیا ہے جس میں ایک مندر کے پجاری کے عصمت شکن ہتھکنڈے اور ایک لڑکی کی عزت بازی کا ذکر ہے جس نے ناول کو اور بھی زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے قیمت صرف ...... عہ

شمع سحر ایک انگریزی ناول کا قابل دید ترجمہ ہے۔ مترجم نے کوشش کر کے قصہ کو ایشیائی مذاق کے موافق بنا دیا ہے اصل کتاب انگلستان کے ایک مشہور ناولسٹ کی تصنیف ہے۔ اصل کتاب کی خوبی کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی فہرست میں شامل ہے جس پایہ کی یہ کتاب ہے۔ اسی پایہ کا یہ ترجمہ بھی ہے پڑھنے سے ترجمہ نہیں معلوم ہوتا بلکہ اوریجنل تصنیف معلوم ہوتی ہے۔ واقعی قابل دید کتاب ہے۔ قیمت صرف بارہ آنے ۱۲/

ملنے کا پتہ - ایس عبد الرشید اینڈ برادرس تاجران کتب لوہاری دروازہ - لاہور